نبیلہ ابر راجہ

تمہیں کیا معلوم کہ دکھ کیا چیز ہوتے ہیں
کاش تم ریت کے پیاسے ذرے ہوتے
اور بادل کا ٹکڑا تم پر سے بن برسے گزر جاتا
تمہیں تب معلوم ہوتا کہ دکھ کیا چیز ہوتے ہیں
کاش تم خزاں رسیدہ درخت کے پتے ہوتے
اور ٹہنی سے ٹوٹ کر گر جاتے
تب تمہیں معلوم ہوتا دکھ کیا چیز ہوتے ہیں

اوپری منزل پہ ٹیرس کی دیوار پہ آگے کی طرف جھکے جھکے وہ کتنی دیر سے کسی غیر مرئی نکتے پہ نگاہیں جمائے کھڑی تھی۔ شام کے ڈھلتے سائے آہستہ آہستہ ماحول کو اپنی گرفت میں لے رہے تھے۔ دھوپ دیواروں سے اترتے ہوئے عجیب سی یاسیت آمیز اداسی کا منظر پیش کر رہی تھی نیچے زرینہ بیگم کی بہن بمعہ اپنی فیملی کے صبح سے آئی ہوئی تھیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ذیان اوپر آگئی تھی۔ اوائل نومبر کی ڈھلتی دھوپ اور گہرے ہوتے سائے اچھی خاصی خنکی کا احساس دلا رہے تھے۔ اسے یہاں بیٹھے دو گھنٹے سے زائد ہوگئے تھے، لیکن نیچے جانے سب کا سامنا کرنے کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ جانے کیوں عجیب سی خود ترسی کا جذبہ خود پہ حاوی ہوتا نظر آرہا تھا۔ اندر ہی اندر لاوا پھوٹ کر بہنے کو بے تاب تھا، مگر یہ آگ آنسوؤں سے کہاں بجھنے والی تھی، اس حقیقت کا ادراک تو اسے بہت پہلے سے تھا۔ تب ہی تو ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ لبوں پہ کرن بن کر چمکی تھی۔

مغرب کی اذان کی آواز آنا شروع ہوگئی تھی۔ سر پہ دوپٹا درست کرتی وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگی۔ آخری زینہ پار کرتے ہی وہاب سے ٹکراؤ ہوا۔ بلیو کلر کی جینز اور میچنگ شرٹ میں ملبوس سلیقے سے بال بنائے وہاب اس کے رستے میں حائل کھڑا تھا۔

"ذیان صاحبہ گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں اور تمہیں کچھ ہوش ہی نہیں ہے۔ بے چاروں کو کمپنی ہی دے دو۔" وہاب کے الفاظ میں نرمی و بے تکلفی تھی، مگر لہجہ و انداز میں نرمی کا نشان تک نہ تھا۔ عجیب آنچ دیتا لہجہ تھا۔

"میں پڑھ رہی تھی۔" اس نے جان چھڑانے کے لیے جھوٹ بولا۔
"کیا پڑھ رہی تھی؟" وہ باقاعدہ جرح پہ اتر آیا۔
"کورس کی بکس تھیں ظاہر ہے۔" وہ چڑسی گئی۔
"تم نیچے سب کے ساتھ بیٹھ کر بھی پڑھ سکتی تھی۔" اس نے آرام سے زیان کے تپے تپے چہرے کو تکتے ہوئے مشورہ دے ڈالا۔ "اٹس اوکے۔" زیان نے اپنا لہجہ مشکل سے نارمل کیا تھا۔ وہاب مطمئن ہو گیا۔

زیان اندر آ رہی تھی۔ زرینہ اچی، بہن روبینہ کے ساتھ باتوں میں لگی تھیں۔ ایک دم اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔ "کہاں تھی تم اتنی دیر سے؟" انداز عام اور سوالیہ سا تھا۔ اس سے پہلے کہ زیان آگے بڑھتی روبینہ بول پڑیں۔
"دو گھڑی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کرو کون سا روز روز تمہارے گھر آتے ہیں۔" انہوں نے بڑے میٹھے لہجے میں طعنہ دیا تو ناچار زیان ان کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ زیان کو الجھن سی ہونے لگی۔ وہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔ باقی سب ٹی وی لاؤنج میں تھے۔ باتوں اور قہقہوں کی آواز اس کمرے تک آ رہی تھی۔
"میں ابو کو دیکھ آؤں ذرا۔" اس نے منظر سے ہٹنے کا بہانہ سوچا اور پھر اس پہ "فوراً" عمل درآمد بھی کر دیا۔ زرینہ بیگم اور ان کے دیگر خاندان والوں سے ملنے ملانے کے باوجود زیان اجنبیت ہی محسوس کرتی تھی۔ حالانکہ زرینہ بیگم کو اس کی ماں کی جگہ لیے برسوں گزر چکے تھے، مگر زیان کی غیریت اور احتیاط جوں کی توں تھی۔ ان کے پورے گھر کی تصویر مکمل تھی۔ ایک وہی مس فٹ تھی۔ یہ خامی اسے کبھی کبھی بری طرح محسوس ہوتی۔

☆ ☆ ☆

امیر علی تکیے کے سہارے نیم دراز ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ زیان دبے قدموں آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور ان کے سامنے پڑے صوفے پہ بیٹھ گئی۔ نہ تو امیر علی نے اسے مخاطب کیا۔ نہ زیان نے اس کی ضرورت سمجھی۔ وہ ان سب سے جان چھڑا کر یہاں آئی تھی۔ کچھ وقت سکون سے گزارنا چاہتی تھی۔ یہاں گھر کے کسی فرد کی مداخلت کا فی الحال کوئی امکان نہیں تھا۔ زیان نے صوفے پہ بیٹھے بیٹھے رخ ٹی وی کی طرف کر لیا۔
"کیسی جا رہی ہے تمہاری پڑھائی۔" خاموشی کے طلسم کو امیر علی کی آواز نے ہی توڑا تو وہ چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئی جو بہت غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔ زہر میں ڈوبی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ ابھری۔
"بس ٹھیک ہی چل رہی ہے۔" اس کے ایک ایک لفظ سے بے زاری کا عنصر نمایاں تھا۔
"کیوں خیر ہے نا پڑھائی میں کوئی پرابلم تو نہیں۔ اپ سیٹ لگ رہی ہو؟" امیر علی نے بہت سے سوال ایک ساتھ ہی کر ڈالے۔
"نہیں۔۔۔" اس نے سب کا جواب مختصر سی نہیں کی صورت میں دیا۔
"تمہیں کوئی بھی پرابلم ہو تو مجھ سے ڈسکس کر سکتی ہو۔" ان کے لہجے میں فکر مندی تھی۔
"اب میں اس قابل ہو گئی ہوں کہ اپنے پرابلم خود سولو کر سکتی ہوں۔" امیر علی کو لگ رہا تھا۔ ان کے سامنے زیان نہیں کوئی اجنبی ہو جو سرراہ مل گیا ہو اور روکے جانے کی صورت میں نکلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ تو ان کی طرف متوجہ تک نہیں تھی ٹی وی کو گھور رہی تھی۔ جیسے وہی سب سے اہم ہو۔ وہ ان کے پاس ہوتے ہوئے بھی پاس نہیں تھی۔ ذہنی طور پہ میلوں کے فاصلے پہ کھڑی تھی۔ وہ یہ بات بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ اس کے پس منظر میں چھپی وجوہات سے بھی واقف تھے تب ہی تو بے بس ہو کر پھر سے خاموشی کے خول میں سمٹ گئے۔
زیان اٹھ کر کچن کی طرف آئی۔ جہاں بوا کھانے پکانے میں مصروف تھیں۔
"بوا کیا ہو رہا ہے؟" زیان نے سبزی کی ٹوکری میں

سے ایک گاجر اٹھائی اور دھونے لگی۔ بوا رحمت نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر سے بھنتے مسالے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ پیاز ٹماٹر اچھی طرح مکس ہو کر بھن گئے تھے انہوں نے دھولی ہوئی چکن اٹھا کر ہانڈی میں ڈالی۔ زیان گاجر دھو کر پاس رکھے اسٹول پہ چڑھ کر بیٹھ گئی۔

"وہی روز کے کام دھندے اور کیا کرنا ہے اور تم گاجر کیوں کھا رہی ہو میں نے کباب رکھے ہیں یہ لو۔" کفگیر رکھ کر انہوں نے مائیکروویو میں پڑی پلیٹ نکالی جس میں کباب رکھے تھے۔ انہوں نے کباب انگلی سے چھو کر گرم ہونے کا اطمینان کیا پھر پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

"آپ نے کب بنائے؟" اس نے گاجر پھر سے ٹوکری میں رکھ دی۔

"ابھی آدھے گھنٹے پہلے چائے کے ساتھ بنا کر سب کو دیے مگر تم نظر ہی نہیں آئی۔" بوا باتوں کے ساتھ ساتھ چکن کو بھی دیکھ رہی تھیں۔

"بوا آپ اب اتنے کام مت کیا کریں، ثمینہ ہے نا دیکھنے دیں اسے یہ بکھیڑے۔" اس نے کباب کھاتے ہوئے مشورہ دیا۔ بوا ہنس دیں، سادہ اور بے ریا ہنسی۔

"مجھے امیر میاں اور اس گھر کے افراد کی خود خدمت کر کے جو خوشی ملتی ہے، وہ کام ثمینہ کے سپرد کر دوں تو وہم سا لگا رہے گا۔ اس لیے خود کرتی ہوں۔" چکن بھونتے بھونتے انہوں نے نپے تلے انداز میں بات مکمل کی۔ زیان کباب کھاتے کھاتے رک گی۔

"بوا آپ کو اتنی محبت اور خیال ہے ہم سب کا۔"

"یہ محبت تو میرے خون میں رچی بسی ہے۔ اللہ بخشے بڑی بیگم (زیان کی دادی) کو میں ان کے زمانے سے یہاں اس خاندان میں کام کر رہی ہوں۔ چھوٹی بیگم کو امیر میاں میرے سامنے ہی تو رخصت کروا کے لائے تھے۔ اتنا دھوم دھڑکا تھا۔ اتنی خوشیاں منائی گئی تھیں مجھے سب یاد ہے۔" بوا بتاتے بتاتے ماضی میں پہنچ گئی تھیں جہاں سب روز اول کی طرح روشن تھا۔

زیان کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو چلا تھا۔ اس نے ادھ کھایا کباب پلیٹ میں رکھ دیا اور دبے قدموں کچن سے نکل گئی۔ بولتے بولتے بوا کی نظر اسٹول کی طرف اٹھی جو اب زیان کے وجود سے خالی تھا۔ انہوں نے فوراً" دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ زیان باہر نکل رہی تھی۔ بوا کے ہاتھ اور زبان یک دم ہی سست پڑ گئے۔ انجانے میں ہی سہی انہوں نے زیان کے دل میں دبے آگ جیسے زخموں کو ہوا دے ڈالی تھی۔ اب وہ نادم سی تھیں۔ زیان منظر سے غائب تھی۔

☼ ☼ ☼

" Slay With me " کا Akcent فل والیوم میں بج رہا تھا۔ کار کے شیشے تک دھمک سے لرز رہے تھے۔ رنم بہت ریش ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ کام سٹ یونیورسٹی کا آہنی گیٹ سامنے تھا۔ گاڑی کی رفتار اس نے میکانکی انداز میں کم کی۔ آدھے گھنٹے کا راستہ اس نے پندرہ منٹ میں طے کیا تھا۔ اس تیز رفتاری سے احمد سیال بھی خائف رہتے تھے۔ پر وہ رنم سیال ہی کیا جو ان کی بات مان لیتی۔ وہ زندگی کے ہر معاملے میں تیز رفتاری اور ساتھ چلنے والوں کو پیچھے چھوڑنے کی قائل تھی۔ کئی بندھی زندگی اور روٹین سے اسے نفرت تھی۔ اس کی رگوں میں خون کی جگہ جیسے پارہ مچلتا تھا۔

"ہائے رنم۔" گاڑی پارکنگ لاٹ میں چھوڑ کر وہ جیسے ہی نکلی پیچھے سے راعنہ کی آواز سن کر رک گئی۔ وہ قریب آچکی تھی۔

"ہائے ہاؤ آر یو۔" رنم نے اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا۔ جواباً" راعنہ نے اس کے گال سے گال ملا کر ملنے کی رسم پوری کی۔

"فائن تم سناؤ آج کچھ لیٹ آئی ہو۔" دونوں پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے کلاس روم کی طرف چل دیں۔ "رات کو لیٹ سوئی تھی' اس لیے لیٹ ہوں' لیکن اتنی بھی نہیں۔" اس نے اپنی کلائی میں بندھی قیمتی ریسٹ واچ سرسری سی نظر ڈالی جیسے کچھ جتانا چاہ رہی ہو۔

"ہاں تم ٹائم پہ آتی ہو نا' اس لیے فیل ہوا مجھے۔" راعنہ کا انداز اب دفاعی تھا۔ اس نے رشک سے رنم کے چمکتے پرکشش چہرے کی طرف دیکھا۔ اس نے پنک ٹاپ کے نیچے ٹراؤزر پہنا ہوا تھا اور گلے میں ہلکا سا اسکارف' براؤن بال بڑے غرور سے کندھے پہ پڑے گلابی رخساروں کی بلائیں لے رہے تھے۔ اس کی پوری شخصیت سے آسودگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

کلاس شروع ہونے والی تھی' کیونکہ سر ہمدانی ان کے ساتھ ہی دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ "دیکھ لو لیٹ ہونے کے باوجود میں اتنی بھی لیٹ نہیں ہوئی۔" اس کے چمکتے چہرے اور آنکھوں میں غرور تھا۔ دل ہی دل میں راعنہ کو رشک سا ہوا۔ اس کا بے پناہ اعتماد ہی اس کی خوب صورتی کا سرچشمہ تھا۔

اشعر' کومل اور فراز کلاس میں پہلے سے موجود تھے۔ وہ ان کے پاس پڑی کرسیوں پہ بیٹھ گئی۔ رنم اور راعنہ کی طرح ان تینوں کا تعلق بھی کھاتے پیتے آسودہ حال خوش حال خاندان سے تھا۔ ان پانچوں کا اپنا گروپ تھا۔ یہ سب بی ایس آنرز چھٹے سمسٹر کے طالب علم تھے۔ کومل اور اشعر خاصے پڑھاکو تھے۔ رنم صرف امتحانات کے دوران پڑھنے والی طالبہ تھی۔ راعنہ کا بھی یہ ہی حال تھا' مگر فراز پڑھائی میں ان سب سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ پانچویں سمسٹر میں اس نے ٹاپ کیا تھا۔ ان چاروں کو پڑھائی میں اگر کوئی مشکل ہوتی تو فراز سے ہی رجوع کرتے۔ رنم اسے بہت کلوز تھی۔ وہ اسے اپنا بیسٹ فرینڈ کہتی تھی۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی بات اسی سے شیئر کرتی۔ فراز بھی اسے اہمیت دیتا۔ ان کی دوستی مثالی تھی۔

سر ہمدانی کا لیکچر شروع ہو چکا تھا۔ سب کی نظریں ان پہ جمی تھیں۔

☼ ☼ ☼

گاڑی دائیں طرف نظر آنے والی ذیلی سڑک پہ مڑ چکی تھی۔ جوں جوں گاڑی آگے بڑھ رہی تھی۔ سفید عمارت کے پرشکوہ نقوش واضح ہونا شروع ہو گئے

تھے۔ اس کی خوب صورتی کھلنا شروع ہو چکی تھی۔

چند منٹ میں ہی یہ سفر تمام ہوا۔ ڈرائیور نے گیٹ پہ پہنچ کے ہارن دیا۔ گیٹ کے ساتھ دیوار پہ بنی مچان کے اوپر دو باوردی محافظ آتشیں اسلحے سمیت پہرا دے رہے تھے۔ گیٹ کھلا تو ڈرائیور طویل ڈرائیووے سے گاڑی اندر لے آیا۔

اب وہ ادب سے نیچے اتر کر گاڑی کا دروازہ کھول چکا تھا۔ ملک ایبک نے گاڑی سے باہر قدم رکھا۔ تاحد نگاہ رہائشی حصے کے باہر سبزہ اور قیمتی پودے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ وہ نپے تلے باوقار قدموں سے چلتا رہائشی عمارت کی طرف جا رہا تھا۔ لمبا قد، قدرے سرخی لیے گندمی رنگت، گہرے بادامی رنگ کی پرسوچ آنکھیں، توانا اور مضبوط جسم پہ سجتا کھدر کا قیمتی کرتا شلوار، اس کی چال میں مضبوطی اور وقار تھا۔ پورے سراپے سے مضبوطی اور نفاست کا اظہار ہو رہا تھا۔

وہ حویلی کے درمیانی حصے میں داخل ہو چکا تھا، یہاں چھت کی بلندی دگنی تھی۔ اسے حویلی کا فیملی لاؤنج سمجھا جا سکتا تھا۔ قیمتی پردے بیش قیمت قالین اور خوب صورت ڈیکوریشن پیسز یہاں کی رونق بڑھا رہے تھے۔

ملک ارسلان اور عنیزہ چچی سے سب سے پہلے سامنا ہوا۔ اس نے پرجوش طریقے سے سلام کیا۔ ملک ارسلان نے اسے خود سے لپٹا لیا۔ ان کے روم روم میں ٹھنڈک سی اتر گئی۔ ساتھ ایک حسرت ناتمام بھی دل کے کسی کونے کھدرے سے نکل کر سامنے آ گئی۔

"کیسے ہو ایبک؟" انہوں نے پرجوش مصافحہ و معانقے کے بعد خیر خیریت دریافت کی۔

"چچا جان الحمدللہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں، حویلی میں سب ٹھیک ہے نا۔"

"ہاں سب ٹھیک ہے، لیکن تم نے شہر میں بڑے دن لگا دیے۔" ارسلان اس کے چوڑے کندھے پہ ہاتھ رکھے اس کے جوان کڑیل سراپے کو بڑی محبت سے دیکھ رہے تھے۔ دونوں اب صوفے پہ بیٹھ گئے تھے۔ عنیزہ چچی بھی ساتھ تھیں۔

"کچھ مصروفیت تھی، اس وجہ سے تھوڑا زیادہ ٹائم لگ گیا۔ بابا جان نظر نہیں آ رہے ہیں۔" اس کی متلاشی نگاہیں ان ہی کو کھوج رہی تھیں۔

"بھائی جان اپنے کمرے میں ان کی طبیعت ناساز سی ہے۔"

"کیا ہوا ہے بابا جان کو۔" ملک ارسلان کے بتانے پہ وہ مضطرب ہو گیا۔

"بھائی جان کو موسمی بخار اور نزلہ زکام ہے اور کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں۔" ملک ارسلان نے اس کی فکرمندی دیکھتے ہوئے تسلی دینے کی کوشش کی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں بابا جان کی خیر خبر لے لوں۔" لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ چلا گیا۔ ملک ارسلان اور عنیزہ اپنی باتوں میں لگ گئے، مگر موضوع گفتگو ملک ایبک ہی تھا۔

بابا جان کمبل اوڑھے بیڈ پہ نیم دراز تھے۔ پاس ہی افشاں بیگم بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھیں۔ ملک ایبک کو دیکھ کر پھول کی طرح کھل اٹھیں۔

"کب آئے تم۔" انہوں نے اٹھ کر اس کا ماتھا چوما، وہ بیڈ پہ بابا جان پاس بیٹھ گیا۔

"تم ٹھیک ہو نا؟" ملک جہانگیر اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"بابا جان میں تو ٹھیک ہوں، آپ نے کیوں طبیعت خراب کرلی ہے۔" اس کے لہجے میں محبت آمیز احترام کی آمیزش تھی۔

"موسمی نزلہ زکام ہے، ٹھیک ہو جاؤں گا۔ موسم بدلتے ہی میں بیمار پڑ جاتا ہوں۔ بوڑھا جو ہو گیا ہوں۔ کچھ بھی نہیں کر سکتا اب۔" وہ دھیرے دھیرے سے مسکرا رہے تھے۔

"ارسلان چاچا ہیں نا، انہیں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے دیں، آپ صرف آرام کریں۔"

"میں سارا دن آرام ہی تو کرتا ہوں اور کیا کرنا ہے اب میرے دو کڑیل جوان بیٹے ہیں، سب کچھ ان کے حوالے کر کے اللہ اللہ کرنا ہے بس۔" وہ بڑے بشاش نظر آ رہے تھے۔ افشاں بیگم تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد

کچن کی طرف آگئیں۔ ملک ایبک اتنے دنوں بعد آیا تھا ممتا سے ان کا دل لبریز ہو رہا تھا۔ وہ ایک ایک چیز اسے اپنے ہاتھوں سے کھلانا چاہ رہی تھیں۔ تینوں نوکرانیوں کو انہوں نے کھانے پکانے پہ لگا دیا اور خود اپنے ہاتھوں سے لاڈلے بیٹے کے لیے سیب کاٹنے لگیں۔ معاذ ملک تو پاکستان سے باہر تھا۔ ان کی ساری محبت و توجہ کا محور فی الحال ایبک ہی تھا۔ وہ اس کے لیے کٹے سیب اور انواع و اقسام کے پھل لے کر واپس آئیں تو ارسلان ملک بھی وہاں موجود تھے۔ ملک جہانگیر اب ہشاش بشاش ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

"میں تو کہتا ہوں اب ملک ایبک کی شادی ہو جانی چاہیے' تاکہ "ملک محل" میں بہار آجائے۔" ملک ارسلان نے شرارت سے ایبک کو تکتے ہوئے ملک جہانگیر کو مشورہ دیا۔

"میں بھی یہ ہی سوچ رہا تھا کہ اب اس کام میں مزید تاخیر نہیں کرنی چاہیے' لیکن معاذ پاکستان آجائے تو لگے ہاتھوں اس کے لیے بھی لڑکی دیکھ لوں۔" انہوں نے بھائی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ایبک قطعا" ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ "کوئی لڑکی ہے آپ کی نظر میں؟"

"لڑکیاں تو بہت ہیں' مگر میں اپنے بیٹے کی پسند کی دلہن لاؤں گی۔" اس سے پہلے کہ ملک جہانگیر کوئی جواب دیتے افشاں بیگم بول پڑیں۔ اس سے پہلے کہ مزید اس موضوع پہ بات ہوتی ملازم نے باہر مردانے میں مہمانوں کے آنے کی اطلاع دی تو تینوں مرد اس طرف چلے گئے۔

☆ ☆ ☆

زیان کالج ہال میں دیگر اسٹوڈنٹس سمیت ڈرامے کی ریہرسل کر رہی تھی۔ ڈرامہ فورتھ ایر کی آمنہ رحمان نے لکھا تھا اور فورتھ ایرز کی طالبات ہی ایکٹ کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک زیان بھی تھی۔ ڈرامے میں اس کا رول لڑاکا اور شکی مزاج سخت دل شوہر کا تھا۔ گیٹ اپ اور آواز بدلنے میں زیان کو مہارت حاصل تھی۔ تب ہی تو اسے اس رول کے لیے موزوں ترین قرار دیا گیا تھا۔ اسے شروع سے ہی اکیلے میں خود سے باتیں کرنے کی عادت تھی۔ یہ عادت اداکاری کے شوق میں کب ڈھلی ٹھیک طرح سے اس کا علم زیان کو بھی نہ تھا۔

اس کی موٹی موٹی غلافی آنکھیں تاثرات دینے میں لاجواب تھیں۔ وہ اپنے ڈائیلاگز کی ریہرسل کر رہی تھی۔ اس کی بیوی کا رول بی ایس سی کی صندل منور ادا کر رہی تھی۔ دونوں اس وقت مکمل گیٹ اپ میں تھیں۔ آج فائنل ریہرسل تھی۔ قدرے دبے ہوئے پھولوں کے پرنٹ والے کپڑوں میں ملبوس بکھرے بالوں میں صندل منور ڈری سہمی بیوی کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔ زیان کا گیٹ اپ مردوں والا تھا۔ امیر علی کے براؤن کلر کے کرتے شلوار میں ملبوس سر کے بالوں کو پگڑی میں چھپائے مصنوعی مونچھیں لگائے وہ مکمل طور پہ بدلے حلیے میں تھی۔ اپنے مکالمے مردانہ لب و لہجے میں گھن گرج کے ساتھ ادا کرتے ہوئے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ ہی زیان ہے۔

میڈم فریحہ نے تالیاں بجا کر اپنے اطمینان کا اظہار کیا تو وہ دونوں آکر کرسیوں پہ بیٹھ گئیں۔ اب اگلی ریہرسل شروع تھی۔ میڈم فریحہ ڈرامیٹک سوسائٹی کی انچارج اور کرتا دھرتا تھیں۔ کالج میں ہونے والی ایسی تمام غیر نصابی سرگرمیوں کو انہوں نے اپنی محنت سے بھرپور بنانا ہوتا تھا۔

زیان کا کام ختم ہو چکا تھا۔ وہ میڈم فریحہ سے اجازت لے کر کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔ اب وہ کالج کے سفید یونیفارم اور سفید ہی ڈوپٹے میں ملبوس تھی۔ اپنے اصل حلیے میں لگ ہی نہیں رہا تھا یہ وہی زیان ہے جو تھوڑی دیر پیشتر ایک ظالم جابر شوہر کا رول ادا کر رہی تھی۔

میڈم فریحہ بڑے مزے میں اکثر اسے مشورہ دیتی کہ ایکٹنگ کے میدان میں آجاؤ۔ آج بھی حسب سابق انہوں نے پرانی باتیں دہرائیں۔ "زیان تم ٹی وی کا رخ

کرو' بہت صلاحیتیں ہیں تم میں' ایک اچھی اداکارہ بن سکتی ہو۔ تمہارے فیس ایکسپریشنز بالکل نیچرل ہیں۔ ڈرامہ انڈسٹری میں تہلکہ مچا سکتی ہو۔" وہ سن کر مسکرا دی۔

"میڈم جس خاندان سے میرا تعلق ہے وہاں شوبز کو گالی سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے لاکھ کوشش کے باوجود بھی میں نہیں کرپاؤں گی۔" اس کے لہجے میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔ میڈم فریحہ نے کندھے اچکائے' جیسے کہہ رہی ہوں تمہاری مرضی۔ ادھر دل ہی دل میں زیان کو جانے کیوں یک دم غصہ آگیا تھا۔ "ہاہاہا... اچھی اداکارہ... نیچرل ایکسپریشنز۔" میڈم فریحہ کی باتیں دل میں دہراتے ہوئے طنزیہ ہنسی ہنس رہی تھی۔

اس کیفیت کے زیر اثر وہ گھر پہنچی۔ دروازہ اس کی چھوٹی بہن رابیل نے کھولا۔ اس نے ہلکی آواز میں سلام کیا۔ جواباً" رابیل نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔ زیان اندر آگئی۔ بیگ رکھ کر وہ برآمدے میں لگے واش بیسن سے منہ ہاتھ دھونے لگی۔

سامنے کچن کے دروازے سے رحمت بوا کی جھلک نظر آرہی تھی۔ اسے آتے دیکھ کر وہ کھانا گرم کررہی تھیں۔ زیان منہ' ہاتھ دھو کر یونیفارم میں ہی کچن کی طرف چلی آئی۔ آج بھوک زوروں پہ تھی۔ صبح ناشتے کے نام پہ اس نے چند گھونٹ چائے پی تھی۔ پھر کالج میں سارا دن ڈرامے کی بھاگ دوڑ میں گزرا تھا۔ کینٹین جانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

"بوا کیا پکایا ہے؟" بھوک اسے مزید برداشت نہیں ہورہی تھی۔

"مٹر قیمہ اور ساتھ میں چاول ہیں' کہو تو دو کباب بھی فرائی کردوں؟" بوا پلیٹ میں کھانا نکال رہی تھیں۔

"جو مرضی ہے کریں' لیکن پہلے میں چاول کھاؤں گی۔" وہ کچن میں پڑی چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل کے گرد کرسی گھسیٹ کر بیٹھ چکی تھی۔ بوا فریج سے کباب نکال کر تل رہی تھیں۔ ساتھ اسے سارے دن کی روداد سنا رہی تھیں۔ وہ رغبت سے کھانا کھاتے ہوئے سن رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"آپ نے زیان کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" امیر احمد کے گرد کمبل ٹھیک کرتے ہوئے زرینہ بیگم نے اچانک یہ عجیب سوال کردیا۔ امیر احمد نے بھنویں اچکاتے ہوئے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا۔ جیسے پوچھ رہے ہوں "کیا؟ میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔"

"کمال ہے آپ جوان بیٹی کے باپ ہو کر یہ کہہ رہے ہیں۔" زرینہ بیگم نے جیسے نامحسوس انداز میں ان پہ طنز کیا۔

"کھل کر بات کرو۔" الجھن بدستور ان کے لہجے میں موجود تھی۔

"زیان اس سال اپنی کالج کی تعلیم مکمل کرلے گی۔" زرینہ بیگم نے سنبھل کر بات کا آغاز کیا۔

"تو...؟" امیر احمد نے پھر سے اپنی سوالیہ نگاہیں ان پہ ٹکائیں۔

"تو آپ نے اس کی شادی وغیرہ کا کچھ نہیں سوچا۔" اس بار اطمینان کی سانس ان کے سینے سے خارج ہوئی۔ "پہلے وہ تعلیم تو مکمل کرلے' پھر سوچیں گے اس پہ۔"

"لڑکیوں کو مناسب وقت پہ اپنے گھربار کا کردینا چاہیے' تعلیم وغیرہ شادی سے ضروری تو نہیں۔" زرینہ بیگم اپنے اختلاف سمیت آہستہ آہستہ سامنے آرہی تھیں۔

"زیان کو اعلا تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق ہے..." انہوں نے اچانک بات ادھوری چھوڑدی تو زرینہ بیگم کے چہرے پہ غصہ نظر آنے لگا۔

"تو کیا ساری عمر اسے پڑھانے کا ارادہ ہے؟" چبھتے ہوئے لہجے میں طنزیہ استفسار تھا۔

"میں نے ساری عمر نادانستگی میں اسے نظرانداز کیا ہے۔ میری بیٹی مجھ سے دور ہوگئی ہے' کم سے کم میں اس کی یہ خواہش نظرانداز نہیں کرسکتا۔" ان کے لہجے میں احساس زیاں بول رہا تھا۔ جس نے سر سے

پاؤں تک زرینہ بیگم کو جھلسا دیا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں آپ کیوں اس کی کوئی خواہش نظر انداز کریں گے۔ آپ کی چہیتی کی اولاد جو ہے۔" امیر احمد نے زخمی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو' میں نے زیان کے ساتھ کتنی زیادتی کی ہے' وہ متنفر ہے مجھ سے۔۔۔ میں نہیں چاہتا اس کی دیرینہ خواہش کے راستے میں رکاوٹ بنوں۔"

"لیکن میں اب اسے اور اس گھر میں برداشت نہیں کرسکتی۔ اس کے بعد رابیل بھی ہے مجھے اس کا بھی سوچنا ہے۔"

"رابیل ابھی بہت چھوٹی ہے' اللہ اچھا کرے گا۔" امیر احمد کے انداز میں شکست نمایاں تھی۔

"آپ کو کیا پتا بیٹیوں کے رشتے کے لیے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں' ابھی سے زیان کے لیے کوشش کا آغاز کروں گی تو کچھ ہو گا نا۔ میں دیکھ بھال کر زیان کے لیے اچھا رشتہ ہی تلاش کروں گی' دشمن نہیں ہوں اس کی ماں ہوں۔" امیر احمد کی پسپائی دیکھ کر وہ بھی نرم پڑ گئی تھیں۔

تب ہی دروازے پہ مخصوص دستک کی آواز ابھری' یہ بوا رحمت تھیں جو سونے سے پہلے معمول کے مطابق ان کے لیے خود دودھ لے کر آئی تھیں۔ زرینہ نے غور سے ان کا چہرہ دیکھا' مگر وہاں بے نیازی تھی' کوئی کھوج' کوئی بھید کوشش کے باوجود بھی وہ تلاشنے میں ناکام رہیں۔ وہ دودھ رکھ کر جا چکی تھیں۔ دروازہ پہلے کی طرح بند تھا۔

زرینہ نے اطمینان کی سانس خارج کرتے ہوئے دودھ کے گلاسوں سے اٹھتی بھاپ کی طرف نگاہ جمادی جو اس بات کا ثبوت تھی کہ بوا نے ابھی ابھی دودھ گرم کیا ہے۔ آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ پھر سے امیر احمد کی طرف متوجہ ہوئیں اور باتوں کا ٹوٹا سلسلہ وہیں سے جوڑنا چاہا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

"ہاں جو تمہیں اچھا' مناسب لگتا ہے کرو۔" ایک بھرپور قسم کی پسپائی امیر احمد کے پورے وجود سے جھانک رہی تھی۔ زرینہ بیگم کو یک گونہ اطمینان کا احساس ہوا۔ وہ شروع سے فاتح رہی تھیں۔ اس محاذ پہ بھی امیر احمد نے لڑے بغیر ہتھیار پھینک دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

بوا نے پورے گھر کا چکر لیا اور سب دروازے چیک کیے۔ یہ ان کا پرانا معمول تھا جس پہ وہ برسوں سے کاربند تھیں۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے وہ ایک بار پھر زیان کے کمرے کے سامنے رکیں۔ ہاتھ سے دروازے پہ دباؤ ڈالا۔ وہ اندر سے لاک تھا۔ کچھ دیر وہ وہیں کھڑی سوچتی رہیں اور پھر سر جھٹک کر اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔ وہ جب دودھ لے کر امیر احمد کے کمرے کی طرف جا رہی تھیں تو زرینہ بیگم کی کچھ باتیں دروازہ بند ہونے کے باوجود بھی ان کے کانوں میں پڑ گئی تھیں۔ کیونکہ وہ اونچی آواز میں بولنے کی عادی تھیں۔ بوا کی عمر کا بیشتر حصہ اسی گھر کے مکینوں کے ساتھ گزرا تھا۔ وہ زرینہ بیگم سے بھی پہلے یہاں تھیں۔ زمانے کے سرد و گرم سے آشنا اور جہاں دیدہ تھیں۔ زرینہ بیگم کا اول دن سے ہی زیان کے ساتھ رویہ ڈھکا چھپا نہیں تھا۔

انہوں نے زیان کو امیر احمد کی بیٹی نہیں اپنی حریف سمجھا تھا۔ بوا کا دل اس سلوک پہ احتجاج کرتا' لیکن وہ کچھ نہیں کرسکتی تھیں۔ ہاں زیان کے لیے ان کی محبت توجہ پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ وہ ہر ممکن اس کی دلجوئی کرتیں۔ اب زرینہ بیگم نے جو اچانک شادی کا شوشہ چھوڑا تھا۔ وہ بلاوجہ نہیں تھا۔ گھر میں سب کو ہی پتا تھا زیان کو اعلا تعلیم حاصل کرنے کا بے پناہ شوق ہے۔

اس کے ارادے بلند تھے۔ وہ گھر کے گھٹے گھٹے ماحول سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ سو اس کی تمام تر توجہ اپنی پڑھائی پہ تھی اور اس پہ وہ کوئی سمجھوتہ کرنے کی قائل نہیں تھی۔ ایسے میں اپنی شادی کا ذکر اسے مشتعل کرسکتا تھا۔ بوا آنے والے وقت کے خیال سے پریشان تھیں۔

☆ ☆ ☆

یونی ورسٹی کے وسیع سبزہ زار پہ دھوپ نے ڈیرہ جما رکھا تھا۔ کلاسز آف ہونے کے بعد وہ پانچوں کے پانچوں پھسکڑا مار کر ادھر ہی بیٹھے گئے تھے۔ رنم نے کومل کے کندھے سے ٹیک لگائی ہوئی تھی۔ جبکہ اس کے چہرے پہ کوفت کے آثار تھے۔ راعنہ نے سبب دریافت کیا تو وہ پھٹ سی پڑی۔

"کتنے دن ہوگئے ہیں' نہ کوئی پارٹی' نہ پکنک' نہ موج مستی' نہ ہنگامہ۔۔۔ میں روٹین لائف سے بور ہوگئی ہوں۔" اس کے چہرے پہ دنیا جہان کی بے زاری تھی۔ رنم نے پیار سے اس کے بال سلائے اور اس کے کندھے سے اپنا سر اٹھالیا۔

"تو کیا خیال ہے' رات کو Base ment night club نہ چلا جائے؟" اس نے باری باری سب کی طرف تائید طلب نگاہوں سے دیکھا تو سب سے پہلے اشعر نے نعرہ مستانہ بلند کیا۔

"واؤ ونڈر فل آئیڈیا۔"

"ہاں ٹھیک ہے انجوائے منٹ رہے گی۔" راعنہ بھی راضی تھی۔

"اوکے ڈن ہے رات کو چلیں گے۔" رنم فیصلہ کن لہجے میں بولی تو سب نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اب میں تو گھر جارہا ہوں۔" فراز سب سے پہلے اٹھا۔ وہ کی رنگ جھلاتا پارکنگ ایریا کی طرف آیا تو رنم بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ تینوں کو سی یو بول کر وہ اپنی گاڑی نکالنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بڑی طوفانی رفتار سے گاڑی ڈرائیو کرتی ایف ایٹ ون کی طرف جارہی تھی' جہاں اس کی جنت اس کا گھر تھا۔

☆ ☆ ☆

احمد سیال ڈیلی گیشن کے ساتھ مصروف تھے۔ انہوں نے رنم کو اپنی مصروفیات سے آگاہ کردیا تھا۔ اس لیے وہ اندھیرا چھاتے ہی اپنی تیاری میں لگ گئی تھی۔ پارٹیز' پکنک' ہلا گلا' سیرو تفریح میں اس کی جان تھی۔ ہر ہفتے وقت نکال کر وہ سب فرینڈز اپنی اپنی پسندیدہ ایکٹوٹیز سے لطف اندوز ہوتے رنم پیش پیش ہوتی۔

اپنے پسندیدہ بلیک کلر کے ڈریس میں ملبوس وہ ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کی خوب صورتی کے دو آتشہ ہونے میں کلام نہیں تھا۔ اپنے حسن اور کشش کا اسے اچھی طرح اندازہ تھا۔ اس بات اور احساس نے اسے بے پناہ اعتماد بخشا تھا۔ وہ بہت سے لوگوں میں الگ سے ہی پہچانی جاتی۔

وہ سب دوست ہائی سوسائٹی کے اس کلب کے باقاعدہ رکن تھے۔ احمد سیال کی بیٹی ہونے کے ناطے اور پھر اپنی بے پناہ خوب صورتی کی وجہ سے گمنام نہیں رہی تھی۔ سب اسے اچھی طرح جانتے تھے اور اسی حساب سے پروٹوکول بھی دیتے۔ آج بہت دن بعد سب دوست کلب میں اکٹھے ہوئے تھے۔

ڈانسنگ فلور پہ شوخ مغربی دھن پہ نوجوان جوڑے قدم سے قدم ملائے رقص کررہے تھے۔ رنم کو بذات خود ڈانس اور موسیقی کے اس مظاہرے سے دلچسپی نہیں تھی۔ پر اسے نوجوان جوڑوں کی یہ حرکات محظوظ کرتی۔ ہال کے چاروں طرف مخصوص فاصلے کی حد میں چھوٹی چھوٹی گول میزیں اور ان کے گرد کرسیاں پڑی تھیں۔ جو رقص سے تھک کر آرام کرنے والوں کے کام آتیں۔ راعنہ' رنم اور فراز تینوں ایک میز کے گرد بیٹھے تھے' جبکہ کومل' اشعر ڈانسنگ فلور پہ دوسرے جوڑوں کے ساتھ رقص کررہے تھے۔

وہ تینوں دوست ان ہی کے بارے میں بات کررہے تھے۔ اشعر نے تین ماہ پہلے کومل کو پرپوز کیا تھا۔ اس نے اشعر سے سوچنے کے لیے مہلت مانگی اور ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا تھا' یہ بات انہیں فکر مند کررہی تھی۔ کومل سیدھے سیدھے ہاں کیوں نہیں کردیتی۔ دونوں میں ذہنی ہم آہنگی اور لگاؤ تھا۔ رہی ان کی محبت تو وہ بھی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ اس کے باوجود بھی کومل سوچنے کے لیے وقت مانگ رہی تھی۔

"رنم تم نے کیا پلان کیا ہے فیوچر کے لیے؟" راعنہ

نے ایک دم سوال کر کے موضوع بدل دیا۔

"پلان کیا کرنا ہے' بس لائف کو انجوائے کر رہی ہوں۔" وہ بے نیازی سے بولی۔ راعنہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"اوہو۔۔۔ آئی مین تم نے لائف پارٹنر' شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" اس بار فراز بھی دھیان دینے پہ مجبور ہو گیا۔

"ابھی بہت ٹائم ہے یار۔" اس نے بات ہنسی میں اڑا دی تو راعنہ کا منہ سا بن گیا۔ رنم اتنی آسانی سے کسی کو اپنی سوچوں تک رسائی حاصل کرنے نہیں دیتی تھی۔

خود سر اور خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال' فراز دونوں کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی ان کی گفتگو میں دخل نہیں دیا۔ اس کی یہ عادت کم سے کم رنم کو بہت پسند تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے فراز اس کا خاموش حمایتی ہو۔ رنم کی مخالفت کرنا اسے آتا ہی نہیں تھا۔

اس کی یہ خاموشی اور حمایت بہت دفعہ راعنہ کو شک میں ڈالتی کہ فراز کے دل میں رنم کے لیے کوئی نہ کوئی سوفٹ کارنر ضرور ہے۔ ورنہ تقریر کرنے' دلائل دینے میں اس کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ رنم اسے اپنا سب سے بہترین دوست کہتی اور یہ بات صرف کہنے یا دعوا کی حد تک نہیں تھی۔ ان کی ایک ایک حرکت سے اس کا اظہار ہوتا کہ فراز اور وہ ایک دوسرے کے لیے بے پناہ اہمیت کے حامل ہیں۔ مگر کبھی یہ ظاہر نہیں ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے "وہ خاص جذبہ" بھی رکھتے ہیں۔ کم سے کم راعنہ ابھی تک اس کا سرا پکڑ نہیں پائی تھی۔ "خیر مجھے کیا جو بھی ہے۔" راعنہ انہیں نظرانداز کر کے رقص دیکھنے لگی۔

✡ ✡ ✡

ملک جہانگیر کی طبیعت اب کافی بہتر تھی۔ تب ہی تو وہ ڈیرے پہ آئے تھے۔ ڈیرے پہ روز محفل جمتی' ان کے دوست احباب' مزارعے' عام لوگ ضرورت مند' اپنی اپنی مشکلات' مسائل' لڑائی' جھگڑے لے کر ان کے پاس آتے۔ وہ کسی کو مایوس نہیں کرتے تھے۔ بے انتہا نرم دل اور مہربان تب ہی تو ان کے پاس آنے والے دعائیں دیتے رخصت ہوتے' ملک جہانگیر نے اپنے بڑوں کی عزت و روایت ابھی تک قائم رکھی ہوئی تھی۔ ملک ایبک بھی ان کے ساتھ ڈیرے پہ موجود تھا۔ دوپہر کے بعد ملنے ملانے والے اٹھ کر گئے تو ملک ایبک ان کے ساتھ ڈیرے سے باہر آ گیا۔ کھیتوں کے کنارے بنی پگڈنڈی پہ دونوں آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ کچھ عمر کا تقاضا اور کچھ ملک جہانگیر کی صحت پہلے جیسی نہیں رہ تھی' ان کی حرکات میں سستی اور کمزوری تھی۔ ایبک صرف ان کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہا تھا۔

تاحد نظر سبزہ اور ہریالی تھی۔ پنجاب کے مغربی حصے میں واقع یہ گاؤں ملک جہانگیر کے آباؤ اجداد نے آباد کیا تھا۔ یہاں کی مٹی بڑی زرخیز تھی۔ ہر سال مختلف پھلوں' سبزیوں اور فصلوں کی بہترین پیداوار ہوتی جو گاؤں سے شہر کی منڈیوں تک پہنچائی جاتی۔ پہلے ملک جہانگیر ان سب کاموں کی نگرانی خود کرتے تھے۔ کیونکہ ملک ایبک اور ملک معاذ تب اپنی اپنی تعلیم کے سلسلے میں گاؤں سے باہر تھے۔ ایبک تو اپنی انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کر چکا تھا' جبکہ معاذ اعلا تعلیم کے حصول کی خاطر ملک سے باہر تھا۔

ایبک کے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اب تمام امور کی انجام دہی' ذمہ داری سب اسی کے سپرد تھی۔ اس کا ایک پاؤں شہر تو ایک گاؤں میں ہوتا۔ شہر میں بزنس کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ وہ کچھ فلاحی کاموں میں بھی پیش پیش تھا۔ ملک جہانگیر اس سے بے پناہ خوش تھے۔ وہ عادات و اطوار میں ہو بہو ان کا پرتو تھا۔

"بابا جان میرے ذہن میں ایک منصوبہ آیا ہے۔" اس کی بات پہ ملک جہانگیر کے بڑھتے قدم رک گئے۔ وہ اس کی طرف پلٹے۔ "کیسا منصوبہ پتر۔"

"بابا جان میں چاہتا ہوں کہ شہر کی طرح گاؤں میں بھی کچھ فلاحی منصوبوں پہ کام شروع کیا جائے۔"

"پتر تمہاری بات میں بڑی جان ہے' مجھے بہت خوشی ہوئی ہے کہ تم اپنے علاوہ بھی کچھ سوچتے ہو۔ تم نے کچھ اچھا ہی سوچا ہو گا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"تھنک یو بابا جان۔ میں اس پہ جلد ہی پیپر ورک کروں گا۔" ان کی طرف سے تائید اور حوصلہ افزائی پا کر وہ بہت مسرور تھا۔

"کرو پتر نیک کام میں دیر کیسی۔" ان کے چہرے پہ بیٹے کے لیے محبت و شفقت تھی۔ ابیک نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

"بابا جان آئیے میں آپ کو جیپ تک چھوڑ کر آتا ہوں' میں بعد میں مزارعوں سے مل کر زمینوں کا ایک چکر لگا کر آؤں گا۔" ملک جہانگیر کا سانس بار بار پھول رہا تھا۔ نقاہت کی وجہ سے وہ اور بھی سست ہو رہے تھے۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ گویا انہیں واپس جانے پہ اعتراض نہیں تھا۔ وہ خود انہیں جیپ تک چھوڑ کر آیا۔ رحیم داد نے فوراً" سے بیشتر گاڑی اسٹارٹ کی اور ملک جہانگیر کو حویلی لے کر روانہ ہو گیا۔

جیپ نگاہوں سے اوجھل ہوئی تو تب ابیک نے قدم آگے بڑھائے۔ کھیتوں سے ہرے ہرے پھلوں کے باغات کا سلسلہ شروع تھا۔ وہ پیدل چلتا ادھر جا رہا تھا۔ فضا میں سیب' لیموں اور مالٹے کی مہک رچی ہوئی تھی۔ اس نے پوری سانس لے کر اس مہک کو گویا اپنے سینے میں اتارا۔

مزارعے باغوں میں اپنے انجام کی فرائض وہی میں مصروف تھے۔ اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر سب ہی ہوشیار ہو گئے۔ ابیک نے سب سے دعا سلام کی۔ وہ اس وقت مالٹوں کے باغ میں تھا۔ تاحد نظر مالٹے کے پیڑ ہی پیڑ نظر آ رہے تھے۔ موسمی پھل سے لدے پیڑ اس امر کی نشان دہی کر رہے تھے کہ اس بار خوب پیداوار ہوئی ہے۔ اسے دلی اطمینان سا محسوس ہوا۔

باغات سے آگے کافی زمین خالی پڑی تھی۔ وہ اس طرف آ کر کھوجتی نگاہوں سے جائزہ لے رہا تھا۔ یہ خالی قطعہ اراضی اس کے منصوبے کے لیے عین مناسب تھی۔ واپس جا کر اس نے اس سلسلے میں عملی اقدام کرنا تھا۔ کچھ پہلو اس کے ذہن میں واضح تھے۔ کچھ کے بارے میں غور و فکر کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

موسم کے تیور آج کافی شدت پہ مائل تھے۔ معمول سے زیادہ سردی ماحول میں رچی بسی صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ زیان نے سردی سے ٹھٹھرتے ہاتھوں کو آپس میں رگڑا۔ وہ صحن میں ٹہلنے کے ارادے سے نکلی تھی۔ دھوپ دیواروں سے ڈھلنے کی تیاری میں تھی۔ وہ جوں ہی صحن میں آئی' ایک ثانیے کے لیے کپکپا سی گئی' کیونکہ باہر سرد ہواؤں کا راج تھا۔ اس نے گرم شال مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹ لی۔ چند چکر لگانے کے بعد جب دانت سردی سے بجنے لگے تو اس نے کمرے کی راہ لی۔ وہ مڑ کر واپس ہونے کو تھی' جب اپنے پیچھے وہاب کی پرجوش اور شوخ آواز سنائی دی۔

"حسین لوگو السلام علیکم!" وہاب کی کھنکتی آواز پہ خود بہ خود ہی اس کے قدم رکے اور اس نے ایک ثانیے کے لیے رخ موڑ کر وہاب کی طرف دیکھا۔

"وعلیکم السلام۔" اس کا عام سا لہجہ اور انداز کسی بھی قسم کے جذبے سے عاری تھا۔ وہاب کو دکھ سا ہوا۔

"آنٹی اندر ہیں۔" وہ ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کر کے بوا کی طرف آ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہاب چلا گیا ہو گا زرینہ بیگم کی طرف' مگر وہ تو اس کے پیچھے پیچھے کچن میں آ گیا جہاں بوا چائے بنانے میں مصروف تھیں۔ اسے دیکھ کر ہلکا سا مسکرائیں۔

"کیسے ہیں وہاب میاں۔" ان کے لہجے میں احترام کے ساتھ محبت بھی تھی۔ وہاب نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔ اس کی تمام تر توجہ زیان کی طرف تھی۔ جو اب اسٹول پہ بیٹھی پاؤں ہلا رہی تھی۔ ریڈ کلر کے امبر ائیڈری والے سوٹ اور شال میں اس کی گلابی رنگت دمک رہی تھی۔ مناسب قدوقامت

پر کشش چہرہ' گہری غزالی آنکھیں وہ حسن مجسم تھی۔
اس کے حسن بلاخیز نے وہاب کے دن رات کا سکون و قرار لوٹ لیا تھا۔ وہ ابھی تک اس پہ اپنا حال آشکارا نہ کرپایا تھا۔ کیونکہ زیان کی سرد مہری بے گانگی اسے یہ ہمت کرنے ہی نہیں دیتی تھی۔

"وہاب میاں آپ اندر چلیں' میں چائے لاتی ہوں۔" اسے دروازے پہ ہنوز ایستادہ دیکھ کر انہوں نے جیسے اسے کوئی احساس دلانے کی کوشش کی تو وہ کھسیانا سا ہو کر بالوں میں ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ زیان وہیں اسٹول پہ براجمان نولفٹ کا مکمل اشتہار بنی ہوئی تھی۔

وہ مایوس ہو کر زرینہ خالہ کی طرف آگیا۔

"کب آئے تم۔" انہوں نے بوا کی معیت میں اسے آتا دیکھ کر فوراً" سوال کیا۔ بوا چائے اور دیگر لوازمات کے ساتھ تھیں۔

"ابھی آیا ہوں بس۔" اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ بوا چائے رکھ کر پلٹ گئی تھیں۔ جواباً" انہوں نے وہاب کو تیکھی نگاہوں سے دیکھا' پر وہ نظرانداز کر کے پیالی میں چائے ڈالنے لگا۔

رات آخری پہر میں داخل ہونے کو تھی' پر نیند وہاب کی آنکھوں سے کوسوں دور کھڑی ہاتھ مل رہی تھی۔ سخت سردی کے باوجود اس کا لحاف تہ کیا ہوا بستر کی پائنتی کی طرف رکھا تھا۔ وہ صوفے پہ بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ زیان سرخ لباس میں ملبوس جیسے اس کے کمرے میں گھوم پھر رہی تھی۔ وہ اس کے حسن بلاخیز کے سامنے مکمل طور پہ کب کا سرنگوں ہو چکا تھا۔ وہاب کے دل میں زیان کو حاصل کرنے کی تمنا پچھلے چار سال سے انگڑائیاں لے رہی تھی۔ لیکن ان چار سالوں میں وہ ایک بار بھی حال دل کہنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو پایا تھا۔ اب ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ بات اس کی مردانگی کے لیے چیلنج بنتی جارہی تھی۔

"میں تمہیں حاصل کر کے رہوں گا زیان امیر احمد۔" اس نے ہتھیلی کا مکہ بنا کر دوسرے ہاتھ پہ مارا۔ وہاب کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی اور چہرے پہ پراسرار مسکراہٹ۔

☆ ☆ ☆

فون مسلسل دھیمے سروں میں گنگنا رہا تھا۔
احمد سیال نے سامنے ساگوان کی ٹیبل پہ پڑا موبائل فون آن کر کے کان سے لگایا۔ "ہیلو" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے تو دوسری طرف سے والہانہ انداز میں سلام کا جواب ملا۔ یہ ملک جہانگیر تھے' ان کے گہرے اور بے تکلف دوست۔ تین سال سے دونوں کی آپس میں ملاقات نہیں ہوئی تھی' لیکن وقتاً" فوقتاً" فون پہ رابطہ رہا کرتا۔

"اوہ تو آپ ہیں ملک صاحب۔" وہ مسکرا رہے تھے۔

"جی یہ میں ہی ہوں احمد سیال۔" جواباً" وہ بھی بے تکلفی سے گویا ہوئے۔ "تم نے تو نہ ملنے کی قسم کھا رکھی ہے' میں نے سوچا خود فون کر کے تمہاری خیریت پوچھ لوں۔"

"ارے ایسی کوئی بات نہیں ہے' بزنس کے سلسلے میں کبھی یہاں کبھی وہاں ہوتا ہوں' پاکستان سے باہر آنا جانا لگا رہتا ہے۔ کاروباری بکھیڑوں میں ایسا پھنسا ہوں کہ میری اکلوتی بیٹی بھی شکایت پہ اتر آئی ہے۔ بہت دل چاہتا ہے پرانے دوستوں کے ساتھ محفل جماؤں' لیکن یہ وقت کی کمی آڑے آجاتی ہے۔" احمد سیال کے لہجے میں شرمندگی بے بسی نمایاں تھی۔ ملک جہانگیر نے مزید شکوے 'شکایتوں کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

"تمہاری بیٹی کیسی ہے اب؟"

"وہ ہاں! رنم بالکل ٹھیک ہے۔"

"اب تو کافی بڑی ہو گئی ہو گی۔" ملک جہانگیر آٹھ نو سال پہلے رنم کو دیکھا تھا۔ جب وہ مری میں زیر تعلیم تھی اور چھٹیوں پہ گھر آئی ہوئی تھی۔

"ہاں اب تو یونی ورسٹی میں پڑھ رہی ہے۔ بی ایس آنرز کر رہی ہے۔" رنم کا ذکر کرتے ہوئے احمد سیال کے لہجے میں خود بہ خود ہی فخر سا در آیا تھا' جیسے انہیں رنم کا باپ ہونے پہ غرور ہو۔

"میں اس وقت اسلام آباد میں ہوں۔ ایبک چیک اپ کروانے لایا ہے' سوچا تمہیں فون کرکے حال احوال پوچھ لوں۔"

"تم اسلام آباد میں ہو۔ میں آفس سے نکل رہا ہوں۔ سیدھے میرے گھر آؤ۔ مل بیٹھیں گے' اکٹھے لنچ کریں گے۔ پرانی یادیں تازہ کریں گے۔" احمد سیال فوراً" پرجوش ہوئے۔ ملک جہانگیر نے دو گھنٹے بعد آنے کا کہہ کر فون بند کردیا۔

ایبک انہیں چیک اپ کروانے کے بعد گھر چھوڑ کر ابھی ابھی ضروری کام کا بول کر نکلا تھا۔ تب ہی تو ملک جہانگیر نے احمد سیال کو دو گھنٹے بعد کا ٹائم دیا۔ کافی دیر گزر چکی تھی' انہوں نے ایبک کو فون کرکے واپسی کا پوچھا۔ اس نے کہا ابھی مجھے ٹائم لگے گا۔ کچھ سوچنے کے بعد انہوں نے ڈرائیور کے ساتھ احمد سیال کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔

وہ گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے۔ "تم مجھے کچھ کمزور نظر آرہے ہو۔" احمد سیال انہیں تنقیدی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جواباً" وہ مسکرائے۔

"دمے کی بیماری بھی لگ گئی ہے مجھے' دل کا مریض تو پہلے سے ہوں۔ ساتھ دیکھنے میں بھی دشواری پیش آنے لگی ہے۔ لیکن ان بیماریوں میں کیا رکھا ہے۔ میں آج بھی پہلے کی طرح باہمت اور حوصلہ مند ہوں۔" ملک جہانگیر شگفتگی سے مسکرائے تو احمد سیال نے تعریفی انداز میں ان کے شانے پہ تھپکی دی۔

"تمہاری ہمت اور حوصلہ قائم رہے جہانگیر۔" احمد سیال نے دل سے دعا دی۔ دونوں باتیں کرتے کرتے سیٹنگ روم میں آئے۔ آفس سے اٹھنے سے پہلے ہی گھر فون کرکے احمد سیال نے ملک جہانگیر کی آمد کا بتا دیا تھا۔ یہ وجہ تھی جب وہ ڈائننگ ہال میں پہنچے تو ایک پرتکلف کھانا ان کا منتظر تھا۔

رنم ابھی تک یونی ورسٹی سے نہیں لوٹی تھی۔ احمد سیال کے ساتھ ساتھ ملک جہانگیر بھی اس کی آمد کے منتظر تھے۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔

گھر پہنچنے پہ کارپورچ میں اسے پاپا کی گاڑی نظر آئی' ساتھ ایک اجنبی گاڑی بھی تھی جو کم از کم اس نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ وہ الجھ سی گئی' کیونکہ پاپا اس وقت شاذو نادر ہی گھر میں پائے جاتے۔ چھٹی کا پورا دن وہ گھر پہ گزارتے' وگرنہ یہ امر محال تھا۔ گاڑی روک کر وہ نیچے اتری تو سامنے رمضان جاتا نظر آیا۔ رنم نے آواز دے کر روک لیا۔ وہ اس کے پاس مئودبانہ انداز میں کھڑا اس کے سوالوں کا جواب دینے لگا۔ "صاحب جی کے دوست آئے ہیں۔ وہ آپ کا دو' تین بار پوچھ چکے ہیں۔"

"اچھا جاؤ تم۔" وہ پرسوچ انداز میں چلتی اسی طرف آئی جس طرف رمضان نے مہمان کی موجودگی کی نشان دہی کی تھی۔ احمد سیال اور ملک جہانگیر اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ رنم کے سلام کرنے پہ چونکے اور متوجہ ہوئے۔ رنم اپنی باہیں احمد سیال کے گلے میں حمائل کیے حال احوال پوچھ رہی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں بیٹا ان سے ملو یہ ہیں' میرے دوست ملک جہانگیر۔ بہت بڑے گاؤں کے مالک ہیں' لیکن روایتی چوہدریوں' زمین داروں سے بالکل مختلف ہیں۔" ایک ہلکی سی مسکراہٹ سمیت احمد سیال آنے والے مہمان کا تعارف کروا رہے تھے۔ رنم نے رسمی انداز میں ان کی خیریت دریافت کی۔ جواباً" انہوں نے خلوص سے "جیتی رہو" دعا دی۔

رنم اس کے بعد وہاں رکی نہیں' اپنے بیڈ روم میں چلی آئی۔

رنم کے جانے کے بعد دونوں دوست پھر سے باتوں میں لگ گئے۔ ملک جہانگیر کو رنم بہت اچھی لگی تھی۔ جوان ہونے کے بعد اس نے خوب رنگ روپ نکالا تھا۔ انہوں نے آج اسے کافی عرصے بعد دیکھا تو ذہن میں موجود سوچوں نے کچھ کچھ عملی صورت اختیار کرلی۔ ان کے چہرے پہ موجود خوشی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

ملک جہانگیر نے گاؤں واپسی جانے کی تیاری کرلی

تھی۔ حالانکہ ابیک نے کتنا اصرار کیا کہ رات ادھر ہی رک جائیں، پر وہ نہیں مانے۔ گاؤں سے باہر وہ زیادہ دیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کے لیے جائے پناہ ان کا گاؤں اور گھر تھا۔ وہ وہاں سچی خوشی اور سکون محسوس کرتے۔ "ملک محل" ان کے خوابوں کی جنت تھا۔ اس جنت کی شان بڑھانے کے لیے انہوں نے ملک ابیک اور ملک معاذ کے لیے، بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔

ابیک تعلیم سے فارغ ہو کر اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے سنبھال چکا تھا۔ جبکہ معاذ کی تعلیم مکمل ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ معاذ، ابیک کے مقابلے میں شوخ، لاپروا اور زندگی سے ہر پل خوشی کشید کرنے کا قائل تھا، یہ وجہ تھی کہ انہیں معاذ کے لیے رنم بالکل مناسب لگی تھی۔ ابھی تو وہ شادی کے نام سے دامن بچاتا تھا، مگر پورا یقین تھا رنم کو دیکھنے اور ملنے کے بعد وہ ان کی بات ٹالے گا نہیں۔

دوسری طرف وہ ملک ابیک کی بھی شادی کرنا چاہ رہے تھے۔ یہ بات بہت عرصے سے ان کے دل میں تھی۔ ابیک ان کا لاڈلا، فرماں بردار، سعادت مند بیٹا تھا۔ انہیں اس کے لیے ہیرا صفت لڑکی کی تلاش تھی، مگر ابھی تک وہ مل نہیں پائی تھی۔

اگر وہ معاذ یا ابیک کے لیے رنم کا رشتہ طلب کرتے تو احمد سیال نے انکار نہیں کرنا تھا۔ ان کی دوستی پرانی تھی۔ درمیان میں کچھ وقت ایسا بھی آیا جب ان کا رابطہ احمد سیال سے بالکل ختم ہو گیا، کیونکہ وہ اپنے کاروباری بکھیڑوں میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ مگر اس مصروفیت کے باوجود ان کی دوستی اور گرمجوشی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ نہ یہ مصروفیت دلوں میں بسی محبت کم کر پائی تھی۔ اتنے عرصے بعد دونوں کی ملاقات ہوئی تو ملک جہانگیر کو مایوسی نہیں ہوئی۔ آج وہ بے پناہ خوش تھے۔

☆ ☆ ☆

زرینہ بیگم اور روبینہ دونوں سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ زرینہ آدھا گھنٹہ پہلے ہی عجلت میں پہنچی تھیں، انہیں واپسی کی بھی جلدی تھی، کیونکہ امیر احمد کی طبیعت نارمل نہیں تھی، انہیں ہمہ وقت دیکھ بھال کی ضرورت پڑتی، وہ رابیل کو ضروری ہدایات دے کر گھر سے نکلی تھیں۔

"پھر کیا سوچا تم نے زرینہ؟" انہوں نے منہ قریب کرتے ہوئے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ "میں نے صرف سوچا نہیں ہے، عمل کرنے کی بھی ٹھان لی ہے۔ جتنا جلدی ہو سکتا ہے زیان کی شادی کرنی ہے۔۔۔ ورنہ یہ فتنہ لڑکی میری آئندہ آنے والی زندگی میں بھی آگ لگا سکتی ہے۔" زرینہ کا لہجہ نفرت آمیز تھا۔

"کہتی تو تم ٹھیک ہو۔ میرے وہاب کا حال نہیں دیکھا، ہر دو دن بعد تمہارے گھر پہنچا ہوتا ہے۔" روبینہ نے تائید کی۔

"مگر وہاب جیسے اس کی نگاہوں میں کیا حیثیت رکھتے ہیں۔"

"کیوں کیا ہے میرے وہاب کی حیثیت کو۔ اچھا کماتا ہے۔ شکل و صورت والا ہے، بھرپور مرد ہے۔"

زرینہ کی بات پہ روبینہ تڑپ ہی تو گئیں۔ زرینہ نے ان کی جذباتی حالت دیکھ کر فوراً" اپنی بات کا تاثر زائل کرنے کی کوشش کی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ خدانا خواستہ وہاب یا آپ کم حیثیت ہیں۔ میں تو زیان کی بات کر رہی تھی کہ وہ بہت اونچی اڑان میں ہے۔

میری بلا سے جو بھی ہے مجھے فرق نہیں پڑتا۔ مگر وہاب کو ضرور پڑتا ہے اس کا دل زیان میں اٹک گیا ہے۔" زرینہ معنی خیز لہجے میں بولیں تو روبینہ نے اسے بے بسی سے دیکھا۔

"میں کیا کروں شروع میں سمجھ ہی نہیں پائی کہ تمہارے گھر کے اتنے چکر کیوں لگاتا ہے۔ مگر خیر! ابھی تک اس نے کھل کر اپنے منہ سے کچھ نہیں کہا ہے۔" روبینہ اب پرسکون تھیں۔

"آپا بہت جلد وہ اپنے منہ سے پھوٹے گا میں اس طوفان کو آپ کے گھر کی طرف بڑھتا دیکھ رہی ہوں۔"

"ہائے اللہ نہ کرے۔۔۔" روبینہ نے دل پہ ہاتھ رکھ

لیا۔

"آپا فکر مت کریں، میں بہت جلد کوئی حل نکال لوں گی۔" زرینہ نے ان کی متغیر ہوئی رنگت دیکھ کر تسلی دی۔

☼ ☼ ☼

ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ بلا ارادہ خالی الذہنی کے عالم میں مختلف ٹی وی چینل بدلے جا رہی تھی۔ کسی بھی جگہ وہ ذہن و نظر کو مرکوز نہیں کر پا رہی تھی۔ اسے وہاب کے اندر کمرے میں آنے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔ چند ثانیے بعد اسے کسی کی تیز نظروں کی تپش کا احساس ہوا تو وہ ریموٹ کنٹرول چھوڑ کر فوراً" سیدھی ہوئی۔ وہ اب پرشوق و پرتعیش نگاہوں سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

سفید دوپٹا جھٹک کر اس نے سر پہ لیا۔ "آنٹی، ابو کے کمرے میں ہیں وہاں تشریف لے جائیں۔" وہ ہمیشہ کی طرح سرد مہر لہجے میں بولی۔ چہرے کے تاثرات میں خود بہ خود ہی لاتعلقی در آئی تھی۔ "ادھر سے ہی ہو کر آ رہا ہوں۔" وہ ڈھٹائی سے بولا تو زیان اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ تشریف رکھیے میں بوا کو دیکھ کر آؤں کیا بنا رہی ہیں۔" اس نے بمشکل تمام لہجے کو مزید روکھا ہونے سے روکا۔ وہ جاتی زیان کی پشت کو بے بسی سے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کے لمبے بالوں کی چٹیا دوپٹے سے نیچے تک نکلتی کمر کی طرف جاتی صاف دکھائی دے رہی تھی اس کے گلابی پیروں کی نرم و نازک ایڑھیاں مکمل طور پہ وہاب کی نگاہوں کی زد میں تھیں۔ وہ غصے و سرد مہری سے جا رہی تھی اور وہ اس کی ایک ایک ادا نقش حفظ کر رہا تھا۔ زیان سراپا غزل تھی اور یہ غزل پس منظر کے ساتھ بھی حسین تھی۔

"اف کیا کروں میں۔ اب تو لگتا ہے میں پاگل ہو جاؤں گا۔" وہاب سر کے بال مٹھی میں جکڑتے صوفے پہ بیٹھ گیا۔ سامنے ٹی وی اسکرین پہ مغنیہ درد بھرے لہجے میں نغمہ سرا تھی۔ "اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا۔"

وہاب کا دل دہل سا گیا۔ اس نے فوراً" چینل تبدیل کر دیا۔ "اگر ایسا ہوا تو بہت برا ہو گا۔ میں نے ہارنا نہیں سیکھا ہے۔ ہر قیمت پہ زیان کو حاصل کر کے رہوں گا' دیکھتا ہوں کون مجھ سے ٹکرانے کی ہمت کرتا ہے' تہس نہس کر دوں گا' زمین آسمان ایک کر دوں گا۔" وہاب خیالوں کی رو میں تنہا بہت دور نکل چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

زرینہ بیگم' امیر علی کے جسم کی فالج سے متاثر حصے کی مالش کر رہی تھی۔ جب سے انہیں فالج ہوا تھا' تب سے انہوں نے ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری خود سنبھال لی تھی۔ مالش کرنا وقت پہ دوا دینا ڈاکٹر کی بتائی ہوئی مخصوص ورزشیں اور فزیو تھراپی وہ سب کچھ خود کرتیں بہت ہوا تو آفاق سے مدد لے لی' لیکن زیادہ کام خود سنبھالا ہوا تھا۔ وہ شوہر پرست عورت تھیں۔ اس خوبی کے امیر احمد بھی معترف تھے۔

مالش کرنے کے بعد انہوں نے زیتون کے تیل کی بوتل اپنی مخصوص جگہ پہ رکھی اور جا کر واش روم میں ہاتھ دھوئے۔ ہاتھ خشک کرنے کے بعد وہ دوبارہ ان کے پاس آ کر بیٹھ چکی تھیں۔ "اللہ آپ کو صحت دے آپ کا سایہ بچوں کے سر پہ سلامت رہے وقت کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ میں بہت پریشان رہتی ہوں۔ زیان اور رابیل دونوں جوان ہیں' ان کے بعد آفاق اور منائل ہیں۔ ہمیں اپنا فرض ادا کرتے کرتے بہت دیر لگ جائے گی۔" زرینہ بیگم نے اپنا پسندیدہ موضوع چھیڑ دیا۔

یہ ایسا موضوع تھا کہ وہ اس پہ گھنٹوں بے تکان بحث کر سکتی تھیں۔ اس لیے امیر احمد نے انہیں ٹوکنے کی کوشش نہیں کی۔ "میں نے اس دن آپ سے زیان کے بارے میں بات کی تھی' پھر کیا سوچا آپ نے؟" وہ کرید میں لگی تھیں۔

"میں نے کہا تو تھا ابھی وہ پڑھ رہی ہے' اتنی عمر تو نہیں ہے اس کی کہ فوراً" جلد بازی سے کام لیتے ہوئے

شادی کردوں۔" وہ اس دن کی طرح آج بھی اس بات پہ قائم تھے اور یہ ہی واحد بات زرینہ کو چبھی۔ یہ تو جیسے سینے کا ناسور بن گئی تھی۔

"آپ خود بیمار ہیں ذیان کے بعد ہماری اور بھی ذمہ داریاں ہیں۔ آپ خوامخواہ جذباتی ہو رہے ہیں۔ میں ذیان کی دشمن نہیں ہوں جو اس کے لیے برا سوچوں گی۔"

زرینہ کی بات میں وزن تھا' پر امیر علی' ذیان کے مستقبل کے ارادوں سے آگاہ تھے۔ وہ اعلا تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو کر اس گھر سے فرار اختیار کرنا چاہتی تھی۔ اپنے اس ارادے کا اظہار اس نے کچھ سال پہلے واشگاف الفاظ میں کیا تھا۔ وقتاً" فوقتاً" وہ دہراتی اور اپنے عزم کو مضبوط کرتی' مگر پہلے اس کے ارادے میں گھر سے راہ فرار شامل نہیں تھا۔ اب تو اس کی آنکھوں اور لہجہ میں ہلکی ہلکی سرکشی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ امیر علی کرتے تو کیا کرتے۔ ذیان کی کالج کی تعلیم بھی ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی' خود وہ معذور اور لاچار ہو کر بستر پہ تھے۔ اپنی بے بسی ولاچاری کا انہیں اچھی طرح ادراک تھا۔ تب ہی تو خاموش ہو جاتے۔ اس خاموشی پہ زرینہ کڑھتیں' انہیں یہ ایک آنکھ نہ بھاتی۔ ابھی بھی امیر علی نے آنکھیں بند کرلی تھیں جو ان کی طرف سے بات چیت ختم ہونے کا اظہار تھا۔

زرینہ غصہ دل میں دبائے باہر آئیں۔ بیرونی گیٹ لاک تھا۔ رحمت بوا بھی اپنے کمرے میں جاچکی تھیں۔ ذیان کے کمرے کا دروازہ بند تھا' لیکن بند دروازے کے نیچے سے روشنی کی ہلکی سی لکیر باہر آرہی تھی۔ کھڑکیوں پہ بھاری پردے پڑے تھے' کیونکہ موسم سرد تھا۔

وہ ٹھنڈی سانس بھرتی دوبارہ کمرے میں آئیں۔ باہر سکون تھا' لیکن ان کے دل میں امیر علی کی خاموشی سے ہلچل مچی ہوئی تھی۔ پہلی تلخی اور پہلا دن باوجود کوشش کے آج بھی نہ بھول پائی تھیں۔

☆ ☆ ☆

کمرا سادے انداز میں سجا ہوا تھا۔ وہ گھونگھٹ اوڑھے سر گھٹنوں پہ رکھے بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی نگاہیں اٹھ کر ادھر ادھر بھی دیکھ لیتیں' مگر اس کی نگاہوں کا مرکز کمرے کا دروازہ تھا جہاں سے کسی کو گزر کر اس تک پہنچنا تھا۔ امیر علی کے بارے میں اس کی سہیلیوں' رشتہ داروں اور بڑی بہن روبینہ نے بہت کچھ بتایا تھا۔ وہ امیر اور صاحب جائیداد تھا۔ اس کے گھر نوکر کام کرتے دروازے پہ دو دو گاڑیاں کھڑی تھیں اور وہ خود بھی تو جاذب نظر شکل و صورت کا مالک تھا۔ زرینہ نے کسی نہ کسی طرح اس کی ایک جھلک دیکھ لی تھی' جب وہ دعوت پہ ان کے گھر آیا۔ پھر سب سے تعریفیں سن سن کر اسے شادی سے پہلے ہی اپنی قسمت پہ رشک آنے لگا۔ خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولا جھولتے وہ بھول گئی تھی کہ چاند میں داغ ہوتا ہے۔ امیر علی کے ساتھ بھی ایسا معاملہ تھا۔ وہ چڑھتے چاند کی مانند روشن اور مکمل تھا' مگر داغ کی صورت میں ایک بیٹی بھی ہمراہ تھی۔

ملنے جلنے والیوں اور خاص طور پہ روبینہ آپا نے اس کی بیٹی کے حوالے سے زرینہ کو مفید مشورے سے نوازا تھا جو اس نے گرہ میں باندھنے میں دیر نہیں لگائی۔ آگے بڑھتے قدموں کی آہٹ پہ زرینہ کی منتظر نگاہوں کو قرار سا آگیا۔ امیر علی اس کے قریب آکر بیٹھ چکے تھے۔

"تم پتا نہیں کیا کیا تصورات لے کر میرے گھر آئی ہوگی۔ تمہارے خوابوں میں کوئی شہزادہ بستا ہوگا۔ تم سوچتی ہوگی خوابوں کی حسین راہ گزر پہ میرا ہاتھ تھام کر محبوبہ کی طرح چلتی رہو اور میں عاشق بن کر تمام عمر تمہارے وجود کا طواف کرتا رہوں' معذرت چاہوں گا میں تمہاری سوچوں پہ پورا نہیں اتر پاؤں گا۔" ان کی عجیب دل دکھانے والی باتیں سن کر زرینہ سر اٹھا کر آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھنے پہ مجبور ہو گئی۔ اس کی نگاہوں میں حیا سے زیادہ سوال مچل رہے تھے۔

"میں عورت کی بے وفائی اور مکاری کا ڈسا ہوا ہوں۔" امیر علی کے لہجے میں بے پناہ نفرت تھی۔ اس

وقت زرینہ نے جاتی عقل کے آخری سرے تھامنے چاہے۔

"میں سب جانتی ہوں اور مجھے اس کا بہت دکھ بھی ہے۔" اس نے شرم بالائے طاق رکھتے ہوئے امیر احمد کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ تسلی دینے والے انداز میں رکھا۔ تو انہوں نے جذباتی سہارا میسر آتے ہی کمزور مرد کی طرح بکھرنا شروع کر دیا۔

"میں نے اپنی بیٹی اس... گالی... عورت سے چھین کر ہمیشہ تڑپتے رہنے کی سزا دی ہے۔ ساری عمر سسک سسک کر روئے گی' تم نے میری بیٹی کو ماں کا پیار دینا ہے' کل وہ یہاں آجائے گی اپنے گھر آج بوا رحمت کے پاس ہے۔ وہ اسے میری رشتے کی ایک پھوپھی کے گھر لے گئی ہیں' بہت رو رہی تھی۔ میں اس کے سلسلے میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کروں گا۔ وہ ہماری بیٹی پہلے ہے اور تم میری بیوی بعد میں ہو۔"

ملن کی اولین ساعتوں میں ایسے کڑوے نصیحت بھرے جملے سن کر زرینہ کے سارے کومل جذبوں پہ اوس آگری۔ وہ امیر علی سے ایک لفظ تک نہ کہہ پائی۔ پہلی بیوی کے بارے میں بہت کچھ بتاتے رہے ان کی ساری باتوں سے زرینہ نے یہ ہی نتیجہ اخذ کیا کہ ان کی پہلی بیوی کردار و سیرت کے لحاظ سے اچھی عورت نہیں تھی اور اس نے شوہر کو بے وفائی کا گہرا گھاؤ لگایا ہے۔ زرینہ نے اسے دیکھا نہیں تھا' مگر اوروں کی زبانی سن رکھا تھا کہ زیان کی ماں خاصی حسین عورت ہے۔

دونوں ہاتھوں پہ گہری مہندی رچائے بھڑکیلا سوٹ پہنے خوشبوؤں میں بسی زرینہ' زیان کے استقبال کے لیے تیار تھی۔ ایک رات کی دلہن کو امیر علی نے بیٹی کے بارے میں ڈھیروں کے حساب سے نصیحتیں اور ہدایات دی تھیں۔ بالآخر زیان' بوا رحمت کے ساتھ آن وارد ہوئی۔ ہلکے گلابی رنگ کے ریڈی میڈ فراک میں ملبوس گلابی گلابی گالوں والی زیان پہلی نظر میں ہی دل موہ لینے والی بچی ثابت ہوئی۔ مگر زرینہ کو دل ہی دل میں اس کی من موہنی شکل و صورت سے حسد محسوس ہوا۔ جب بیٹی اتنی حسین تھی تو اس کی ماں کی شکل و صورت کا اندازہ لگانا بالکل مشکل نہیں تھا۔

اس نے زیان کو گود میں لے کر پیار کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اس کے بازو ہٹا کر بھاگ گئی۔ لگتا تھا اس نے زرینہ کی اپنے گھر میں آمد کو پسند نہیں کیا تھا۔ کیونکہ پہلے دن ہی اس نے امیر علی سے کہا کہ نئی مما اچھی نہیں ہیں' مجھے اپنی مما چاہیے۔ اس نے ضد شروع کر دی۔ امیر علی نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پھول جیسے گال پہ ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ بے یقینی کی حالت میں گرفتار زیان کے بہتے آنسوؤں نے زرینہ کے جلتے بلتے دل کو عجیب سا سکون دیا۔ اسے ایک ثانیے کے لیے محسوس ہوا امیر علی کے گھر میں اس کی حیثیت اتنی بھی کمزور نہیں ہے' وہ چاہے تو آنے والے دنوں میں اپنا مقام خود متعین کر سکتی ہے۔ اس نے اپنے داؤ آزمانے شروع کر دیے۔

☼ ☼ ☼

چار سالہ زیان حال میں ہی اسکول جانا شروع ہوئی تھی۔ اسکول جاتے ہوئے وہ بوا رحمت کو ذرا تنگ نہ کرتی' وہ اس کے گھنے بالوں کی پونیاں بناتی تو وہ شرافت سے ان کے سامنے بیٹھی رہتی' آرام سے شوز پہن لیتی' ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ اپنے اسکول اور ٹیچرز سے اسے دلچسپی پیدا ہونا شروع ہو گئی ہے۔ کیونکہ اسکول سے واپسی پہ وہ بیگ کھول کر اپنی سب کتابیں پھیلا کر بیٹھ جاتی اور کلرز پنسل سے طبع آزمائی شروع کر دیتی۔ ایسے میں وہ بہت مصروف اور خوش نظر آتی۔ آج بھی وہ ٹی وی لاؤنج میں اپنا اسکول بیگ کھول کر بیٹھی ہوئی تھی۔

زرینہ سامنے صوفے پہ بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ ٹی وی چل رہا تھا' مگر زرینہ کی ساری توجہ زیان کی طرف تھی۔ اس کی نگاہ زیان کے ہاتھوں پہ ٹکی تھی جو برق رفتاری سے ایک خاکے میں رنگ بھرنے میں مصروف تھے۔

"زیان..." اس نے آہستہ آواز میں اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے سوالیہ نگاہیں زرینہ کی طرف کیں' مگر منہ سے نہیں بولی۔

"سنو، تمہاری مما کیسی تھی؟" اس کے لہجے میں موجود تجسس بچی سمجھ نہیں پائی۔
"میری مما بہت اچھی ہیں۔"
"کتنی اچھی ہیں؟ جانے اسے کس چیز کی جستجو تھی۔"
"آپ سے اچھی ہیں، آپ مجھے پسند نہیں ہیں۔"
وہ ایک دم سے سن ہوتی چھوٹی سی بچی میں کوئی مصنوعی پن نہ تھا۔ اس نے سیدھے سادے الفاظ میں سچ بولا تھا۔ چند ثانیے بعد اس کے سن پڑتے وجود میں غیض و غضب کا طوفان اٹھا۔ اس نے لپک کر زیان کے بال مٹھی میں جکڑے۔ بوا رحمت اپنے کوارٹر میں آرام کر رہی تھیں، جبکہ امیر علی آفس میں تھے۔
"کسی حرافہ کی اولاد تو بھی مجھے پسند نہیں ہے۔"
زیان کی آواز مارے خوف کے بند ہو گئی۔ وہ پھٹی پھٹی سہمی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی "اور خبردار کسی کو یہ بات بتائی، ورنہ چھری سے گلا کاٹ دوں گی۔" اس نے سچ مچ فروٹ نائف جانے کہاں سے اٹھا کر اس کی نگاہوں کے سامنے لہرائی تو زیان کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ اس کے لب خاموش اور آنکھیں لبالب پانیوں سے بھری تھیں۔
زرینہ کے دل کو حیوانی تسکین کا احساس ہوا۔ ابھی شطرنج کے سب مہرے اس کے پاس تھے۔ اسے دل ہارنے کی ضرورت نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

رات کا اندھیرا اور فسوں ہر شے کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ زرینہ سب کاموں سے فارغ ہو کر امیر علی کے برابر لیٹ چکی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ ان کے سینے پہ دھرا تھا اور رخ بھی ان کی طرف تھا۔
"مجھے آپ کی اور اس گھر کی بہت فکر رہتی ہے۔"
وہ سینے سے ہاتھ اٹھا کر اب ان کے سر میں ہلکے ہلکے کنگھی کرنے والے انداز میں پھیر رہی تھی۔
"میں اس گھر اور مکینوں کے بارے میں تمہارے جذبات سے آگاہ ہوں۔" امیر علی کا لہجہ سکون سے بھرا تھا، کچھ زرینہ کی انگلیوں کا جادو تھا، ان کے روم روم میں سکون کی پھوار برسنے لگی۔
"لیکن یہ بات مجھے اندر ہی اندر کاٹ رہی ہے۔"
ان کے سر کے بالوں میں رینگتی انگلیاں ایک جگہ رک سی گئیں۔ امیر علی نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا جہاں کالی آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔ "کون سی بات بتاؤ" وہ یک دم اپنی جگہ سے اٹھ گئے، دل کسی انہونی کے خدشے سے لرز رہا تھا۔ وہ متوحش سے ہو گئے۔
"میں اس گھر سے اس کی ایک ایک اینٹ سے محبت کرنے لگی ہوں۔" وہ اب باقاعدہ سسکیوں سے رو رہی تھی۔
"پلیز بتاؤ زری کیا بات ہے، میرا دل ہول رہا ہے۔" انہوں نے روتی زرینہ کو ساتھ لگا لیا۔
"زیان سے میں بہت پیار کرتی ہوں، مگر جانے کیا بات ہے۔ وہ میری شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی۔ کہتی ہے اس کی مما بہت اچھی ہے میں اسے پسند نہیں ہوں۔" اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے کے شغل میں مصروف تھی۔ اس کی بات سنتے ہی امیر علی کے سب اعصاب تن سے گئے۔
"وہ بچی ہے، تم اس کی باتوں کو دل پہ مت لو۔" وہ رسان سے بولے، مگر دل میں ہلچل مچی ہوئی تھی کہ زیان نئی ماں کا موازنہ اس قابل نفرت عورت سے کرنے لگی ہے۔
"وہ کہتی ہے میری مما پری جیسی ہے۔ آپ ذرا بھی اچھی نہیں۔" زرینہ نے امیر علی کے چہرے پہ پھیلتی طیش کی سرخی دیکھ لی، جذباتی ہتھیار اس کے پاس تھا، کوئی وار بھی خالی نہیں جا رہا تھا۔
"وہ اپنی ماں کو ابھی تک نہیں بھولی ہے۔ میری محبت نے زیان پہ کوئی اثر نہیں کیا، جانے اس چلتر عورت کے پاس کیا جادو تھا۔"
"زیان کے دماغ کو اس عورت کے نام اور تصور تک سے پاک کر دو۔ یہ تمہاری ذمہ داری ہے، اس کے لیے سختی سے بھی کام لینا پڑے تو لو، میں تم سے

پوچھوں گا نہیں۔" اپنی اس کامیابی پہ زرینہ خوشی سے پھولے نہیں سما پا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

رابیل کی پیدائش پہ زیان چھ سال کی تھی' اس کا شعور آہستہ آہستہ پختگی کی نامعلوم منازل طے کر رہا تھا۔ زرینہ کے ساتھ اس کے تعلقات کسی بھی قسم کی گرمجوشی سے عاری تھے۔ لیکن اس کے چھوٹے سے ذہن میں یہ حقیقت پورے طور راسخ ہو چکی تھی کہ زرینہ آنٹی بہت طاقت ور ہیں' ان کے سامنے ناپسندیدگی احتجاج اسے بہت مہنگا پڑا تھا۔ مگر یہاں بابا بھی تو اس کے ساتھ نہیں تھے۔ اپنی دوسری بیگم کے کسی بھی ناروا سلوک پہ کبھی انہیں کچھ نہیں کہا۔ وہ دن بھر بابا کی غیر موجودگی میں اس کی مما کے بارے میں گندی باتیں کرتیں' وہ باتیں اسے بالکل پسند نہیں تھیں' مگر اسے سننا پڑتیں۔ زرینہ آنٹی نے بہت کوشش کی کہ وہ انہیں مما کہہ کر مخاطب کیا کرے۔ پر یہاں اس نے ان کی نہیں چلنے دی تھی۔ وہ زرینہ آنٹی ہی بلاتی۔

بابا بھی ہمیشہ ان کی حمایت کرتے' جبکہ اسے اپنی مما کے حوالے سے زرینہ آنٹی کے منہ سے ایسی کوئی بھی بات سننا پسند نہیں تھی۔ اس نے تھری کلاس میں جب بابا کے سامنے زرینہ آنٹی کی شکایت کی تو جواباً" انہوں نے اسے زندگی میں دوسری بار تھپڑ مارا۔ اسے تھپڑ پڑتے دیکھ کر وہ خوش تھیں' ان کے چہرے پہ فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ پہلے ہر بات پہ زیان احتجاج کرتی' روتی' مگر اس ذلت آمیز تھپڑ کے بعد اس کے آنسو ختم ہو گئے۔ اب زرینہ آنٹی سارا دن اس کی مما کا نام لے کر گندی اور عجیب باتیں کرتیں' مگر اس کے چہرے اور دل میں بے حسی طاری رہنے لگی۔ اب اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

گزرنے والے ہر دن کے ساتھ ان کی زبان کی دھار تیز ہوتی گئی۔ اب تو رابیل بھی اس کی مما کے کرتوتوں سے آگاہ ہو چکی تھی۔ ایک دن اس نے زرینہ آنٹی کی طرح زیان کو اس کی مما کا نام لے کر طعنہ دیا' مگر اس بار اسے غصہ نہیں آیا۔ وہ پہلے کی طرح صرف خاموش ہو کر رہ گئی۔ وہ بابا کے چہرے پہ کچھ تلاشتی پر وہاں بھی خاموشی ہوتی۔

زرینہ ماں بننے کے بعد اور بھی طاقت ور اور منہ زور ہو گئی تھی۔ امیر علی کمزور پڑ گئے تھے۔ بہت کچھ سن کر بھی ان سنی کر دیتے' مگر زیان کا معاملہ کچھ اور ہی سمت میں چل پڑا تھا۔ وہ منہ سے اب بھی نہیں بولتی تھی' مگر خاموش سرد نگاہوں سے زرینہ آنٹی کو دیکھتی ضرور تھی۔ اپنی زندگی میں مگن امیر علی کو پلوں کے نیچے بہت سا پانی گزر جانے کا احساس تک نہ ہوا۔ زیان ان سے بہت دور جا چکی تھی۔ اب وہ چاہنے کے باوجود بھی اسے واپس نہیں لا سکتے تھے۔ درمیان میں وقت کے ظالم فاصلے حائل تھے۔ وہ اب تین' چار سالہ زیان نہیں رہی تھی۔ کالج کی طالبہ کے نوجوان لڑکی کے روپ میں ڈھل چکی تھی۔ رگوں میں رچی بسی تلخی نے اسے زہریلا بنا دیا تھا۔ کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ بچپن میں انہوں نے زیان پہ توجہ نہیں دی۔ زرینہ سے شادی کر کے وہ اس کی طرف سے بے فکر تھے۔ وہ قطعی طور پہ لاعلم تھے کہ زرینہ نے زیان کے معصوم بچپن کو زہر آلود کر دیا ہے۔

انہوں نے خود ہی تو زرینہ بیگم کو سب بتایا تھا۔ اپنی نفرت' کھولن کڑواہٹ سب کے سب راز خود اپنے ہاتھوں زرینہ کو پیش کیے۔ اس نے وہ سب ہتھیار بے دریغ زیان پہ استعمال کیے۔ شروع میں ہی زرینہ نے اعتماد کے غبارے میں جو ہوا بھری وہ بہت بعد میں جا کر نکلی۔ انہوں نے جیتے جی صحت مندی' خوش حالی کے زمانے میں ہر چیز کا مالک زرینہ کو بنا دیا۔ گھر' کاروبار' جائیداد سب کچھ ان ہی کے تو نام تھا۔ وہ اب کس برتے پہ اکڑتے۔ خاموش ہو کر رہ گئے تھے۔

ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی زیان اور وہ سب ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ اپنی سوکن کی اولاد کو اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ہی گھر میں چلتے پھرتے دیکھنا زرینہ کے لیے اذیت ناک تجربہ تھا۔ اتنے برس
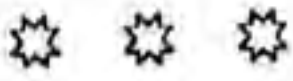
انہوں نے برداشت کیا تھا' اب ہمت جواب دے گئی تھی۔ امیر علی کی پہلی بیوی اور بیوی بھی ایسی جیسے وہ خود بھی شدید نفرت کرتے تھے اور زرینہ' امیر علی سے بھی زیادہ زیان سے نفرت کرتی تھیں۔

رابیل' آفاق اور مناہل کو انہوں نے زیان کے قریب ہونے ہی نہیں دیا تھا۔ اپنی نفرت انہوں نے تربیت کے ذریعے اولاد میں بھی کافی حد تک منتقل کردی تھی۔

اس گھر میں بوا رحمت واحد ایسی ہستی تھیں جن سے زیان کا قلبی و جذباتی تعلق تھا۔ وہ ایک طرح سے ان کے ہاتھوں میں ہی پلی بڑھی تھی۔ یہ بوا ہی تھیں جو وہ زرینہ آنٹی کی نفرت سہ گئی تھی۔ وگرنہ پاگل ہو کر غلط راستوں کی مسافر بن جاتی۔ بوا آڑے وقتوں کا سہارا اور اس کی ڈھال تھیں۔ بہت زمانے سے یہاں اس گھر میں تھیں۔ اس لیے امیر علی ان کا بہت احترام کرتے اور ان کی بات کو اہمیت بھی دیتے۔ بوا نے بہت ہی خاموشی سے خود کو پوشیدہ رکھتے ہوئے اپنے غیر جانبدار کردار کو عرصے تک نبھایا اور اب تک نبھاتی چلی آرہی تھیں۔

گھر کا ہر فرد ان کی عزت کرتا۔ زیان کے لیے بوا کا دم غنیمت تھا۔ وہ اس کی ماں' باپ' دوست' استاد سب کچھ ہی تو تھیں۔ یہ بوا ہی تھیں جن کی بدولت وہ زمین پہ چل پھر رہی تھی' نہ صرف چل پھر رہی تھی' بلکہ اپنے پسندیدہ کالج میں پڑھ بھی رہی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ شکوے کرنا چھوڑ دیے تھے۔ شاید وہ تقدیر پہ راضی و برضا تھی' پر اس خاموشی میں کتنے طوفان چھپے تھے اس کا اندازہ کسی کو بھی نہیں تھا۔ اب زرینہ بیگم جلد از جلد اس کی شادی کرنا چاہ رہی تھیں۔ پر امیر علی کمزور حیثیت میں ہی سہی پر ان کے آڑے آرہے تھے کہ پہلے زیان کو تعلیم مکمل کرنے دو' پھر سوچا جائے گا۔

وہاب کچھ عرصے سے بلاناغہ ان کے گھر کے چکر کاٹ رہا تھا۔ ایسے میں زیان جتنی جلدی اپنے گھر کی ہوتی تب ان کے دل کی پھانس بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہو جاتی۔

☼ ☼ ☼

عنیزہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی خود کو آئینے میں بغور تکتی چہرے پہ نائٹ کریم کا مساج کر رہی تھیں۔ ملک ارسلان جہازی سائز بیڈ پہ نیم دراز ان کی اس سرگرمی کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے دیکھنے کے انداز میں بچوں کی سی معصومیت اور اشتیاق تھا۔ شادی کے اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی عنیزہ کے حسن و جمال میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ حسن و رعنائی کا چھلکتا جام تھا۔ ملک ارسلان سیراب ہی نہیں ہوتے تھے۔ ان کی تشنگی روز اول کی طرح قائم و دائم تھی۔ وہ آج بھی نوعمر عاشق کی طرح عنیزہ کے حسن کے گرویدہ تھے۔

کبھی کبھی تو وہ اس بے تابی و وارفتگی پہ جھنجلا سی جاتیں۔ ارسلان نے انہیں بے پناہ محبت دی تھی۔ کبھی کبھی خیال آتا ارسلان کے پاس محبت کے معاملے میں قارون کا خزانہ ہے۔ جو دونوں ہاتھوں سے دیوانہ وار لٹانے کے بعد بھی ختم یا کم نہیں ہو رہا تھا۔ عنیزہ فارغ ہو کر بیڈ پہ آئیں۔ ارسلان انہیں توجہ و شوق سے تکتے اِدھر اُدھر کی عام باتیں کرتے کرتے سو گئے۔ انہوں نے ان کی طرف سے کروٹ بدل لی۔ ان کی آنکھیں لبالب نمکین پانیوں سے لبریز ہو رہی تھیں۔ ان کی پوری کوشش تھی کہ ان کے لبوں سے ایک سسکی تک نہ نکلنے پائے' ورنہ ملک ارسلان بہت ہرٹ ہوتے۔ انہوں نے بہت پہلے عنیزہ سے ایک وعدہ لیا تھا کہ میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہ دیکھوں۔ ان کے سامنے وہ نہیں روتی تھیں۔ لیکن تنہائیوں میں آنکھیں گھٹا کی طرح برستیں۔ ان کے لبوں پہ صحراؤں کی سی پیاس تھی اور اس پیاس سے سیراب ہونے کی کوئی تدبیر انہیں پتا نہیں تھی۔

بہت دیر بے آواز رونے کے بعد دل کو کچھ سکون ہوا۔ انہوں نے کندھے کے بل اٹھ کر تھوڑا پانی پیا نیم اندھیرے میں انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سوئے

ہوئے ارسلان ملک کو دیکھنے کی ناکام سی کوشش کی اور پھر دوبارہ لیٹ گئیں۔

ارسلان بے سدھ سکون کی میٹھی نیند سو رہے تھے۔ عنیزہ کو ان کی نیند پہ رشک سا ہوا اور خود پہ ترس بھی آیا۔ ایک وہی محروم اور تشنہ تھیں۔ ارسلان کتنے سکون میں تھے۔ سب کچھ پالیا تھا اور ایک وہ تھی سب کچھ پا کر بھی خالی ہاتھ تھیں۔ ارسلان ان کے مجازی خدا نے تو محرومی سے سمجھوتہ کرلیا تھا' پھر وہ نہیں کرپائی تھیں۔

کتنی بار تنہائی میں انہوں نے ایک ننھے منے وجود کو خود سے لپٹے محسوس کیا تھا۔ اس کے رونے کی آواز سنی تھی۔ لیکن ایسا صرف چند ثانیے کے لیے ہوتا۔ حقیقت بڑی تلخ اور سفاک تھی۔ ان کی گود خالی بنجر تھی اور ملک ارسلان کا کوئی نام لیوا نہیں تھا۔ ملک جہانگیر دو کڑیل جوان بیٹوں کے باپ تھے۔ وہ ان کے وارث فخر اور مان تھے۔ افشاں بیگم کے لہجہ میں دونوں بیٹوں کے نام پہ کیسی مٹھاس اتر آتی۔ ان کا سر اونچا ہوتا جیسے دونوں جہاں ان کے قدموں تلے ہوں۔

ملک ارسلان کو بھی محرومی ستاتی۔ مگر کم از کم عنیزہ کے سامنے انہوں نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ یہ باب ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا تھا۔ عنیزہ اکیلی روتی سسکتی پر ملک ارسلان کے سامنے ان کے لبوں پہ چپ کا قفل تھا۔

☆ ☆ ☆

راعنہ نے کچھ دیر پہلے ہی فون پہ یہ ناقابل یقین خبر سنائی تھی۔ ان سب کو تو ناقابل یقین ہی لگی تھی۔ کیونکہ راعنہ نے تو کبھی اشارتاً" بھی یہ ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے کزن شہریار سے منسوب تھی۔ وہ تعلیم مکمل کرکے عملی میدان میں آچکا تھا۔ اب اس کے والدین راعنہ کو بہو بنا کر اپنے خواب پورے کرنا چاہ رہے تھے۔ کیونکہ راعنہ کے ماموں یعنی شہریار کے والد کافی عرصے سے بیمار چلے آرہے تھے۔ ان کی بیماری سنگین نوعیت کی تھی۔ ہارٹ پیشنٹ تھے۔ اپنی زندگی میں ہی بیٹے کو دولہا کے روپ میں دیکھنا چاہ رہے تھے۔ راعنہ کے ڈیڈی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر ابھی اس کی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ چھٹا سمسٹر شروع تھا۔ بی ایس آنرز کا۔ دو دن سے راعنہ یونی ورسٹی بھی نہیں آرہی تھی۔ جبکہ ایگزام بھی قریب تھے۔ ایسے میں اس کی یونی ورسٹی سے غیر حاضری حیران کن اور نہ سمجھ میں آنے والی تھی۔ رنم اور کومل ابھی یونی ورسٹی میں ہی تھی جب باری باری راعنہ نے دونوں کو الگ الگ کال کرکے اپنی اچانک طے ہو جانے والی شادی کی اطلاع دی۔

کومل نے فراز اور اشعر کو ڈھونڈ کر پھولے پھولے سانسوں سمیت یہ بریکنگ نیوز سنائی۔ رنم نے باقی کی کلاسز چھوڑدیں اور سیدھی پارکنگ ایریا میں جاکر اپنی گاڑی نکالی۔ اس کے پیچھے پیچھے ہی کومل اشعر اور فراز تھے۔ افتاں و خیزاں وہ راعنہ کے گھر پہنچے۔

راعنہ مزے سے بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ رنم اور کومل کا خیال تھا۔ وہ اٹوانی کھٹوانی لیے پڑی رو رہی ہوگی۔ اچھا خاصا فلمی سین ہوگا۔ جنگ ہو رہی ہوگی کہ ابھی میں شادی نہیں کرسکتی۔ کیونکہ وہ ہمیشہ کہتی کہ تعلیم مکمل ہونے کے بعد ہی شادی کروں گی۔ مما' پاپا بے شک کہتے رہیں' مگر میں وہی کروں گی جو سوچا ہے' کیونکہ ماموں کی خرابی صحت اور ان کی خواہش شہریار کو دولہا بنے دیکھنا اس کے علم میں تھی اور اب وہ مزے سے بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

انہیں سخت مایوسی ہوئی۔ خاص طور پہ کومل اس کا تو چہرہ ہی اتر گیا۔ راعنہ سب سے نارمل ملی اور اپنے گھریلو ملازم کو آواز دی۔ کیونکہ اسے پتا تھا وہ سب دوست یونی ورسٹی سے سیدھا اسی کے گھر آئیں گے اور پیٹ پوجا تو لازمی کریں گے۔ ان کی زبردست سی خاطر مدارات کا انتظام سب پہلے ہی ریڈی تھا۔

وہ ملازم کو کھانا لگانے کا بول کر آئی تو سب دوستوں کو اپنی طرف گھورتے پایا۔ "کیا سن رہے ہیں ہم" رنم نے اسے کڑی نگاہوں سے گھورا تو راعنہ نے ڈرنے کی کامیاب اداکاری کی۔

"جی کیا سنا ہے آپ نے؟"

"یہ ہی کہ آپ محترمہ کی شادی اچانک طے پا گئی ہے' ٹھیک پچاس منٹ پہلے میرے سیل فون پہ کال آئی تھی۔" رنم نے اپنی ریسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے وقت کا اندازہ لگایا جو بالکل درست تھا۔

"جی آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔" راعنہ اسی کے انداز میں سعادت مندی سے بولی۔

"ارے خوب مزا آئے گا۔" اشعر نے صوفے سے کھڑے ہو کر دونوں بازو فضا میں لہرائے۔ راعنہ نے رونی سی صورت بنالی جو اس کے دکھائی دینے والے تاثرات کے ساتھ ذرا بھی میل نہیں کھا رہی تھی۔

"تم سب فرینڈز کو میرے بچھڑنے کا دکھ نہیں ہے؟"

"تمہیں دکھ نہیں ہے تو ہمیں کیوں ہو گا۔ ہم تو یہ سوچ کر آئے تھے کہ تم بیٹھی رو رہی ہو گی۔ مگر یہاں تو چہرے پہ گلاب کھلے ہوئے ہیں ذرا بھی افسوس نہیں ہے تمہیں۔" کومل نے ناک کرو دار کیا۔ ذرا سی دیر میں ہی صوفے کے سب کشن ان چاروں کے ہاتھوں میں تھے اور راعنہ پورے کمرے میں اپنے بچاؤ کے لیے بھاگتی پھر رہی تھی۔ کوئی بھی معاف کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اچھی طرح درگت بنانے کے بعد اس کی جان بخشی کی گئی۔ اس کے بعد شرافت سے ساری کہانی سنی گئی۔

"دراصل میں ماموں بیمار ہیں' ان کی حالت پچھلے دنوں سیریس ہو گئی تھی' تب ممانی نے پاپا سے بات کی کہ شہریار اور راعنہ کی شادی کر دینی چاہیے' سو انہوں نے ہاں کر دی۔ میرے لیے سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ شہریار نے شادی کے بعد مجھے اپنا بی ایس آنرز مکمل کرنے کی اجازت دے دی ہے۔" وہ آرام سے پوری کہانی سنا چکی تو کومل لٹکے منہ سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں تو سمجھی تھی کہ تم شادی کی وجہ سے خوش ہو۔"

"ارے میں شادی کی وجہ سے بھی تو خوش ہوں۔" راعنہ تیزی سے بولی جیسے اسے یہ ڈر ہو کہ کومل کوئی اور مطلب نہ نکال لے۔ اس پہ رنم اور کومل کی کھی کھی شروع ہو گئی۔

"دیکھو لو کیا زمانہ آگیا ہے لڑکی اپنے منہ سے کہہ رہی ہے کہ میں شادی کی وجہ سے بھی تو خوش ہوں۔ ایک مشرقی لڑکی ہوتے ہوئے بھی ایسی بولڈنیس۔" کومل اور رنم دونوں اسے چھیڑ رہی تھیں' مگر اب وہ بھی ان کے ساتھ ہنس رہی تھی۔

فراز اور اشعر نے بزرگانہ انداز میں دعا دی۔ "سدا خوش رہو اور دودھ میں نہاؤ۔" دودھ میں نہانے کی دعا فراز نے اپنی عقل کے مطابق دی تھی' کیونکہ اسے محاورے نہیں آتے تھے۔ زبردست سا لنچ کرنے کے بعد فراز اور اشعر واپس اپنے گھر چلے گئے۔ جبکہ کومل اور رنم دونوں راعنہ کے پاس ہی تھیں۔

شادی اگزام کے بعد تھی۔ وہ ان دونوں کے ساتھ مل کر اپنا پروگرام بنا رہی تھی۔ "میں چاہتی ہوں کہ اگزام کے بعد ہی شاپنگ کروں۔ تم دونوں نے میرا ساتھ دینا ہے۔ میری کوئی بہن تو ہے نہیں تم لوگوں نے ہی سب کچھ کرنا ہے۔"

"ہاں تم کیوں ٹینشن لے رہی ہو ہم ہیں نا' کیوں رنم۔" کومل نے رنم سے تائید چاہی۔ وہ خاموشی سے دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ کومل کی بات پہ فوراً "ہاں" میں سر ہلایا۔

"میں تو راعنہ کی شادی پہ پیارے پیارے ڈریسز بنواؤں گی۔" کومل کو اپنی پڑی تھی۔ رنم ہنسنے لگی' کومل ہر بات میں' ہر کام میں عجلت سے کام لیتی تھی۔ اسے ایسی کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ سب کام سکون اور آرام سے کرنے کی عادی تھی۔ "رنم تم میری شادی پہ کیا پہنو گی؟" راعنہ نے پوچھا۔

"ابھی کچھ ڈیسائیڈ نہیں کیا ہے میں نے۔"

"میں تو یہ خوب کام والے ڈریس بنواؤں گی' ایک دم ایسٹرن لک۔" کومل پھر شروع تھی۔ جبکہ اب رنم گھر واپسی کا سوچ رہی تھی۔ شام ہو رہی تھی۔ آج پاپا نے گھر جلدی آنے کا کہا تھا۔ راعنہ سے اجازت لے کر وہ واپسی کے لیے نکل آئی۔ جبکہ کومل ابھی تک

راعنہ کے کان کھا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

شان دار سے سجے سجائے سٹنگ ایریا میں ملک جہانگیر' ملک ارسلان' عنیزہ' افشاں بیگم چاروں موجود تھے۔ ادھر ادھر کی عام باتیں ہو رہی تھیں' جبکہ ملک جہانگیر نے احمد سیال کا ذکر چھیڑ کر ان سب کو وہاں جانے کا بتایا۔ ملک جہانگیر کا انداز بہت خاص تھا' جیسے وہ کوئی بہت ضروری بات بتانا چاہ رہے ہوں۔

"میں چیک اپ کروانے کے بعد ڈرائیور کے ساتھ احمد سیال کے گھر چلا گیا۔ وہاں میں نے کھانا کھایا اور اس کی بیٹی سے بھی ملاقات کی۔" افشاں بیگم اور عنیزہ نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ملک جہانگیر اتنا بولنے کے بعد خاموش ہو گئے جیسے ذہن میں کچھ خاص جملے سوچ رہے ہوں۔

"میں معاذ اور ابیک کی شادی کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ معاذ کے لیے مجھے احمد سیال کی بیٹی بہت پسند آئی ہے۔"

"تو ابیک کے لیے کیا سوچا آپ نے وہ معاذ سے بڑا ہے۔" افشاں بیگم ان کی بات کاٹ کر تیزی سے بولیں تو ملک جہانگیر ہنس دیے۔

"معاذ کے لیے تو میں نے لڑکی پسند کرلی ہے' اب مسئلہ ابیک کا ہے تو اس کے لیے کوئی لڑکیوں کی کمی ہے۔ ہم اپنی حیثیت کے مطابق اچھے خاندان سے اپنے بیٹے کے لیے لڑکی لائیں گے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" ملک ارسلان نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ "معاذ کے لیے آپ نے لڑکی پسند کرلی ہے' کیا اس کی بھی رائے لی ہے۔" ملک ارسلان نے سوال کیا تو ایک ثانیے کے لیے وہ چپ سے ہو گئے۔

"تم' عنیزہ میں' ہم سب احمد سیال کے گھر چلیں گے تم وہاں اس کی بیٹی دیکھ لینا' اگر کسی فیصلے پہ پہنچے تو میں تب معاذ کو بتاؤں گا۔"

"اس کی سرپھری طبیعت کا آپ کو پتا ہے نا۔ خود اسے لڑکی پسند کرنے دیں' ورنہ وہ شور مچائے گا۔" افشاں بیگم نے یہ پہلو بھی ان کے سامنے رکھا۔

"بھائی جان آپ ایسا کریں کہ چھٹیوں میں معاذ کو پاکستان بلوائیں' پھر اسے بھی لڑکی کے گھر لے جاکر ایک نظر دکھا دیں۔ اسے پسند آگئی تو رشتہ مانگ لیں گے ہم۔" عنیزہ نے اپنے تئیں اچھا مشورہ دیا۔

"ہاں میں بھی یہ ہی سوچ رہا تھا کہ معاذ چھٹیوں پہ گھر آئے تو اسے احمد سیال کے گھر لے جاؤں۔ اس کی بیٹی بھی پڑھی لکھی ہے معاذ ناپسند نہیں کرے گا۔" ملک جہانگیر نے عنیزہ کی تائید کی تو ایک پرسکون مسکراہٹ ان کے لبوں پہ پھیل گئی۔

"میرے ابیک کے لیے بھی رشتہ دیکھیں ملک صاحب۔" افشاں بیگم کے لہجے میں ممتا کی گرمی اور شفقت صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

"ہاں وہ میرا بڑا بیٹا ہے۔ دونوں کی شادی ایک ساتھ کروں گا۔" ملک جہانگیر مسکرائے۔

"ابھی معاذ کی تعلیم مکمل ہونے میں پورا ایک سال باقی ہے' تب تک ابیک کنوارہ رہے گا؟" افشاں بیگم نے بڑے ناراض انداز میں سوال کیا تھا۔

انہیں یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ معاذ کے لیے تو لڑکی پسند کرلی گئی تھی اور ابیک کے لیے وہ ابھی تک کسی کے گھر رشتہ مانگنے تک نہیں گئے تھے۔ انہیں اپنے شریک حیات سے شکوہ سا تھا۔ لیکن وہ بیٹے کے باپ ہونے کی حیثیت سے اس کی طرف سے ہرگز لاپروا نہیں تھے۔ ابیک' معاذ کے مقابلے میں سنجیدہ' باشعور خیال کرنے والا اور اپنی ذمہ داری نبھانے والا حساس بیٹا تھا۔ وہ اس کے لیے گوناگوں خوبیوں والی ہمہ صفت بہو ڈھونڈ رہے تھے' پر ابھی تک گوہر مقصود ان کی نظر میں آیا نہیں تھا' ورنہ یہ کیسے ممکن تھا' وہ اسے چھوڑ کر معاذ کے لیے پہلے احمد سیال کے گھر رشتہ مانگنے جاتے۔

"ابیک کے لیے بھی میں اچھا ہی سوچ رہا ہوں۔ تم اور عنیزہ اس کے لیے رشتے دیکھو۔ عورتیں تو ایسے کاموں میں بہت ہوشیار ہوتی ہیں۔" ملک جہانگیر نے

قصداً" ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا تو افشاں بیگم کے لبوں پہ پہلی بار پرسکون مسکراہٹ آئی۔ عنیزہ نے ان کے ہاتھوں پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی حمایت کا یقین دلایا۔

"بھائی جان ایبک گاؤں آئے تو اس سے بھی ڈسکس کرلیجیے گا۔" ملک ارسلان بولے۔ "ہاں میں اس کے مشورے کے بغیر کچھ نہیں کروں گا۔" ملک جہانگیر دل ہی دل میں کچھ سوچ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

ایبک گاؤں واپسی کی تیاری کررہا تھا۔ بابا جان نے اسے بلوایا تھا۔ وہ اسے طرح کبھی واپس نہیں بلواتے تھے۔ وہ دل ہی دل میں اپنی سوچوں سے الجھتا گاؤں واپس جارہا تھا۔

اس کی سلور مرسڈیز سیلون جب حویلی کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ سب اسے گرمجوشی اور نارمل انداز میں ملے۔ کسی کے چہرے سے بھی کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہو پارہی تھی۔ اس نے خود سے پوچھنا مناسب سمجھا بھی نہیں۔ ہاں رات کو جب وہ بابا جان کے پاس بیٹھا فرصت سے باتیں کررہا تھا' تب یہ عقدہ حل ہوا کہ بابا نے اسے کیوں بلوایا ہے۔

وہ ان کی بات سن کر ایک ثانیے کے لیے خاموش سا ہوگیا۔ ملک جہانگیر اس کی خاموشی سے بے نیاز اپنی باتیں کررہے تھے۔ "میں چاہتا ہوں تمہاری اور معاذ کی شادی ایک ساتھ کروں یا پھر دونوں میں سے پہلے تمہاری' میں اسے بھی بات کروں گا' تعلیم تو اس کی ویسے بھی مکمل ہونے والی ہے۔ مگر تم بڑے بیٹے ہو شادی کا پہلا حق تمہارا ہے۔ معاذ کے لیے میں نے اپنے دوست احمد سیال کی بیٹی دیکھ رکھی ہے۔ تمہاری اگر کوئی خاص پسند ہے تو بتاؤ۔ تمہاری مرضی اور پسند کا پورا خیال رکھا جائے گا۔" ملک جہانگیر بہت نرمی اور شفقت سے بول رہے تھے۔ ساتھ وہ اس کے چہرے کے تاثرات کا بھی بغور جائزہ لے رہے تھے۔

"بابا جان فی الحال میری شادی اور رشتے کے فیصلے کو موخر کردیں۔" ملک ایبک کا لہجہ مضبوط اور واضح تھا۔

"میں کون سا تمہاری چٹ منگنی پٹ بیاہ کی بات کررہا ہوں۔ سال دو سال بعد شادی کی جاسکتی ہے۔ تم بڑے ہو' قدرتی طور پہ میرا اور تمہاری ماں کا دھیان اس طرف جاتا ہے۔"

"بابا جان میں ابھی بہت بزی ہوں۔ میرے کچھ پروجیکٹس ہیں۔ مجھے پہلے انہیں مکمل کرنا ہے۔"

"تم اپنے پروجیکٹس شادی کے بعد مکمل کرتے رہنا۔"

"بابا جان میں گاؤں میں ایک انڈسٹریل ہوم بنانا چاہتا ہوں' شہری طرز کا جدید سہولتوں سے آراستہ۔ میرے ذہن میں عورتوں کی فلاح و بہبود کے حوالے سے کچھ آئیڈیاز ہیں' کم از کم مجھے ان کی تکمیل کے لیے تو ٹائم دے دیں۔" اس کے انداز میں فرماں برداری تھی۔ ملک جہانگیر کو وقتی طور پہ تھوڑا سکون ہوا۔

دل ہی دل میں وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ اتنے میں ان کا سیل فون مدھر انداز میں دھن بکھیرنے لگا۔ "معاذ کالنگ" کے الفاظ سے موبائل فون کی اسکرین جگمگا رہی تھی۔ انہوں نے فون آن کرکے کان سے لگایا۔ کچھ دیر پہلے اس کے بارے میں بھی بات ہورہی تھی۔ اب اس کی کال آئی تو ملک جہانگیر باغ باغ ہوگئے۔

"کیسے ہو معاذ پتر۔" وہ اپنے مخصوص شفقت بھرے انداز میں بولے۔

"بابا جان میں بالکل ٹھیک ہوں' آپ کی خیریت معلوم کرنی تھی۔" اس کی پرجوش آواز سیل فون سے باہر تک آرہی تھی۔ ملک ایبک بخوبی سن رہا تھا۔

"بابا کی جان میں بالکل ٹھیک ہوں' یہ بتاؤ تم کب آرہے ہو پاکستان؟"

"کیوں بابا جان؟" اس نے سوال کے جواب میں الٹا سوال کردیا۔ "تمہاری چھٹیاں تو ہونے والی ہیں نا۔ تم آؤ تو تمہارے رشتے کی بات چلاؤں۔" ملک جہانگیر اس کی سنے بغیر بول رہے تھے۔

"واٹ میرا رشتہ۔ اوہ نو۔" وہ تقریباً" چیخنے والے

انداز میں بولا۔

"میں خود اپنی مرضی اور پسند سے شادی کروں گا۔" کچھ دیر ٹھہر کر وہ اپنے مخصوص ضدی انداز میں بولا۔

"میں نے تمہارے لیے جو لڑکی پسند کی ہے اسے خود پاکستان آ کر دیکھ لو۔۔۔ میں پوری گارنٹی سے کہتا ہوں تم انکار نہیں کرو گے۔ احمد سیال کی بیٹی ہے وہ۔" ملک جہانگیر نے بمشکل تمام اپنے غصے پہ قابو پایا۔ انہیں معاذ کی طرف سے پہلے ہی اس بات کا خدشہ تھا کہ شاید ہی وہ ان کی مانے اور اس نے سب شرم لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے ان کے خدشے کو حقیقت کے روپ میں ڈھال دیا۔

"بابا جان میں ابھی شادی نہیں کر سکتا۔" ان کے لہجے میں غصہ محسوس کر کے وہ تھوڑا نرم پڑ گیا۔

"ابیک بھی میرے پاس بیٹھا ہے۔ کچھ دیر پہلے میں اس سے شادی کی بات ہی کر رہا تھا۔ احمد سیال میرا بہت اچھا دوست ہے۔ اس کی بیٹی لاکھوں میں ایک ہے۔ اچھے خاندان سے ہے۔ احمد سیال کا اپنا ایک نام ہے' شخصیت ہے' اس کی بیٹی کے لیے کوئی رشتوں کی کمی نہیں ہے' جو وہ انتظار کریں گے۔"

"بابا جان ابھی پورا ایک سال باقی ہے میری تعلیم مکمل ہونے میں اور احمد سیال انکل کی بیٹی یقیناً" بہت اچھی ہوگی۔ ایک سال میں بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔"

فون کے دوسری طرف موجود ہزاروں میل دور بیٹھے معاذ کی آنکھیں اپنی چالاکی پہ چمک رہی تھیں۔

"ہاں بولو۔"

"بابا جان اچھی لڑکیوں کو زیادہ دیر اچھے رشتے کے لیے انتظار میں بیٹھنا نہیں پڑتا۔ مجھے آنے میں پورا ایک سال باقی ہے۔ اس عرصے میں احمد سیال انکل یقیناً" میرا انتظار نہیں کریں گے۔ کہیں نہ کہیں رشتہ طے کر دیں گے۔ مگر آپ ان کی بیٹی کی اتنی تعریف کر رہے ہیں تو میرا مشورہ یہ ہی کہ آپ ابیک بھائی کی شادی اس کے ساتھ کر دیں۔ اسی بہانے میں بھی آجاؤں گا۔"

فون پہ ملک جہانگیر کی گرفت اچانک ہی سخت ہوئی تھی۔ وہ اس کی بات کے جواب میں خاموش تھے' بس ان کی سانسوں کی آواز ہی معاذ کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

اپنی چالاکی سے اس نے پوری صورت حال اپنے حق میں کر لی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ بابا جان کے دل پہ اس وقت کیا گزر رہی ہے۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

مکمل ناول
نبیلہ ابر راجہ
میں گماں نہیں یقین ہوں
دوسری قسط ۲
12
1
2
3
4
5
6
7
8
9
10
11

"اچھا چلو پھر اس پہ بات کریں گے" انہوں نے دل ہی دل میں کسی نتیجے پہ پہنچتے ہوئے مصلحت سے کام لے کر نرم انداز میں بات چیت کا اختتام کرنا چاہا۔ دوسری طرف موجود معاذ نے سکون کی سانس لی اور انہیں اپنا خیال رکھنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ ملک جہانگیر اپنی سوچوں میں گم تھے۔ کافی دیر سے خاموشی طاری تھی۔

"بابا جان کیا بات ہے آپ خاموش کیوں ہیں۔ معاذ سے کیا بات ہوئی ہے؟" ایبک احترام میں کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بول پڑا۔ ملک جہانگیر اس کی طرف دیکھ کر پھیکے انداز میں مسکرائے۔

"بس ایسے ہی اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا بول رہا تھا ابھی نہیں آسکتا۔" وہ خود پہ قابو پا کر نارمل انداز میں بولے۔ ایبک کو کچھ کچھ اندازہ تھا کہ اصل بات کیا ہے کیونکہ معاذ کی آواز فون سے باہر تک آرہی تھی مگر بابا جان اسے ٹال گئے تھے۔ کچھ دیر بعد انہیں سونے کا کہہ کر باہر نکلا تو سامنے ارسلان چچا کے پورشن کی طرف نظر اٹھ گئی۔ اندرونی اور بیرونی سب لائٹیں آن تھیں۔ وہ بلا ارادہ ان کے پورشن کی طرف بڑھا۔ یہ پہلو بہ پہلو ایک جیسے ڈیزائین اور طرزِ تعمیر کی حامل دو حویلیاں تھیں ایک میں ملک جہانگیر اور دوسری میں ملک ارسلان اپنی بیوی عنیزہ کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ دونوں عمارتیں دو منزلہ تھیں درمیان میں چند فٹ کا فاصلہ حائل تھا۔

ملک ایبک تھوڑی دیر بعد چچا کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ عنیزہ بھی جاگ رہی تھی۔ چچا سے حال احوال دریافت کرنے کے بعد ایبک خاموش ہو کر کچھ سوچنے میں مگن تھا۔ "کن خیالوں میں گم ہو ایبک؟" عنیزہ چچی نے خاموشی کے طلسم کو توڑا تو وہ چونک کر مسکرایا۔ "ابھی سے حسین تصورات میں کھو گئے ہو جناب۔ جبکہ پہلے ہم نے معاذ کے لیے لڑکی دیکھنے جانا ہے۔" ارسلان چچا کا لہجہ شرارت سے بھرا ہوا تھا۔ وہ گڑبڑا سا گیا۔

"تمہیں بھابھی نے بتایا تو ہوگا۔" عنیزہ چچی نے بات آگے بڑھائی ان کا اشارہ افشاں بیگم کی طرف تھا۔ ایبک انہیں بے چارگی سے دیکھ کر رہ گیا۔

"تمہیں اتنا تو پتا ہوگا کہ بھائی جان تمہاری اور معاذ کی شادی ایک ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کے لیے تو انہوں نے لڑکی پسند کر لی ہے۔ جبکہ تمہارے لیے کوئی ان کی نظروں میں سما ہی نہیں رہی۔" آخر میں چچا ارسلان شرارت سے مسکرائے تو وہ بھی ہنس دیا۔

"چچا جان ابھی بابا جان کی معاذ سے بات ہوئی ہے وہ شاید شادی اور اس رشتے کے لیے راضی نہیں ہے۔" ایبک نے محتاط الفاظ کا انتخاب کیا۔

"ہاں وہ شروع سے ہی اپنی پسند و ناپسند کے بارے میں بہت حساس ہے۔ اس کی یہ عادت ابھی تک نہیں بدلی ہے۔ زندگی کا ساتھی چننے کے معاملے میں بھی وہ بھائی کی پسند پہ اعتبار نہیں کرے گا۔" ارسلان نے صورت حال اور معاذ کے بارے میں درست ترین تجزیہ کیا تھا۔ ایبک اپنی الجھن کو دور کرنے ان کے پاس آیا تھا اور واقعی تھوڑی دیر بعد وہ سب فکریں ذہن سے جھٹک کر ان کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ عنیزہ بہت غور سے اسے تکتے ہوئے دل ہی دل میں جانے کیا کچھ سوچ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

زیان کالج سے آکر کھانا کھا رہی تھی۔ رحمت بوا اس سے حسبِ عادت اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھیں وہ پوری دلچسپی سے سن رہی تھی جب انہوں نے ایک سماعت شکن دھماکا کیا۔

"زیان بیٹا آج کل گھر میں تمہاری شادی کی باتیں ہو رہی ہیں۔" بوا نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑا کر کسی کے نہ ہونے کا یقین کر کے دبی دبی آواز میں یہ جملہ بولا۔ زیان اپنی جگہ سے کسی اسپرنگ کی طرح اچھلی۔ ہاتھ میں پکڑا روٹی کا نوالہ چھوٹ کر نیچے گر گیا۔

"آپ کو کس نے کہا ایسا؟" ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس اس نے ٹیبل پہ پٹخنے کے انداز میں رکھا۔ بوا اس کے تیوروں سے سہم گئیں۔ بات ان کے منہ سے

نکل چکی تھی وہ اب پچھتا رہی تھیں کہ ناحق اس ذکر کو چھیڑا۔

"چھوٹی بیگم' امیر میاں سے اس موضوع پہ بات کر رہی تھیں میں دودھ رکھنے ان کے کمرے میں گئی تو کچھ باتیں نہ چاہتے بھی میرے کان میں پڑ گئیں۔" انہوں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کیا کہہ رہی تھیں وہ؟" زیان کا اشارہ زرینہ بیگم کی طرف تھا۔ اس نے دانت سختی سے ایک دوسرے پہ جما رکھے تھے۔

"یہی کہہ رہی تھیں کہ اب زیان کی شادی کی فکر کرنی چاہیے۔۔۔ ایک لحاظ سے وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ امیر میاں کے جیتے جی تمہیں اپنے گھر کا ہو جانا چاہیے یہاں ایک پل کا بھی اعتبار نہیں ہے۔ پھر امیر میاں بھی تو فالج کے بعد بستر کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایسے میں چھوٹی بیگم کے سر پہ ہی ساری ذمہ داری ہے نا۔" زیان سن کر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ بوا نے شکر کیا کہ اس نے شور نہیں کیا۔ ورنہ اس سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔

زیان انہی قدموں چل کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے شادی کے بارے میں کچھ سوچا نہیں تھا اور ابھی شادی کے نام پہ اس کے خیالات عجیب سے ہو رہے تھے۔ جن کو وہ کوئی بھی معنی پہنانے سے قاصر تھی۔ دبے دبے الفاظ میں پہلے بھی اس کی شادی کا تذکرہ ہوتا تھا مگر اب شاید سنجیدگی سے اس پہ غور و فکر ہو رہا تھا تب ہی تو بوا نے اسے بتایا تھا۔ ورنہ وہ اس کے ساتھ ایسی باتیں کم ہی کرتی تھیں۔

"لگتا ہے زرینہ آنٹی مجھے اس گھر سے بہت جلد رخصت کرانے کے چکر میں ہیں اس سے پہلے ہی مجھے اپنے پیروں پہ کھڑا ہو جانا چاہیے تاکہ گھر والوں کی دست نگر بن کر زندگی نہ گزارنی پڑے۔" وہ بہت حساس ہو کر سوچ رہی تھی۔

امیر علی دو سال پہلے مفلوج ہونے کے بعد بستر کے ہی ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کے جسم کا دایاں حصہ سن تھا۔ مفلوج ہونے سے پہلے گھر پہ ان کی حکمرانی تھی۔

زرینہ بیگم اونچی آواز میں بات کرتے ہوئے بھی ڈرتی تھیں۔ امیر علی کے آنکھ کے اشارے تک کو سمجھ جاتیں پر اب وہ خود زرینہ بیگم کے اشارے پہ چلتے۔ زرینہ نے ان کے مفلوج ہونے کے بعد دل و جان سے ان کی خدمت کی ضروریات کا خیال رکھا' ہر طرح سے اپنا فرض ادا کیا اور کر بھی رہی تھیں بس اب بساط کے مہرے بدل گئے تھے۔ کوئی بھی کام ان کی مرضی کے بغیر سرانجام نہ پاتا۔ امیر علی کی بادشاہت ختم ہو گئی تھی۔

یہ زرینہ بیگم کی حکمرانی کا دور تھا اور وہ اس کے نشے میں چور تھیں۔ رابیل' منال اور آفاق تینوں ان کی طاقت تھے وہ ماں سے خائف ہونے کے علاوہ دبتے بھی تھے۔ انہوں نے گھر میں سختی دیکھی تھی پہلے باپ کی اور اب ماں کی۔

انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ حکمرانی کرنے والا کون ہے بس چہرے بدل گئے تھے پہلے امیر علی اور اب زرینہ بیگم حاکم تھیں۔ زیان امیر علی کی سب سے بڑی اولاد تھی۔ اس کا معاملہ اپنے تینوں بہن بھائی سے مختلف تھا۔ زرینہ اسے کسی خاطر میں ہی نہ لاتی تھیں۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد زیان بھی بے حس ہو چکی تھی۔ وہ اندر سے باغی اور بے چین روح تھی۔ اپنی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی راستہ نہ تھا۔ اس کے لب سلے تھے اور دل میں طوفان تھے۔ ان طوفانوں نے جانے کون کون سی تباہی ابھی لانی تھی۔ ابھی تک وہ حدود جاں میں ہی مقید تھے۔

☼ ☼ ☼

رنم دو دن سے کومل کی طرف تھی۔ وہ دونوں کمبائن اسٹڈی کر رہی تھیں۔ اشعر اور فراز بھی روز کچھ گھنٹوں کے لیے کومل کی طرف آ جاتے' تاکہ پڑھائی میں ان کی مدد کر سکیں۔ فراز خاص طور پہ اس سلسلے میں بہت مخلص تھا اپنے محنت سے بنائے گئے نوٹس تک ان کے حوالے کر دیے تھے۔

رنم پہ احمد سیال نے کہیں آنے جانے پہ کبھی کوئی

پابندی نہیں لگائی تھی ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک وہ اپنے فیصلے خود کرتی آئی تھی۔ وہ کسی بھی معاملے میں ان کے سامنے جواب دہ نہیں تھی۔ انہوں نے اسے ہر طرح کی آزادی دے رکھی تھی۔ ساتھ دنیا جہان کی ہر نعمت اس کے قدموں میں ڈھیر کردی تھی۔

کنزی احمد سیال کی محبوب بیوی اور رنم اس بیوی کی محبوب ترین نشانی تھی۔

کنزی سے ان کی شادی زوردار لو افیر کے بعد ہوئی۔ اسے پاکر وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان تصور کرتے تھے۔ پر ان کی یہ خوش قسمتی زیادہ عرصہ ان کے ساتھ نہیں رہ پائی۔ کنزی، رنم کو جنم دینے کے صرف چار سال بعد کینسر جیسی موذی بیماری میں مبتلا ہونے کے بعد چل بسی۔ انہوں نے بیوی کے علاج پہ پانی کی طرح پیسہ بہایا اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھایا علاج کی خاطر ملک سے باہر تک لے گئے مگر اسے یعنی کنزی کو موت کے منہ سے واپس نہ لاسکے۔ اس کی زندگی ہی مختصر تھی۔ وہ ان کا ساتھ چھوڑ کر ابدی سفر پہ روانہ ہو گئی۔

رنم چار سال کی بھولی بھالی بچی تھی اسے دیکھ بھال کے لیے عورت کی ضرورت تھی۔ یہ ضرورت ایک گورنس اور آیا کے ذریعے پوری ہوگئی۔ رنم انہی کے زیر سایہ عمر کے مدارج طے کرتی گئی۔ احمد سیال کو لوگوں نے شادی کے لیے اکسایا پر وہ جی جان سے بیٹی کی پرورش و تربیت میں مصروف رہے۔

رنم ددھیالی رشتوں کے معاملے میں خاصی بدنصیب واقع ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کے پاپا اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے وہ بھی عرصہ ہوا فوت ہو چکے تھے۔ رنم اپنے دادا دادی کی وفات کے بعد دنیا میں آئی۔

ہاں ننھیال میں اس کی ایک خالہ تھیں جو شادی کر کے کینیڈا میں جا بسیں تھیں ان سے فون پہ ہی رابطہ ہوتا وہ بھی کم کم۔

احمد سیال کاروباری بکھیڑوں اور کامیابیوں میں ایسے مصروف ہوئے کہ پھر مڑ کر کسی چیز کی طرف بھی نہ دیکھا۔ دوستوں، ملنے جلنے والوں نے دوسری شادی کے لیے بہت اکسایا، لڑکیاں دکھائیں آنے والے وقت سے ڈرایا پر وہ اپنے ارادے سے ایک انچ نہ سرکے۔ جسمانی اور جذباتی تقاضے کنزی کے ساتھ ہی مر گئے تھے۔ اب تو رنم جوان ہوگئی تھی۔ ان کے لیے وہی سب کچھ تھی۔

رنم کو انہوں نے ہر قسم کی آسائش اور آزادی دے رکھی تھی۔ اس کے حلقہ احباب میں لڑکے لڑکیاں دونوں تھے ویسے بھی اس کا تعلق معاشرے کی جس کلاس سے تھا وہاں یہ سب برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ رنم پارٹیز اور کلب جاتی، سوئمنگ کرتی، اپنے گھر میں دوستوں کو انوائیٹ کر کے ہلا گلا کرتی۔ احمد سیال اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے۔ انہوں نے کومل کے گھر کمبائن اسٹڈی کرنے کی اجازت بخوشی دی تھی۔

پچھلی بار سب دوستوں نے رنم سیال کے گھر رہ کر اگزام کی تیاری کی تھی۔ اس بار کومل کی باری تھی۔

✲ ✲ ✲

راعنہ گروپ کو جوائن ہی نہیں کر پا رہی تھی فراز اور اشعر روز شام کو کچھ گھنٹے کے لیے آجاتے۔ ان کے جانے کی بعد کومل اور رنم پھر سے پڑھائی اسٹارٹ کرتیں پر راعنہ نہیں آتی تھی۔

کومل تو صاف کہتی کہ راعنہ کو اپنے شادی کے خیالوں سے فرصت ملے تو وہ پڑھائی کی بھی فکر کرے۔

وہ آج کل سب دوستوں کی شرارتوں اور چھیڑ کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ وہ تو مزے سے انجوائے کر رہی تھی۔ انہیں کمبائن اسٹڈی کرتے ہوئے چھٹا دن تھا جب ان محترمہ کی شکل نظر آئی۔

کومل اور رنم نے اس کے وہ لتے لیے کہ توبہ ہی بھلی۔ اس نے کوئی احتجاج کیے بغیر کتابیں کھولیں۔ فراز اور اشعر اس کی درگت پہ مسکرانے لگے۔ کومل نے گھور کر اشعر کی طرف دیکھا تو وہ وہیں ہونٹ سیکوڑ کر سعادت مند بچہ بن گیا، پر فراز اپنے مخصوص انداز میں مسکراتا رہا۔

راعنہ سنجیدگی سے پڑھتی رہی۔ پھر کومل نے بھی حیرت انگیز شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے دوبارہ کچھ نہیں کہا۔ رات گیارہ بجے کے قریب راعنہ کے ہونے والے شوہر شہریار کی کال آئی تو وہ اپنا سیل فون لے کر کمرے کے کونے میں آ گئی۔ وہ کافی آہستہ آواز میں بول رہی تھی۔ "کیا کر رہی ہو؟" شہریار نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"میں فرینڈز کے ساتھ مل کر اگزام کی تیاری کر رہی ہوں۔"

"اب سو جاؤ صبح اٹھ کر پڑھ لینا اپنی صحت کا خیال رکھا کرو۔ اسی مہینے ہماری شادی ہے۔" اس نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا تو راعنہ نے چور نگاہوں سے ان سب کی طرف دیکھا۔ وہ سب بھی اسی کو دیکھ رہے تھے۔

راعنہ نے شہریار کو خدا حافظ بول کر فوراً" فون بند کر دیا۔ "میں سونے لگی ہوں۔" اس نے کتابیں سمیٹ کر ٹیبل پہ رکھ دیں۔

"ہاں ہاں اب تمہیں پڑھائی کی کیوں فکر ہو گی۔ آپ کے شہریار صاحب نے کہا ہو گا کہ جلد سو جایا کرو تاکہ شادی والے دن خوب صورت ترین نظر آؤ۔" کومل کا اندازہ سو فیصد درست تھا۔ راعنہ جھینپ سی گئی۔ رنم نے بڑی دلچسپی سے راعنہ کی طرف دیکھا جس کے چہرے پہ رنگ ہی رنگ بکھرے محسوس ہو رہے تھے۔ اس حال میں وہ اور بھی دلکش نظر آ رہی تھی۔ ویسے بھی رنم اور کومل کی نسبت وہ اتنی بولڈ نہیں تھی کافی حد تک مشرقیت اس میں موجود تھی۔ جس کا اظہار ابھی بھی اس کے رویئے سے ہو رہا تھا۔

فراز صرف اس بات کی وجہ سے راعنہ کو بہت سراہتا اور وہ پھول کر کپا ہو جاتی۔ "میں کل گھر جاؤں گی پاپا سے ملنے ہو سکتا ہے واپس نہ آؤں" رنم نے بھی کتابیں سائیڈ پہ کرتے ہوئے اعلان کیا۔

"ہوں پاپاز چائلڈ۔" "پتا نہیں شادی کے بعد کیا بنے گا تمہارا" کومل نے گہری فکر مندی سے اسے دیکھا تو جواباً" ہاتھ میں پکڑا کشن رنم نے اس پہ اچھالا۔

✿ ✿ ✿

میں چاہوں تجھ کو میری جان بے پناہ

آئینے میں خود کو دیکھ کر بال سنوارتے ہوئے سیٹی پہ شوخ سی دھن گنگناتے وہاب بہت مسرور نظر آ رہا تھا۔ روبینہ قدرے دور بیٹھی اس کی تیاری ملاحظہ کر رہی تھیں اور جی ہی جی میں کُڑھ رہی تھیں۔ وہاب کی تیاری ابتدائی مراحل میں تھی آخر میں اس نے خود کو پرفیوم میں تقریباً" نہلا ہی تو دیا۔ روبینہ کے دل میں عجیب عجیب سے خیالات آ رہے تھے۔ یقیناً" وہ زرینہ کے گھر جانے کے لیے اتنا اہتمام کر رہا تھا تب ہی تو ان کے دل میں اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ ان رہا نہیں گیا اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے بیٹے کو آواز دی "وہاب ادھر آؤ میری بات سنو۔"

"جی امی کیا بات ہے؟" وہ پرفیوم کی بوتل ڈریسنگ پہ رکھ کر ان کی طرف آیا۔

"میرے پاس بیٹھو۔" انہوں نے گہری نگاہ سے تک سک سے تیار بیٹے کو دیکھا۔

"جی اماں۔" حیرت انگیز طور پہ وہاب کا لہجہ پیار بھرا تھا۔ وہ لاڈ میں انہیں "اماں" بلاتا تھا۔

"کہیں جانے کی تیاری ہے؟" روبینہ کی نگاہ جیسے وہاب کو آج اندر تک پڑھ رہی تھی۔

"ہاں اماں دوستوں کے ساتھ باہر کھانے کے لیے جا رہا ہوں میری پروموشن ہوئی ہے نا اس لیے وہ سب ٹریٹ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔" اس نے تفصیل سے بتایا تو روبینہ کے لبوں سے سکون کی گہری سانس بر آمد ہوئی۔ وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھیں اور بیٹے نے ان کی سوچ کو غلط ثابت کیا تھا پہلی بار انہیں اپنی سوچ کے غلط ثابت ہونے پہ خوشی سی ہوئی۔

"مجھے تم سے ایک بات کرنی تھی۔" انہوں نے ٹھہر ٹھہر کر ایک جملہ بولا۔ "ہاں اماں کریں" وہ سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں چاہتی ہوں اب تمہاری شادی ہو جائے۔ اچھا کما رہے ہو گھر ہے گاڑی ہے "زندگی میں سکون ہی سکون ہے اس لیے میری خواہش

ہے کہ تمہاری شادی ہو جائے۔ تین بہنوں کے اکلوتے بھائی ہو آخر۔ ہمارے بھی تو کچھ ارمان ہیں۔"

"اماں مجھے تھوڑا اور سیٹل ہونے دیں سال چھ مہینے تک اس کے بعد شادی بھی کرلوں گا۔ میں اپنی بیوی کو زندگی کی ہر سہولت اور خوشی دینا چاہتا ہوں۔ ویسے بھی زیان ابھی پڑھ رہی ہے مجھے انتظار تو کرنا ہے۔" آخر میں روانی میں اس کے منہ سے زیان کا نام نکل گیا تو روبینہ ایسے اچھلی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

انہوں نے بہت مشکل سے اپنی اندرونی حالت پہ قابو پایا۔ "ہمارا بھلا زیان کی پڑھائی سے کیا لینا دینا۔"

"اماں مجھے زیان سے ہی شادی کرنی ہے۔" وہاب کی آنکھوں میں زیان کے نام سے ہی جگنو اتر آئے تھے۔ روبینہ کو دل کٹتا محسوس ہوا۔ ایک ثانیے کے لیے انہوں نے خود کو وہاب کی جگہ رکھ کر سوچا مگر پھر فوراً" اس کیفیت سے پیچھا چھڑایا۔

"امیر علی کبھی نہیں مانیں گے وہ اس کی شادی کم سے کم ہمارے خاندان میں کبھی نہیں کریں گے۔ اس لیے تمہیں کوئی آس لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔" روبینہ نے اسے ڈرایا مایوس کرنا چاہا۔

"آپ کو کیسے پتا کہ وہ ہمارے خاندان میں زیان کی شادی نہیں کریں گے؟" وہاب نے سوال کیا۔

"ارے میری زرینہ سے کتنی بار بات ہوئی ہے۔ وہ کہتی ہے امیر علی زیان کی شادی اپنے خاندان میں اپنی مرضی سے کریں گے۔" روبینہ نے بیٹے سے نگاہ چراتے ہوئے سفید جھوٹ بولا۔

"میں بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھے ہر صورت زیان سے شادی کرنی ہے چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔ میں کروں گا" وہاب کے تاثرات میں جارحانہ پن امنڈ آیا۔ روبینہ نے دہل کر بیٹے کی طرف دیکھا۔ اس کا یہ انداز اجنبی تھا بیٹے میں یہ جرات دبے خونی انہوں نے پہلی بار دیکھی تھی۔

"کیا کرلو گے تم اگر امیر علی نہ مانے تو...." وہ اپنے بدترین خدشات کے حقیقت ثابت ہونے کے خوف سے تھرا گئی تھیں۔

"بہت کچھ کر سکتا ہوں میں۔"

زیان 'امیر علی کی اولاد ہے ان کی مرضی وہ ہمیں رشتہ دیں نہ دیں یا جہاں ان کا دل کرے بیٹی کا رشتہ کریں۔"

"نہیں امی جہاں ان کا دل چاہے وہاں نہیں۔ میں اپنی محبت کو کسی اور کا نہیں ہونے دوں گا۔ اٹھالوں گا میں زیان کو۔ اس کا باپ نہ مانا تو!"

"وہاب۔" روبینہ کی آواز غصے سے چیخ میں ڈھل گئی۔ گویا ان کے بدترین خدشات سچ ثابت ہو سکے تھے۔

"بکواس بند کرو اپنی۔ کسی کی بیٹی کے بارے میں اپنے گھٹیا خیالات کا اظہار کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے تمہیں۔ آخر تمہاری بھی تین بہنیں ہیں۔ سب کی عزت سانجھی ہوتی ہے۔" وہاب ان کے چیخنے چلانے کی پروا کیے بغیر گاڑی لے کر جاچکا تھا۔ وہ اپنی سوچوں کے گرداب میں چکرانے لگیں۔ جن کے سپرد ابھی ابھی انہیں ان کے لاڈلے سپوت وہاب نے کیا تھا۔

اس کے لہجہ میں کوئی ڈر خوف یا لحاظ نہیں تھا 'سو پریشانی فطری تھی۔

☼ ☼ ☼

ملک ایبک 'بابا جان کی بات پہ بالکل خاموش سا ہو گیا تھا۔ وہ اس کے دل کی حالت سے بے خبر بولے جا رہے تھے۔ "معاذ کم عقل ہے اسے کیا خبر نسلوں کو چلانے کے لیے اچھی بیوی بہت مشکل سے ملتی ہے جہاں پھونک کر انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ احمد سیال کی بیٹی مجھے بہت اچھی لگی ہے۔

میں نے اسے معاذ کے لیے پسند کیا تھا' وہ نہیں مان رہا اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم ایک نظر لڑکی دیکھ لو۔ میں اس رشتے کو گنوانا نہیں چاہتا۔ احمد سیال کا خاندان ہمارا ہم پلہ ہے۔ مجھے پوری امید ہے تم انکار نہیں کرو گے۔" ان کے لہجے میں باپ والا مان اور بے پناہ توقعات تھیں۔

"ٹھیک ہے بابا جان جو آپ کا حکم" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ "مگر تم بھی تو کچھ بولو۔ یہ شادی تمہارا مستقبل ہے۔"

"بابا جان آپ نے فیصلہ کر تو لیا ہے میں اب اور کیا بولوں۔" ایبک نے پوری کوشش کی تھی کہ اس کے لہجے سے خفگی محسوس نہ ہونے پائے۔

ملک جہانگیر' افشاں بیگم کے ساتھ' احمد سیال اور ان کی بیٹی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ "آپ نے ایبک سے بات کی تو اس نے کیا کہا؟" افشاں بیگم کا لہجہ اضطراب سے بھرپور تھا۔

"اس نے کیا کہنا تھا بس یہی کہا کہ آپ کی مرضی۔ وہ میرا سعادت مند فرماں بردار بیٹا ہے۔ معاذ کی طرح اپنی من مانی کرنے والا نہیں۔"

"معاذ کو آپ نے اتنا سر چڑھایا ہوا ہے اس کی مرضی پہ چلتے ہیں۔ ایبک بھی تو ہماری ہی اولاد ہے۔ معاذ نے انکار کر دیا بغیر دیکھے اور آپ اسی رشتے کے لیے ایبک کو مجبور کر رہے ہیں۔ یہ انصاف تو نہ ہوا نا۔" افشاں کی خفگی محسوس کرنے والی تھی۔

"ارے نیک بخت میں ایبک کو مجبور نہیں کر رہا ہوں۔ بس اتنا کہا ہے کہ احمد سیال کی بیٹی بہت اچھی ہے۔" انہوں نے جھنجلا کر وضاحت دی۔

"ایبک کی بھی کوئی پسند ہو گی جبکہ آپ اپنی مرضی مسلط کر رہے ہیں۔" افشاں بیگم چڑ سی گئیں۔

"ایبک ایک بار احمد سیال کے گھر میرے ساتھ جائے گا وہاں اسے کچھ سمجھ میں آیا تو ٹھیک ہے ورنہ مجھے اپنی اولاد سے زیادہ کچھ عزیز نہیں۔"

"وہ معاذ کی طرح منہ پھٹ نہیں ہے کہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرے گا۔ آپ نے ایک بار بول دیا ہے نا اب وہ نا نہیں کرے گا۔ میرا بیٹا ہے میں جانتی ہوں اسے اچھی طرح۔ اور پتا نہیں آپ کے دوست کی بیٹی کن عادات کی مالک ہے۔ ہمارا ایبک سلجھا ہوا ذمہ دار بچہ ہے۔" افشاں بیگم کی فکر مندی ماں ہونے کی حیثیت سے تھی۔ ملک جہانگیر اب اس نقطے پہ سوچ رہے تھے۔

"میں تین چار دن تک چکر لگاؤں گا۔ احمد کی طرف اس کے کان میں بات ڈال دوں گا دیکھو پھر کیا ہوتا ہے۔ بعد میں تم سب اس کے گھر چلنا۔" وہ ابھی بھی اپنے ارادے پہ قائم تھے۔

☼ ☼ ☼

افتاں و خیزاں روبینہ صبح وہاب کے آفس جانے کے بعد سیدھی زرینہ کے گھر آ پہنچیں۔ ٹیکسی کر کے آئی تھیں پر سانس ایسے پھولا ہوا تھا جیسے میلوں دور سے دوڑتی آئی ہوں۔ امیر علی دوا کھا کے سو رہے تھے زیان اپنے کالج اور باقی سب بچے بھی اپنے اپنے اسکولوں میں تھے۔ زرینہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھیں مشہور چینل پہ ساس بہو کا ڈرامہ دیکھ رہی تھیں۔ روبینہ کو اس وقت اچانک اپنے گھر دیکھ کر حیران ہو گئیں۔ انہوں نے فون کر کے اپنے آنے کی اطلاع بھی تو نہیں دی تھی۔

"کیسی ہیں باجی آپ؟ سب خیر ہے نا؟" زرینہ نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ روبینہ کے چہرے پہ بکھرے پریشانی کے رنگ بتا رہے تھے کہ سب خیر نہیں ہے کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

"میں اس وقت کسی کے علم میں لائے بغیر تمہارے پاس آئی ہوں۔" انہوں نے اضطراب کے عالم میں دونوں ہاتھ ملے۔

"آپا بتائیں تو کیا بات ہے؟" زرینہ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ "وہاب' زیان سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" انہوں نے آرام آرام سے الف تا ے سب واقعہ ان کے گوش گزار کر دیا۔

"یہ تو مجھے بھی پتا ہے کہ زیان سے وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ ایسے ہی بلا وجہ یہاں کے چکر نہیں لگتے۔ پر مجھے کسی صورت بھی یہ پسند نہیں ہے۔ میں سب کچھ جانتے بوجھتے بھی اندھی' گونگی' بہری بنی رہتی ہوں۔ وہاب پاگل ہو چکا ہے مگر میں نے اسے کہا کچھ نہیں کیونکہ میری بہن کا بیٹا ہے۔ پر زیان کے ساتھ اس کی شادی کی خواہش کسی صورت بھی پوری نہیں کی جا

سکتی۔ کیونکہ میں ساری عمر ہر گز ذیان کو برداشت کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میں شادی کر کے اس گھر میں آئی تو پہلے دن سے ہی میرے شوہر نے مجھے اس کی اہمیت اور مقام بتایا۔ میں سلگتی کڑھتی رہی۔ امیر علی کو بیٹی بہت عزیز تھی نئی نویلی دولہن سے بھی زیادہ۔ اتنے برس کانٹوں پہ لوٹتے گزارے ہیں میں نے۔ اب وہاب کی وارفتگی مجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہے وہ دیوانہ وار اس کے لیے میرے گھر کے چکر لگاتا ہے صرف ایک نظر اسے دیکھنے کی خاطر اور وہ مہارانی سیدھے منہ وہاب سے بات تک نہیں کرتی۔ میرا خون کھول جاتا ہے پر وہاب کو اپنی عزت اور بے عزتی کا کوئی خیال تک نہیں ہے۔ وہ ذیان کے اس اہانت بھرے رویے کو ادا تصور کرتا ہے۔ لیکن اسے یہ ہرگز نہیں پتا کہ ذیان مجھ سے اور مجھ سے وابستہ ہر شخص سے نفرت کرتی ہے۔ کیا آپا آپ ایسی لڑکی کو بہو بنانا پسند کریں گی جو آپ کے بیٹے کی شکل تک نہ دیکھنا چاہتی ہو۔" زرینہ کے ایک ایک لفظ میں نفرت و بے زاری تھی۔ ان کا سوال سن کر روبینہ نے فوراً" نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے کیا پڑی ہے اسے بہو بنا کر اپنی زندگی خراب کروں ساتھ بیٹے کی بھی۔ مجھے یہ قیامت تک منظور نہیں ہے۔" روبینہ آپا کے عزم سے زرینہ کے دل میں ٹھنڈک اتری۔ ورنہ انہیں خوف تھا کہ شاید آپا وہاب کی ضد اور محبت سے مجبور ہو کر ذیان اور وہاب کے رشتے کی حمایت نہ کر دیں۔

"ہاں آپا کیونکہ یہ رشتہ کسی طرح بھی آپ کے حق میں مناسب نہیں ہے۔ ذیان مجھ سے بدلہ لینے کے لیے آپ اور وہاب کی زندگی کو اجیرن کر دے گی۔" زرینہ نے آپا کو اور ڈرایا۔

"کچھ کرو زرینہ۔ وہاب تو پاگل ہو رہا ہے اس کلموہی ذیان کے پیچھے کہتا ہے اٹھوا لوں گا اسے۔ جب میں نے ڈرایا کہ امیر علی کبھی بھی ہمیں رشتہ نہیں دیں گے۔"

"آپا آپ کی یہ بات سچ ہے واقعی امیر علی ذیان کا رشتہ آپ کو نہیں دیں گے۔"

"ارے نہ دیں رشتہ مجھ اس حور پری کا رشتہ چاہیے بھی نہیں جس نے میرے بیٹے کو پاگل بنا رکھا ہے۔" روبینہ نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

"آپا اس مسئلے کا حل سوچنا پڑے گا ورنہ وہاب مایوسی کی صورت میں کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتا ہے۔"

"جلدی کچھ سوچو زرینہ میرا وہاب تو پاگل ہو رہا ہے۔" "میں اس پہ غور کر رہی تھی آپ کے آنے سے پہلے۔" زرینہ کی آواز بہت دھیمی اور سرگوشیوں کی صورت میں تھی۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

ملک جہانگیر نے راتوں رات احمد سیال کی طرف جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ انہوں نے بیگم افشاں سے بھی مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

اب وہ صبح صبح گاڑی میں سامان رکھوا رہے تھے۔ موسمی پھلوں کے ٹوکرے، مٹھائی، خشک میوہ جات، دیگر چیزیں، حتیٰ کہ گھر کے ملازموں تک کے کپڑے بھی اس سامان میں شامل تھے۔ وہ ایبک کے رشتے کی بات چھیڑ کر احمد سیال کے دل کو ٹٹولنا چاہ رہے تھے اس لیے اکیلے ہی اس کے گھر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

چھٹی کا دن تھا احمد سیال گھر پہ ہی تھے۔ ملک جہانگیر کے ساتھ آئے ملازموں نے سامان گاڑی سے اتار کر اندر پہنچایا۔ احمد سیال ان کے استقبال کے لیے خود باہر آئے اور انہیں اندر لے گئے۔

ملک جہانگیر اپنے ہمراہ جو کچھ لائے تھے اس سے صاف ظاہر تھا کہ ان کا آنا بے سبب نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ ورنہ نوکروں سمیت لدھے پھندے آنا سوچنے پہ مجبور کر رہا تھا۔ ملک جہانگیر پہلے بھی ان کے گھر آتے تھے اور گاؤں کی سوغات خاص طور پر لاتے اور بھجواتے بھی تھے پر آج نوکروں کے ہمراہ اس طرح آنا معنی خیز تھا۔ چھٹی کے دن ان کی آمد نے اور خاص طور پہ انداز نے احمد سیال کو حیران کر دیا

تھا۔

وہ انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ ملک جہانگیر نے خیر خیریت اور دیگر احوال معلوم کرنے کے بعد فوراً" رنم کے بارے میں پوچھا۔ "وہ اپنی ایک دوست کے گھر پہ ہے کچھ دن سے۔ سب دوست مل کر امتحان کی تیاری کر رہے ہیں وہاں۔" احمد سیال نے جواب دیا۔

"اچھی بات ہے ماشاء اللہ۔ رنم بیٹی دیکھتے ہی دیکھتے اتنی بڑی ہو گئی ہے۔"

"ہاں بیٹیوں کو بڑا ہوتے کون سی دیر لگتی ہے۔" احمد سیال مسکرائے۔

"اور بیٹیوں کو بڑا ہونے کے بعد اپنے گھر بھی وداع کرنا پڑتا ہے۔" ملک جہانگیر دھیرے سے بولے تو احمد سیال نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر رک کر ملک جہانگیر پھر گویا ہوئے۔ "میں تمہارے پاس اپنے بڑے بیٹے ملک ایبک کے رشتے کے سلسلے میں آیا ہوں۔ تم میرے گہرے دوست ہو ہم دونوں کے خاندان ہم پلہ ہیں۔ میں اس دوستی کو رشتہ داری میں بدلنا چاہتا ہوں۔ تمہاری بیٹی کو اپنی بیٹی بنا کر۔" ان کی بات پہ احمد سیال نے سکون کی سانس لی۔

"میں خوش ہوں کہ تم اس مقصد کے لیے میرے گھر آئے ہو۔ مگر میں تمہیں کوئی امید نہیں دلا سکتا۔"

"کیوں۔" یکدم ہی ملک جہانگیر پریشان ہو گئے۔

"میں نے اپنی بیٹی کو لاڈ پیار سے پالنے کے ساتھ ساتھ ہر طرح کی آزادی بھی دے رکھی ہے۔ میں کسی بھی معاملے میں اس پہ اپنی مرضی مسلط نہیں کر سکتا۔ وہ باشعور ہے' تعلیم یافتہ ہے اپنا اچھا' برا خود سوچتی ہے اور اپنے فیصلے بھی شروع سے خود کرتی آئی ہے۔"

ملک جہانگیر کے چہرے پہ مایوسی کی لہر پھیلتی جا رہی تھی جو احمد سیال کی نگاہ سے پوشیدہ نہ تھی۔

"ابھی تو رنم کے اگزام کا چکر چل رہا ہے وہ فری ہو لے تو میں اس کی رائے معلوم کروں گا۔ وہ مان جائے ملاقات کے لیے راضی ہو جائے تو میں تمہیں بتا دوں گا۔" احمد سیال نے ممکن طور پہ ان کی دلجوئی کرنی چاہی۔ ساتھ ہی ملک ایبک کا بھرپور سراپا احمد سیال کے تصور میں آ گیا۔ وہ نظر انداز کرنے کے قابل نہ تھا۔ لیکن یہاں معاملہ لاڈلی بیٹی کا تھا جس نے آج تک اپنی زندگی کا چھوٹے سے چھوٹا فیصلہ بھی خود کیا تھا وہ اسے مشورہ دے سکتے تھے پر اپنی بات ماننے پہ مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ملک جہانگیر کو صاف آگاہ کر دیا تھا۔ کہ رنم کی مرضی ضروری ہے۔ ملک جہانگیر واپسی پہ پورے راستہ معاذ کی نافرمانی اور صاف انکار پہ کڑھتے آئے تھے۔

رنم انہیں سو فی صد معاذ کی عادات کا پرتو دکھائی دے رہی تھی۔ معاذ اسے مل لیتا اس کے خیالات سے واقف ہو جاتا تو کبھی انکار نہ کرتا۔

انہوں نے ایبک کا رشتہ لے جا کر غلطی تو نہیں کی ہے کیونکہ وہ معاذ کے بالکل برعکس ہے۔ جبکہ رنم کے بارے میں جو احمد سیال نے بتایا تھا وہ ملک جہانگیر کے لیے تھوڑا سا پریشان کن تھا کہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں اپنا فیصلہ خود کرنے کی عادی ہے۔ اگر وہ مان جاتی ہے اور یہ شادی ہو جاتی ہے تو عادات کا یہ تضاد ایبک کے لیے پریشانی تو نہیں پیدا کرے گا۔ معاذ کے انکار کے بعد انہوں نے ایبک کا رشتہ لے جا کر غلطی تو نہیں کی ہے۔ وہ اپنے پریشان کن خیالات میں گھرے گھر واپس آئے تھے۔

☆ ☆ ☆

"ملک محل" میں رات کا کھانا کھایا جا رہا تھا۔ کھانے کی ٹیبل پہ پانچ نفوس موجود تھے۔ ملک جہانگیر' احمد سیال کے بارے میں ہی بات کر رہے تھے۔ ملک ارسلان بیچ بیچ میں سوال کر رہے تھے۔ ایبک بالکل لاتعلق بنا اپنی پلیٹ پہ جھکا کھانا کھا رہا تھا۔

"بھائی جان یہ تو بتائیں کہ لڑکی کیسی ہے؟" عنیزہ چچی نے بھی سوال کرنا ضروری سمجھا۔

"لڑکی ماشاء اللہ خوب صورت ہے یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہے اس بار جب میں احمد کے پاس جاؤں گا تو بے شک تم اور ارسلان میرے ساتھ جانا۔" ملک

جہانگیر نے کھلے دل سے آفر کی۔ "ہاں بھائی جان میں تو ضرور جاؤں گی۔"

افشاں بیگم بالکل خاموش تھیں کیونکہ ان کا لاڈلا بیٹا ایبک جو خاموش تھا۔ انہیں ملک جہانگیر کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"احمد نے بیٹی کو بڑے پیار سے پالا ہے۔ اس کی ہر خواہش پوری کی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ شادی جیسے اہم معاملے میں بھی بیٹی کی رضامندی شامل ہو تب ہی تو اس نے کہا ہے کہ جب میری بیٹی راضی ہوئی تو میں آپ کو اپنے گھر آنے کا بول دوں گا۔ بیٹی کا باپ ہے نا۔ جوتیاں تو گھسوائے گا نا۔"

"ایبک اتنا گیا گزرا نہیں ہے کہ احمد سیال کی بیٹی کے ہاں کے انتظار میں بیٹھا رہے۔ میرے بیٹے کے لیے کمی نہیں ہے لڑکیوں کی" افشاں بیگم پہلی بار بولیں۔ انہیں ملک جہانگیر کے آخری جملوں پہ بے پناہ غصہ تھا۔

ملک جہانگیر تاویلیں اور صفائی دے رہے تھے۔ ایبک کھانا کھا کر ٹیبل سے اٹھ گیا۔ افشاں بیگم نے شکوہ کناں نگاہوں سے مجازی خدا کی طرف دیکھا۔ جیسے سارا قصور ان کا ہو۔

"آپ نے ملک صاحب! اپنے دوست کے چکر میں بیٹے کی مرضی یا رائے جاننے کی ذرا بھی زحمت نہیں کی۔ جبکہ لڑکی آپ نے معاذ کے لیے پسند کی تھی معاذ نے انکار کر دیا آپ جھٹ ایبک کے پیچھے پڑ گئے۔" افشاں بیگم کمرے میں آتے ہی شروع ہو گئیں۔ کھانے کی ٹیبل پہ انہوں نے بمشکل تمام اپنا غصہ قابو کیا تھا۔ ایبک کی مسلسل خاموشی سے ان کا دل ہول رہا تھا۔

"ارے نیک بخت احمد سیال میرا پرانا دوست ہے اس کی بیٹی کو دیکھتے ہی میرے دل میں اسے بہو بنانے کا خیال آیا۔ میں نے سوچا لڑکی اور اس کا خاندان اچھا ہے معاذ نے انکار کر دیا ہے تو کیا ہوا ایبک بھی تو میرا بیٹا ہے۔" ملک جہانگیر نے حتی الامکان نرم انداز میں اپنی شریک حیات کا غصہ کم کرنے کی کوشش کی۔

"آپ نے ہم میں سے کسی کو بھی لڑکی نہیں دکھائی اکیلے اکیلے ہی سب طے کر لیا۔ ایک میرا ہی بیٹا ہے اس کی شادی میں فیصلے میں آپ کو میری رائے پہ بھی غور کرنا چاہیے۔" افشاں بیگم اپنے موقف پہ ڈٹی ہوئی تھیں۔

"اچھا ابھی کون سا میں نے شادی طے کر دی ہے صرف بات ہی تو کی ہے۔" ملک جہانگیر کا مصلحت آمیز نرم لہجہ افشاں بیگم کے اونچے پارے کو نیچے لانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

"میرے بیٹے کو کوئی اعتراض ہوا تو آپ اس کے ساتھ زبردستی نہیں کریں گے۔" وہ اس وقت ضدی بچے کی طرح ہو رہی تھیں۔

"ہاں ٹھیک ہے ایسا ہی ہو گا۔" انہوں نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تو افشاں بیگم کے چہرے پہ مسکراہٹ آگئی۔

☼ ☼ ☼

چھٹی کا دن تھا۔ سب گھر پہ ہی تھے۔ زیان کی آنکھ صبح نو بجے کے قریب ہونے والے شور شرابے کی وجہ سے کھلی۔ امیر علی کی طبیعت رات سے ناساز تھی۔ انہیں تیز بخار تھا اور ابھی تک حالت ویسی ہی تھی۔ زرینہ بیگم آفاق پہ غصہ کر رہی تھیں کہ کسی ڈاکٹر کو جلدی سے لے کر آؤ۔ وہ بول بول کر دل کا بوجھ ہلکا کر رہی تھیں۔ زیان آنکھیں ملتی اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ زرینہ آفاق کو باتیں سنا ہی رہی تھیں کہ خوشبو میں بسا نک سک سے تیار وہاب چلا آیا۔ انہیں غصہ تو بہت آیا پر امیر علی کی طبیعت کی وجہ سے پی گئیں ساتھ وہاب نے آتے کے ساتھ ہی ان کی پریشانی کا بوجھ بانٹ لیا۔ وہ الٹے قدموں ڈاکٹر کو لینے چلا گیا۔

گھر میں دو دو گاڑیاں کھڑی تھیں پر ڈرائیور کل سے چھٹی لے کر گاؤں گیا ہوا تھا۔ ہفتے کی شام وہ چھٹی لے کے جاتا اور سوموار کی صبح لوٹ آتا۔ آفاق ابھی بہت چھوٹا تھا ڈرائیونگ کے قابل نہ تھا۔ زیان کو گاڑی یا ڈرائیونگ سے دلچسپی ہی نہیں تھی۔ زرینہ ڈرائیور کی

عدم موجودگی میں بہت غصہ کرتیں جیسے آج آفاق پہ کر رہی تھیں۔ حالانکہ اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ زیان جلدی جلدی منہ پہ پانی کے چھینٹے مار کر واش روم سے باہر آئی۔ آفاق کو سر جھکائے کھڑا دیکھ کر دل میں تاسف اور ہمدردی کی لہر اٹھتی محسوس ہوئی۔ وہ نظرانداز کر کے ابو کے پاس چلی آئی۔ کیونکہ اس کی یہ ہمدردی آفاق کو مہنگی پڑ سکتی تھی۔ وہ زیان کے ساتھ بات بھی کر لیتا تو زرینہ کے ہاتھوں اس کی شامت آتی۔ رفتہ رفتہ زیان نے ہی بہن بھائی کو مخاطب کرنا ہی چھوڑ دیا۔

بخار کی شدت کی وجہ سے امیر علی بے سدھ تھے۔ زیان کچھ دیر وہیں کھڑی رہی پھر ان کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

تھوڑی دیر بعد وہاب اپنے ساتھ ڈاکٹر کو لیے گھر میں داخل ہوا۔ تب تک زیان اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ زرینہ اور آفاق دونوں وہاب اور ڈاکٹر کے ساتھ امیر علی کے پاس کھڑے تھے۔ وہاب نے متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر پورے کمرے میں دیکھا جیسے وہاں سے اچانک زیان نمودار ہو گی۔ اس کی نگاہوں کی یہ تلاش پریشانی کے باوجود زرینہ کی آنکھوں سے چھپ نہ سکی۔ نفرت میں ڈوبی زہر بھری مسکراہٹ ان کے لبوں پہ آگئی۔

"بہت جلد میں زیان کو اس گھر سے دفعان کرنے والی ہوں پھر دیکھوں گی کیا کرتے ہو تم۔" ڈاکٹر امیر علی کا چیک اپ کرنے کے بعد وہاب کے ساتھ واپس جا رہا تھا۔ وہاب کو پلٹتے دیکھ کر زرینہ نے ایک بار پھر اپنے ارادے کو مضبوط کیا۔

☆ ☆ ☆

زیان نے آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہاب ابھی ابھی ڈاکٹر کو ڈراپ کرنے گیا تھا زرینہ بیگم بھی باہر تھیں۔ زیان چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی امیر علی کے بیڈ کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ کمبل ان کے سینے تک پڑا تھا اور چہرا بخار کی حدت سے لال ہو رہا تھا۔ قدموں کی آہٹ پہ امیر علی نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے

زیان کھڑی انہیں فکرمندی سے دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے بمشکل تمام آنکھیں کھولتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نقاہت کے سبب ان کا بائیں ہاتھ کانپ رہا تھا۔ یہ شکر کا مقام تھا کہ زیان فالج کے اٹیک کے بعد دو سال کے عرصے میں آہستہ آہستہ ٹھیک ہو گئی تھی۔

زیان نے ان کے پاس بیٹھنے کے خیال سے جھجک محسوس کی۔ کیونکہ اسے یاد نہیں تھا کہ زرینہ آنٹی سے شادی کے بعد انہوں نے اسے اپنائیت سے اپنے پاس بٹھایا ہو۔ اب اس کے جذبوں اور دل میں خود بہ خود ہی دوری آگئی تھی۔ اس نے چاہنے کے باوجود بھی کرسی پہ بیٹھنا پسند کیا۔ امیر علی کے دل کو کسی دکھ نے جکڑا تو مارے کرب کے انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

"ابو کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟" زیان نے اپنے آنسو پینے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا جو امیر علی کی اس بے بسی و بے چارگی پہ آنکھوں سے امنڈنے کو تیار تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتے زرینہ اچانک اندر آئیں۔

"ڈاکٹر نے آپ کو آرام کرنے کو کہا ہے۔" زیان کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے یہ بات امیر علی سے کہی۔ ساتھ ہی زرینہ بیگم نے کمرے میں جلتی وہ لائیٹ بھی بند کر دی جو زیان کی آمد سے پہلے جل رہی تھی۔ کمرے میں اچانک ملگجا سا اندھیرا چھا گیا کیونکہ کھڑکیوں اور دروازے پہ بھاری پردے تھے۔ پھر موسم بھی ابر آلود تھا سورج کی روشنی ندارد تھی۔ آسمان پہ ڈھونڈے سے بھی روشنی کی کوئی کرن نہیں مل رہی تھی۔

زیان نے وہاں بیٹھے بیٹھے شدید ہتک محسوس کی۔ کرسی پیچھے کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے جانے کے بعد زرینہ نے سکون کی سانس لی۔ زیان اور امیر علی کی قربت انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ کسی نہ کسی بہانے زیان کو اپنے شوہر سے دور کر کے انہیں یک گونہ خوشی ملتی۔

امیر علی کے چہرے پہ چھائے دکھ کے سائے اچانک کچھ اور بھی گہرے ہو گئے۔ زرینہ اپنی خوشی میں

محسوس ہی نہ کر پائیں۔ امیر علی صرف اور صرف اس کے تھے بلا شرکت غیرے۔ زرینہ نے زیان کو دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا تھا۔

"اب آپ کچھ بہتر محسوس کر رہے ہیں؟" زرینہ کا ہاتھ ان کے ماتھے پہ تھا۔ امیر علی کو اس وقت زرینہ کا ہاتھ کوڑیالے ناگ کی طرح ڈستا محسوس ہو رہا تھا۔ انہوں نے اپنے ماتھے پر سے زرینہ کا ہاتھ ہٹا دیا۔ لیکن اب انہیں پروا نہیں تھی کیونکہ زیان یہاں کمرے میں نہیں تھی۔

"تم نے اچھا نہیں کیا ہے زرینہ۔ زیان چلی گئی ہے۔ پہلے ہی وہ مجھ سے صدیوں کے فاصلے پہ کھڑی ہے۔ تمہیں کیا ملتا ہے میری یہ چھوٹی سی خوشی چھین کر۔" امیر علی کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر ان بند آنکھوں کے پیچھے جو غصہ اور بے بسی تھی زرینہ کو اس کا اندازہ تھا۔

"میں نے اپنی محبت ' چاہت اعتبار سب کچھ تمہیں سونپا پر اس کے باوجود تمہاری تنگ دلی نہیں جاتی۔ زیان کے ساتھ تم ایسا کیوں کرتی ہو۔ کیوں بار بار اسے یہ احساس دلاتی ہو جیسے وہ میری بیٹی ہی نہ ہو؟ اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ وہ زیرو ہے میری زندگی میں۔" بولتے بولتے ان کی آواز رنج سے بھرا سی گئی۔

"ارے آپ خوامخواہ ایسا سوچ رہے ہیں میں نے کبھی اسے یہ احساس نہیں دلایا ہے۔ خون کا اثر ہے یہ۔ اس کی ماں بھی تو ایسی تھی نا۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ فضول کی سوچوں کو ذہن پہ سوار مت کریں۔" زرینہ ان کا سر دبانے بیٹھ گئیں۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

امیر علی تھک ہار کر خاموش ہو گئے۔ کیونکہ زرینہ ہار ماننے والی نہیں تھیں۔ اس کا اندازہ انہیں اپنی بیماری کے دوران اچھی طرح ہو گیا تھا اور ہو بھی رہا تھا۔ "اچھا آپ کے لیے کھانے کیا بنواؤں؟" کمرے میں چھائی وحشت ناک خاموشی کو زرینہ نے توڑنا چاہا۔

"جو مرضی بنا لو۔"

"پھر بھی آپ کا دل کوئی خاص چیز کھانے کو کر رہا ہو تو۔" وہ اصرار پہ اتر آئیں۔

"نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔ جو بنا ہوا کھا لوں گا۔"

ان کی بے نیازی بدستور قائم تھی۔ "میں بوا سے کہتی ہوں کھیر بنا لے آپ کو پسند بھی تو ہے نا۔" جواباً امیر علی خاموش رہے جیسے بات نہ کرنا چاہ رہے ہوں۔

زرینہ پہ کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بدستور مسکراتی کچن کی طرف آ گئیں۔ رحمت بوا وہیں تھیں زرینہ نے انہیں کھیر بنانے کا بول کر زیان کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ پر وہ سامنے کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ زرینہ کے سینے سے آسودہ سانس خارج ہوئی۔ وہ دوبارا امیر علی کے کمرے کی طرف جانے ہی والی تھیں کہ وہیں رک گئیں۔ وہاب ڈاکٹر کو چھوڑ کر واپس آ رہا تھا۔ وہ آتے ہوئے میڈیکل اسٹور سے امیر علی کی دوائیاں بھی لے آیا تھا۔ اس نے دوائیوں کا شاپر زرینہ بیگم کے حوالے کیا اور خود صحن میں پڑی کرسی پہ ڈھیر ہو گیا۔

زرینہ بیگم نے وہیں سے رابیل کو آواز دی کہ دوائیاں اندر لے جا کر رکھ دے۔ وہاب زرینہ سے باتوں میں مصروف تھا۔ بوا اس کے لیے ناشتا بنا رہی تھیں کیونکہ وہ گھر سے ناشتا کیے بغیر آیا تھا۔

اتوار کے دن اس کا خاص چکر لگتا تھا خالہ زرینہ کی طرف۔ دن کا بیشتر حصہ یہاں گزارنے کے بعد وہ شام ڈھلے واپسی کی راہ لیتا۔ آج بھی وہ اپنے پرانے معمول پہ کاربند رہا۔

صحن میں بہت ٹھنڈ تھی۔ زرینہ اور وہاب دونوں سٹنگ روم میں آ گئے جہاں ہیٹر جلنے سے خوشگوار گرمائش پھیلی ہوئی تھی۔

وہاب کی نگاہیں مسلسل کچھ ڈھونڈ رہی تھیں پر گوہر مقصود مل کے نہیں دے رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کی بے چینی و بے قراری صاف ظاہر تھی۔ زرینہ واقف تھیں پر جان کر انجان بن گئیں۔

بوا نے ناشتا کمرے میں لا کر رکھا۔ گرم گرم پراٹھے کے ساتھ آملیٹ کھاتے ہوئے اور چائے سپ کرتے ہوئے وہاب کا دل زیان میں ہی اٹکا رہا۔

رحمت بوا نے کھانا بنایا' سب کو دیا' پھر دوسری کام والی لڑکی ثمینہ نے کچن سمیٹا' برتن دھوئے' اپنی جگہ پہ رکھے۔ بادل لمحہ بہ لمحہ گہرے ہوتے جارہے تھے دوپہر کا وقت تھا' پر رات کا سماں محسوس ہونے لگ گیا تھا۔ زیان باوجود کوشش کے بھی وہاب کو نظر نہیں آئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں تھی اور دروازہ اندر سے بند تھا۔

وہاب اس کے کمرے کے سامنے سے کتنے چکر لگا چکا تھا۔ ابر آلود موسم کی وجہ سے سب اپنے اپنے کمروں میں دبکے پڑے تھے۔

ایک وہی تھا جو اس سرد موسم میں اس سرد مہر لڑکی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے مرا جارہا تھا۔ تھک ہار کر وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گیا اور ریموٹ کنٹرول کے بٹن خوا مخواہ دبانے لگا۔ یہ مشغلہ اکتا کر رکھ دینے والا تھا۔

آسمان سے بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور گرج کی صورت میں صدائے احتجاج بلند ہوئی تو اسے سب کچھ ہی فضول لگنے لگا۔ بارش کسی بھی وقت شروع ہو سکتی تھی وہ جیکٹ کے کالر اونچے کرکے زرینہ کے گھر سے نکل آیا۔ خالہ خدا حافظ کہنے اور چھوڑنے گاڑی تک اس کے ساتھ ہی آئیں۔ وہاب کے چہرے کی پژمردگی اور ویرانی ان کی دلی خوشی کو بڑھا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

رنم نے اپنے گھر سے کچھ ضروری چیزیں لینی تھیں۔ وہ ایسے وقت آئی جب احمد سیال گھر پہ ہی تھے۔ وہ آدھ گھنٹہ پہلے ہی پہنچے تھے۔ وہ پاپا کے گلے لگ گئی۔ "پاپا میں ٹائم پہ پہنچی ہوں نا۔" وہ شوخی سے ان کی آنکھوں پہ لگے گلاسز اتار کر خود پہنتے ہوئے بولی۔

"ہاں تم اور میں دونوں ٹائم پہ آئے ہیں کھانا اکٹھے کھائیں گے۔"

اوکے پاپا میں چینج کرکے آتی ہوں ساتھ مجھے اپنے کچھ کپڑے لینے ہیں۔ واپس بھی تو جانا ہے نا۔"

"ہاں تم نے جو کرنا ہے کرو جب تک کھانا بھی لگ جائے گا۔"

"اوکے پاپا۔" وہ بال جھلاتی منظر سے ہٹی۔ کپڑے ملازمہ نے نکال کر رکھ دیے تھے اور کھانا بھی تیار تھا۔ احمد سیال اس کے انتظار میں تھے۔ "پروگرام کی تیاری کیسی چل رہی ہے؟" وہ واپس ڈائننگ ٹیبل پہ آکر بیٹھی ہی تھی کہ پاپا نے پوچھا۔

"پاپا تیاری تو اے ون ہے۔ آپ سنائیں مجھے مس تو نہیں کیا؟" وہ مسکراتے ہوئے دریافت کر رہی تھی۔

"ارے روز مس کرتا ہوں پھر یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا ہوں دل کو تسلی دے لیتا ہوں کہ ایک دن تمہیں اس گھر سے جانا ہی تو ہے۔" اداسی ان کی آنکھوں سے عیاں تھی۔

"اوہو پپا آپ تو بہت ہی فلاور نگ رہے ہیں۔" رنم نے ہنستے ہوئے بریانی کی ڈش سے چاول نکالے۔

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو شاید۔ بیٹی کے معاملے میں ہر باپ کی سوچ اور فکر مندی ایک جیسی ہوتی ہے۔ اینی وے تمہارے لیے ایک خبر ہے میرے پاس۔" احمد سیال نے بغور اس کی طرف تکتے جیسے اس کا رد عمل جاننا چاہا۔ "کیسی خبر؟" اس نے بھنویں اچکائیں۔

"میرے ایک دوست ہیں ملک جہانگیر تم نے نام تو سنا ہوگا۔ ابھی کچھ دن پہلے ہمارے گھر آئے بھی تھے۔ تم سے خیر خیریت بھی پوچھی تھی۔"

"ہاں ہاں وہی انکل چوہدری ٹائپ سے۔" رنم کی بے اختیار کہی گئی بات پہ احمد سیال کو ہنسی آگئی۔

"ارے وہ چوہدری ٹائپ نہیں ہے اپنے علاقے کا بہت بڑا جاگیردار ہے۔ خیر وہ اپنے بیٹے کا پروپوزل لائے ہیں تمہارے لیے میں چاہتا تھا تمہارے اگزام ہو جائیں تو تم سے شیئر کروں پر تم کو دیکھ کر رہا نہیں گیا۔" انہوں نے وضاحت دی۔

"پاپا ابھی تو میں بہت بزی ہوں۔ بعد میں اس ٹاپک پہ بات ہوگی۔" وہ جلدی جلدی کھانا کھا رہی تھی۔

"ایز یو وش بیٹا۔" ہمیشہ کی طرح اس بار بھی احمد

سیال نے بال اس کے کورٹ میں ڈال دی۔ کم سے کم انہوں نے رنم کو اس پروپوزل کی بابت بتا تو دیا تھا۔ باقی کا بعد میں سوچنا تھا۔
رنم کھانے کے بعد زیادہ دیر رکی نہیں جلدی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

اگزام شروع ہونے والے تھے۔ درمیان میں صرف دو دن باقی تھے اور راعنہ کا دل پڑھائی میں کم اور خیالوں میں زیادہ ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی اس کیفیت کو سب ہی نوٹ کر رہے تھے۔ فراز کئی بار ڈانٹ چکا تھا۔ اشعر آیا ہی نہیں تھا۔ رنم الگ بیٹھ کر پڑھ رہی تھی۔ راعنہ کی طرح وہ بھی الجھی ہوئی تھی۔ پاپا نے پروپوزل کی بابت بتا کر اس کی توجہ منقسم کر دی تھی۔ اگر وہ اس کے اگزامز ہونے تک انتظار کر لیتے تو اچھا تھا۔ یہ رنم کی اپنی سوچ تھی۔ وہ جوانی کی حد میں قدم رکھ چکی تھی۔ لڑکوں کے ساتھ اس کی فرینڈ شپ تھی اکٹھے گھومنا پھرنا شاپنگ، پکنک، گمس گیدرنگ سب کچھ ہی تو تھا پر اس نے بھولے سے بھی نہ سوچا تھا کہ شادی بھی ہو گی
"پاپا نے تو ڈسٹرب ہی کر دیا ہے۔" اس نے جھنجلا کر خود سے کہا۔
کومل نوٹ کر رہی تھی کہ اس کا پڑھائی میں دھیان نہیں ہے۔ "کیا ہوا انم۔ تم کچھ اپ سیٹ نظر آ رہی ہو؟" کومل نے اپنائیت سے پوچھا تو راعنہ اور فراز بھی متوجہ ہو گئے۔
"یار میں گھر گئی تھی۔" وہ بولتے بولتے رک گئی۔ جیسے الفاظ جمع کر رہی ہو۔
"ہاں پھر کیا ہوا گھر گئی تھی تو.....؟" فراز نے بے تابی سے پوچھا۔ کومل اور راعنہ نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
کچھ تو تھا فراز کے انداز میں جو خاص تھا۔ "میرے لیے ایک پروپوزل آیا ہے۔ پاپا بتا رہے تھے" اس نے عجیب سے انداز میں کہا تو کومل چیخ ہی پڑی۔
"کیسا پروپوزل؟" فراز نے خاصی ناگواری سے کومل کی طرف دیکھا اس میں چیخنے کی تک نہیں تھی۔ راعنہ نے بھی ناراضی سے کومل کو آنکھیں دکھائیں۔
"ہاں یار پروپوزل۔ پاپا کے کوئی فرینڈ ہیں ان کا بیٹا ہے۔" اس نے رسان سے بتایا تو کومل نے فراز کے چہرے پہ کچھ تلاش کرنا چاہا پر ہمیشہ کی طرح ناکامی ہوئی۔
"پھر تم نے دیکھا کیسا ہے کون ہے کیا کرتا ہے؟" کومل کو عجیب سی کھوج لگی تھی "مجھے کل ہی تو پاپا نے بتایا ہے کیسے دیکھتی نہ مجھے اس کے بارے میں زیادہ علم ہے۔" وہ چڑ سی گئی۔
"او اچھا اچھا ایزی رہو۔" راعنہ نے کومل کو گھورا "تم دیکھ نہیں رہی رنم ڈسٹرب ہے۔"
"او کے میں اب کسی سے کچھ بھی نہیں کہتی" کومل نے منہ پھلا لیا۔
"مجھے اتنا ہی پتا ہے جو پاپا نے بتایا ہے۔ میں نے کوئی سوال اپنی طرف سے نہیں کیا" رنم کومل کی خفگی محسوس کر کے رسان سے گویا ہوئی۔
"کتنا مزا آئے گا نا رنم تمہاری شادی پہ" کومل کا یہ جملہ بیساختہ تھا۔ راعنہ اور فراز مسکرانے لگے۔ یہ طے تھا وہ بدلنے والی نہیں تھی۔
"پھر تم ہاں کرو گی لڑکے والے جب تمہارے گھر آئیں گے؟" کومل کی طرف سے ایک اور احمقانہ سوال آیا۔ جس کا جواب رنم نے عقل مندی اور حاضر دماغی سے دیا۔
"یہاں ساری بات میری مرضی کی ہے۔ زبردستی والا حساب نہیں ہے۔ نہ پاپا مجھے پریشرائز کر سکتے ہیں۔ انہوں نے ساری بات مجھ پہ چھوڑ دی ہے۔ اگر لڑکا اس کے گھر والے مجھے پسند آئے تو بات آگے بڑھے گی ورنہ نہیں۔" اس کے لہجے کا اعتماد قابل دید تھا۔
راعنہ نے رشک سے اس کی سمت دیکھا۔ "کتنی لکی ہو تم رنم۔" فراز اس دوران خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔
کومل اور راعنہ کسی کام سے باہر آ گئیں تو رنم نے کھل کر پروپوزل کے بارے میں اس سے بات کی۔

آخر کو وہ اس کا کلوز فرینڈ تھا۔ اس نے پورے سکون سے رنم کی بات سنی مناسب مشورے سے نوازا تو وہ بالکل ہلکی پھلکی ہو گئی۔ فراز ایسا ہی حساس اور مخلص دوست تھا۔ اس سے شیئر کر لینے کے بعد رنم خود کو ہر بوجھ سے آزاد محسوس کرتی۔

☼ ☼ ☼

روبینہ، وہاب کا مطالبہ سن کر دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھی تھیں۔ وہاب اطمینان سے کرسی پہ بیٹھا پاؤں ہلا رہا تھا۔ روبینہ کو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے سب اس کی سماعت کا دھوکہ ہو جو کچھ دیر قبل اس نے سنا۔

"امی آپ میرا رشتہ لے کر زرینہ خالہ کے گھر جائیں فوراً۔" وہ بالکل عام سے لہجے میں بات کر رہا تھا۔

"تمہیں میں نے اس دن بتایا تو تھا کہ امیر علی خاندان سے باہر رشتہ نہیں دیں گے ساتھ زیان ابھی پڑھ رہی ہے۔" زرینہ سے کی گئی تازہ ترین گفتگو ان کے ذہن میں تازہ تھی وہ بھلا کس برتے پہ اس رشتے کی حمایت کرتیں۔

"انہیں زیان کا رشتہ ہر حال میں مجھے دینا ہو گا۔" وہاب کے انداز میں جارحیت تھی۔

"ان کی بیٹی ہے زیان مرضی ہے ان کی، رشتہ دیں نہ دیں اور وہ تو تمہیں پسند نہیں کرتی۔ آج تک سیدھے منہ اس نے تم سے بات تک تو کی نہیں اور تم شادی کے لیے مرے جا رہے ہو۔ حد ہوتی ہے، اپنی بے عزتی کروانے کی۔" روبینہ نے اس کی سوئی غیرت کو للکارنا چاہا پر اس کا الٹا ہی اثر ہوا۔

"شادی سے پہلے سب لڑکیاں ایسی ہی ادائیں اور نخرے دکھاتی ہیں بعد میں سیٹ ہو جاتی ہیں۔ زیان کو بھی آپ اس حال میں دیکھیں گی کہ میرا گھر سنبھال رہی ہو گی۔ میرے بچے پال رہی ہو گی۔" جوش جذبات میں وہ ضرورت سے زیادہ ہی بول گیا تھا۔

"چھوڑ دے یہ خواب دیکھنا وہاب۔ میری بات مان جاؤ۔"

"امی آپ سے بول رہا ہوں نا۔ آپ زیان کے لیے جائیں گی کہ نہیں ورنہ میں اسے اغوا کر کے زبردستی نکاح پڑھوا لوں گا اگر وہ مجھے نہ ملی تو اسے گولی مار کر خود بھی مر جاؤں گا۔" وہاب کے لہجے میں مذاق کا شائبہ تک نہ تھا۔ روبینہ ماں تھیں اندر تک دہل کر رہ گئیں۔ کچھ بھی تھا وہ اپنے کڑیل جوان بیٹے کو خودکشی کرتے دیکھ نہیں سکتی تھیں۔

زیان ان کے لاڈلے بیٹے وہاب کی محبت تھی۔ وہ بیٹے کی خاطر زرینہ کے آگے جھولی پھیلانے جائیں گی۔ کیا ہوا جو زیان وہاب کو یا ان سب گھر والوں کو منہ نہیں لگاتی۔ وہ وہاب کی خوشی کے لیے یہ بھی برداشت کر لیں گی۔ اس طرح وہاب تو خوش رہے گا نا۔

وہ زرینہ کو بھی سمجھائیں گی پرانی رنجشوں کو بھول جائے آخر کو اتنے سال گزر گئے ہیں۔ کچھ بھی ہو وہ وہاب کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

زرینہ کا چہرہ سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی روبینہ آپا وارد ہوئی تھیں۔ وہ حسب معمول ٹی وی پہ اپنا پسندیدہ ڈرامہ دیکھ رہی تھیں جو ری ٹیلی کاسٹ ہو رہا تھا۔ آپا کے آنے کے بعد ڈرامے میں ان کی ساری دلچسپی ختم ہو گئی تھی بلکہ انہوں نے ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا کر ٹی وی بند ہی کر دیا۔ ان کے کانوں میں تو جیسے سائیں سائیں ہونے لگی تھی ورنہ وہ تو مزے سے ڈرامہ دیکھتے ہوئے کافی کا مگ لیے وقفے وقفے سے سپ کرتے اپنے اردگرد کے ماحول تک سے بے خبر تھیں۔ اب کافی کا آدھے سے زیادہ مگ جوں کا توں پڑا تھا۔

بوا کچن میں مصروف تھیں وہ کھانا بنانے کے ساتھ ساتھ زیان کے لیے سوئیٹ ڈش کے طور پہ دودھ والی سویاں بنانے کی تیاری کر رہی تھیں اسے بے حد پسند تھی۔ زرینہ اور روبینہ دونوں بہنیں کمرا بند کیے بیٹھی

تھیں ہلکی سی آواز تک نہ آرہی تھی۔ روبینہ کی تین ہفتوں میں دوبارہ آمد خالی ازعلت نہیں تھی۔ پہلے بھی آئی تھیں تو بوا نے ان کے چہرے پہ پریشانی کے سائے ناچتے دیکھے تھے اور آج تو ان کا چہرا ایسے ہو رہا تھا جیسے کسی نے خون تک نچوڑ لیا ہو۔

"میں وہاب کی ماں ہوں پہلے اس نے کبھی میرے سامنے ایسی بات نہیں کی مجھے لگتا ہے وہ کہنے سننے کی حد سے باہر ہو گیا ہے۔ تم نے زیان کی شادی کہیں نہ کہیں تو کرنی ہے نا۔ اگر وہاب سے اس کی شادی ہو جائے تو کیا برائی ہے۔" روبینہ نے آخری جملہ بڑے رسان سے کہا پر زرینہ پہ اس کا الٹا اثر ہوا۔

"آپا کم از کم آپ سے مجھے اس بات کی توقع نہیں تھی آپ کو میرا تکلیف بھرا وقت بھول گیا ہے جب امیر علی نے پہلے دن سے ہی میری نفی کی۔ اپنی بیٹی کی نوکرانی سمجھتے رہے مجھے وہ حق اور محبت نہیں دی جس کی میں توقع کر رہی تھی۔ پہلی بیوی کی بے وفائی سے اکتائے ہوئے میرے شوہر نے مجھ پہ بے جا سختیاں کیں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں آپا کہ میں نے کس طرح وہ ٹائم گزارا۔ اب کہیں قسمت مہربان ہوئی ہے مجھ پہ تو۔۔۔ تو میں ہار نہیں مانوں گی۔ زیان نفرت کرتی ہے مجھ سے۔ میرے وجود کو طوہا" کرہا" برداشت کیا ہے اس نے۔ رگ رگ میں زہر ہے اس کی میں کیسے برداشت کروں گی کہ وہ باقی عمر بھی میرے سینے پہ مونگ دلتی رہے۔۔۔ آپا آپ نے بھی خوب کہی ہے وہاب اور زیان کی شادی کی۔" زرینہ سانس لینے کے لیے ذرا رکی۔

روبینہ غور سے اس کی ایک ایک بات سن رہی تھیں حالانکہ سب پرانی بار بار کی دہرائی جانے والی باتیں تھیں کچھ بھی نیا پن نہیں تھا یا کم از کم روبینہ کے لیے وہ نئی بات نہیں تھی۔ کیونکہ زرینہ شروع سے ہی امیر علی کی سختیوں اور زیادتیوں کے قصے خاندان بھر کو سناتی آئی تھیں۔

اب تو سب ہی ان داستانوں کے عادی ہو گئے تھے پر پھر بھی روبینہ پوری دلچسپی سے سن رہی تھیں آخر کو زرینہ ان کی چھوٹی بہن تھی۔

"زیان نے آج تک خود سے کبھی وہاب کو مخاطب تک نہیں کیا ہے۔ سلام بھی ایسے کرتی ہے جیسے لٹھ مار رہی ہو۔ ایسی لڑکی کو ساری عمر آپ بہو کے روپ میں قبول کرلیں گی۔ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے ماں کا کچھ نہ کچھ اثر تو آیا ہو گا بیٹی میں بھی۔ آپ شوق سے اسے بیاہ لے جائیں گی اور شادی کے بعد وہ اپنے عاشق کے ساتھ آپ سب کے منہ پہ کالک مل کے چلی گئی تو۔۔۔ کیا ہو گا اس کا بھی سوچا ہے آپ نے۔ وہاب بہت اونچی ہوا میں اڑ رہا ہے منہ کے بل گرے گا۔ آپ سمجھائیں اسے۔" زرینہ نان اسٹاپ بول رہی تھیں اور روبینہ مستقبل کی تصویر کشی سے بے طرح ڈر گئی تھیں۔

حقیقت میں زیان کی بیگانگی، سرد مہری انہیں بری طرح کھلتی تھی۔ بہن کے منہ سے یہ سب سن کر انہیں دھچکا لگا تھا۔ اوپر سے اکلوتا لاڈلا بیٹا محبت جیسا روگ لگا بیٹھا تھا۔ زیان نے کہیں اور آنکھیں لڑا رکھی ہوں گی اور وہاب پاگل ہو رہا تھا اس کے حصول کے لیے۔ کسی نہ کسی طرح شادی ہو بھی جاتی ہے وہاب اور زیان کی اور کچھ عرصہ بعد وہ وہاب کو قتل کر کے اپنے عاشق کے ساتھ فرار ہو جائے تو پھر کیا ہو گا۔۔۔!" اس سوال کے جواب نے انہیں لرزا کے رکھ دیا۔

"آپا آپ پریشان مت ہوں۔ میں اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکال لوں گی۔" زرینہ نے محبت و ہمدردی سے بہن کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ "تم کیا حل نکالو گی؟" وہ ڈوبتی امیدوں کے سرے پھر سے تھامے ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

"میں زیان سے بات کرتی ہوں اس کے دل کا حال معلوم کرنے کی کوشش کروں گی اس نے کسی کا نام لیا تو کہوں گی جلدی اسے گھر لا کر ہم گھر والوں سے ملوائے۔ مان گئی تو جلدی دفعان کر دوں گی۔ آپ کے سر سے جلدی یہ تلوار ہٹ جائے گی۔"

"تم جو بھی کوشش کرنا وہاب کو اس کی بھنک بھی نہ پڑے ورنہ اچھا نہ ہو گا وہ بپھرا ہوا ہے۔"

"آپا میں جو بھی کروں گی پوری رازداری سے کروں گی۔ زیان رخصت ہو کر اپنے گھر چلی جائے گی تو وہاب کو یہ خبر ملے گی۔" زرینہ کے لبوں پہ پر اسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ روبینہ کے سر سے جیسے منوں بوجھ سرکا۔ آتے ہوئے وہ بہت پریشان تھیں مگر اب جاتے ہوئے ہلکی پھلکی تھیں۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے ان کا ٹکراؤ زیان سے ہوا جو کالج سے ابھی ابھی آئی تھی۔ سفید یونیفارم اور سفید ہی دوپٹے میں ملبوس زیان اپنی گلابی رنگت سمیت بے پناہ دلفریب لگ رہی تھی۔ کالج کا عام سا سفید یونیفارم اس پہ بے پناہ جچ رہا تھا۔ روبینہ تیکھی نگاہوں سے اسے گھورتی آگے گیٹ پار کر گئیں۔ انہوں نے ایک لفظ تک نہ بولا تھا۔

آج سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے اسے مخاطب نہ کیا ہو یا خیریت معلوم نہ کی ہو۔ کیسے اسے گھورتی ہوئی گئی تھیں۔ ان نگاہوں نے زیان کو بیچ میں ڈسٹرب کیا تھا۔

تب ہی گھر میں داخلے ہوتے ہی اس نے بوا کو یہ بات جتانی ضروری سمجھی۔ انہوں نے زیان کی بے پناہ حساس فطرت کی وجہ سے اس کے سامنے خاص اہمیت نہیں دی "ارے وہ اپنی کسی پریشانی میں ہوگی اس لیے تمہیں زیادہ محسوس ہو رہا ہے۔ تم فوراً کپڑے بدل کر آؤ میں نے تمہارے لیے دودھ والی سویاں خاص طور پہ بنائی ہیں۔" بوا نے نہایت خوب صورتی سے وقتی طور پہ زیان کے ذہن کو اس طرف سے موڑ دیا تھا۔ وہ سر ہلاتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ بوا اس کے جانے کے بعد دل ہی دل میں سوچ رہی تھیں جانے روبینہ نے ایسا کیوں کیا ہے۔ زیان کے ساتھ وہ ہمیشہ اچھے طریقے سے ملتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

تاحد نظر پھیلے باغ میں مالٹوں اور لیموؤں کی کھٹاس بھری مہک پھیلی ہوئی تھی۔ خوشگوار دھوپ کے ساتھ یہ مہک بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ ملک ایبک فصل کا جائزہ لینے آیا تھا۔ اگلے چند روز میں اسے شہر واپس جانا تھا۔ اس بار کچھ زیادہ دن اسے گاؤں میں رکنا پڑ گیا تھا کیونکہ بابا جان پہ اچانک ہی اس کی شادی کرنے کی دھن چڑھی تھی۔ پھر وہ کافی کمزور اور بیمار بھی تھے ایبک نے ضد کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ حالانکہ اس کی پلاننگ میں ابھی شادی شامل نہیں تھی۔

ابھی ملک جہانگیر زمینوں پہ اس کے ساتھ جانے کی ضد کر رہے تھے مگر ان کی طبیعت کی خرابی کے پیش نظر ملک ایبک انہیں ساتھ نہیں لایا تھا۔ ویسے بھی زمینوں جائیدادوں کا انتظام و انصرام ملک ایبک اور ملک ارسلان کے سپرد تھا۔

ایبک گاؤں آتا تو اپنی غیر موجودگی میں ہونے والے کاموں کا جائزہ لیتا۔ بڑے بکھیڑے تھے ایک ایک کام خود دیکھنا پڑتا۔ فیصلے کرنے کی طاقت اور اس پہ ڈٹے رہنے کی خوبی ملک ایبک میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ اسی وجہ سے ملک جہانگیر اور ملک ارسلان دونوں اسے بہت پسند کرتے تھے۔ اس کی رائے اور مشورے کو اولیت دی جاتی۔

ملک ایبک کو باغ کی طرف آگے کا رخ کرتا دیکھ کر رکھوالے بھاگے بھاگے آئے۔ محبت و احترام سے اسے سلام کیا۔ جواب میں ایبک نے بھی ان کی خیریت دریافت کی۔ یہ گاؤں کی کمی کمین کم حیثیت لوگ جنہیں چوہدری، ملک اور صاحب حیثیت زمیندار کسی گنتی میں نہ لاتے تھے ایبک ان کے ساتھ بڑے آرام سے بات کرتا اسی وجہ سے وہ ان سب میں ہر دلعزیز تھا۔ اس کی پیٹھ پیچھے بھی اسے اچھے الفاظ میں یاد کیا جاتا۔ یہ عام سے بے حیثیت و بے قدر لوگ اسے دعائیں دیتے نہ تھکتے۔

درختوں سے فصل اتاری جا رہی تھی نیچے زمین پہ مالٹوں کا ڈھیر جمع تھا۔ ایبک کے لیے فوراً" ہی ایک کرسی اور پلاسٹک کی میز کا اہتمام کیا گیا اس کے بیٹھنے کی دیر تھی پلیٹ میں مالٹے سجا کر رکھ دیے گئے۔

ایبک ناشتا کر کے زمینوں کی طرف نکلا تھا۔ تاہم بھی اتنا زیادہ نہیں ہوا تھا کہ اسے بھوک ستاتی پھر بھی اس نے مزارعوں کا دل رکھنے کو دو تین پھانک

کھائیں۔ وہ اسی میں خوش تھے۔ اس باغ کی دیکھ بھال الیاس اور اکرم کے سپرد تھی۔ ایک طرح سے وہ باغ کے کرتا دھرتا تھے۔ وہ ملک ایبک کو فصل کے بارے میں بتا رہے تھے۔ ذائقہ وہ چکھ چکا تھا فصل اس کے سامنے تھی جو کافی زیادہ تھی۔ یہ سب اوپر والے کی مہربانی اور زمین پہ کام کرنے والے مزارعوں کی محنت تھی۔ اردگرد کے تمام زمینداروں کی نسبت ان کی زمین سب سے زرخیز تھی اسی حساب سے غلہ اور دیگر اجناس کی حاصل پیداوار بھی زیادہ تھی۔

ایبک دل ہی دل میں اس بار کی فصل سے حاصل ہونے والی آمدنی کا اندازہ لگا رہا تھا۔ اس بار اس کا ارادہ تھا کہ تمام مزارعوں کو طے شدہ اجرت سے زیادہ دے گا کیونکہ زائد فصل سے حاصل ہونے والی آمدنی میں ان سب کا بھی تو حصہ بنتا تھا۔ وہ اس معاملے میں بلاوجہ ڈنڈی مارنے کا قائل نہیں تھا۔

ملک ایبک 'الیاس اور اکرم کے ساتھ فصل کے بارے میں ہی گفتگو کرتا رہا۔ واپسی پہ بعد اصرار الیاس اسے اپنے گھر لے گیا۔ گھر کیا تھا باغ کے اختتام پہ دو کمروں کا بنا مکان تھا جس کی چار دیواری کچی اینٹوں سے تعمیر کی گئی تھی۔ ایبک نے وہاں اس کی بیوی کے بنے ہاتھ کی چائے پی اور سوجی کے لڈو کھائے۔ الیاس بہت خوش تھا کہ ملک ایبک نے اس کے گھر سے چائے پی ہے۔ وہ تو کھانے کے لیے بھی بار بار کہہ رہا تھا پر اپنی وجہ سے ایبک اسے مشکل میں نہیں ڈالنا چاہ رہا تھا اس لیے سلیقے سے معذرت کرکے واپسی کے لیے چل پڑا۔

☼ ☼ ☼

زیان بستر کی چادر جھاڑ کر ٹھیک کر رہی تھی جب بیڈ روم کے دروازے پہ نامانوس سی دستک ہوئی۔ وہ کچھ سوچتی ہوئی دروازے کی طرف آئی اور کھول دیا۔ باہر حیرت انگیز طور پہ زرینہ آنٹی کھڑی تھیں۔ اس کی حیرت سے محظوظ ہوتے ہوئے وہ اس پہ ایک نظر ڈال کر کمرے میں اندر آکر اس کے بیڈ پہ بیٹھ گئیں۔

"کیا ہو رہا تھا؟" انہوں نے بہت اپنائیت سے پوچھتے ہوئے حیرت کا ایک اور بم اس کے حواسوں پہ گرایا جبکہ وہ ابھی پہلے سے بھی نہیں سنبھلی تھی۔ زرینہ آنٹی شاذو نادر ہی اس کے کمرے میں آئی تھیں اتنی اپنائیت سے مخاطب کرنا۔ سوچنا بھی محال تھا۔

"بس سونے کی تیاری کر رہی تھی" حیرت کے پے در پے لگنے والے جھٹکے سے سنبھل کر زیان بمشکل تمام جواب دینے کے قابل ہوئی۔ "آج کل تم اپنے بیڈ روم سے باہر ہی نہیں نکلتیں' اس لیے میں خود ہی تمہارے پاس آگئی ہوں۔" وہ اسے قریبی سہیلی کی طرح بات کر رہی تھیں۔

"بس ایسے ہی" وہ اتنا ہی کہہ سکی۔ زرینہ اس کی حیرت کو خوب اچھی طرح سمجھ رہی تھیں' پر لمبی تمہید میں وقت ضائع کرنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھیں۔ اس لیے بہت جلد اصل بات کی طرف آگئیں۔

"میں تمہارے پاس بہت ضروری بات کرنے آئی ہوں۔" انہوں نے بات کا آغاز کیا۔ زیان سانس روکے جیسے ان کی طرف متوجہ تھی۔ "کہنے کو تو میں ہمیشہ سوتیلی ماں ہی رہوں گی مگر تمہاری بہتری کا فیصلہ سگی ماں کی طرح کروں گی۔" زیان نے نگاہیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ یقیناً" وہ ایک بہترین اداکارہ تھیں۔

"تم اس وقت مجھے اپنی ماں' دوست' ہمدرد کچھ بھی کہہ سکتی ہو۔ تمہارے ابو تمہاری شادی کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے تمہارا عندیہ معلوم کرنے بھیجا ہے۔ اگر تم کسی کو پسند کرتی ہو تو بتا دو۔ ہم مناسب طریقے سے تمہاری اس کے ساتھ شادی کر دیں گے۔" اف اس کی سماعتوں کے قریب جیسے کوئی بم پھٹا۔ اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ ابو اس کے بارے میں کیسے سوچ سکتے ہیں کہ وہ کسی کو پسند کرتی ہے یا اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔

"تم پریشان مت ہو اس کا نام بتاؤ۔ تمہارے ابو کو راضی کرنا میرا کام ہے۔" زرینہ اس کے چہرے پہ تذبذب کے آثار دیکھ کر جھٹ بولیں۔

"میں کسی کو بھی پسند نہیں کرتی نہ کسی سے شادی

کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے شرم و خجالت کے ملے جلے تاثرات سمیت کہا۔ زرینہ کے چہرے پہ اطمینان سا ابھر آیا گویا ان کا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا۔

"تمہارے ابو رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں' ملنے جلنے والوں کو کہہ رکھا ہے جیسے ہی اچھا گھرانہ نظر میں آیا تمہیں رخصت کردیں گے۔" زرینہ مزے سے بول رہی تھیں۔

"مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔" وہ چیخ کر بولی۔

"تو کیا کروگی۔ اپنی ماں کی طرح خاندان کی عزت اچھالوگی۔" زرینہ بیگم سے زیادہ دیر اداکاری نہیں ہو پا رہی تھی اس لیے بہت جلد مصنوعی چولے سے باہر آئیں۔ ذیان کے دل میں جیسے ایک تیر ترازو ہو گیا۔

"اپنی ماں کی طرح عاشقوں کی لائن لگاؤ گی مبارک ہو۔ وہاب کی صورت میں تمہیں جان لٹانے والا پاگل مل گیا ہے۔" زرینہ کا لہجہ زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

"میری طرف سے بھاڑ میں جائے وہاب۔ میں اس کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی۔" ذیان بھی زیادہ دیر اپنی نفرت چھپا نہ پائی۔

"تم اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہ رہی پر وہ تمہیں پانے کے لیے پاگل ہو رہا ہے۔ اس کی ماں آئی تھیں میری پاس۔ وہاب تمہیں پانے کے لیے ہر جائز' ناجائز حربہ استعمال کرے گا۔"

"مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔" وہ جیسے پھٹ سی پڑی۔ "مجھے پتا ہے تم اسے پسند نہیں کرتیں مگر وہ صرف تم سے ہی شادی کرنا چاہتا ہے۔ میرے یا تمہارے انکار کی اس کے سامنے کوئی اہمیت نہیں ہے۔ انکار کی صورت میں وہ تمہیں زبردستی اٹھوا کر نکاح پڑھا سکتا ہے۔ مجھ پہ یقین نہ آئے تو روبینہ آپا سے پوچھ لو ابھی کال ملا کر دیتی ہوں۔ وہ خود اس وجہ سے بے پناہ پریشان ہیں۔ میرے پاس مدد مانگنے آئی تھیں کہ کسی طرح وہاب کو اس کے اس ارادے سے باز رکھا جا سکے۔"

"میں مر کر بھی وہاب سے شادی نہیں کرنا چاہتی" آنسو ذیان کی آنکھوں سے باہر مچلنا چاہ رہے تھے اس نے بمشکل انہیں پلکوں کی باڑ سے پرے سمیٹ رکھا تھا۔

"مجھے پتا ہے تمہیں وہاب ناپسند ہے۔ اس لیے میں نے روبینہ آپا کو صاف انکار کہلوا دیا ہے۔ تبھی وہاب جنونی ہو رہا ہے۔" زرینہ آنٹی ایک کے بعد ایک روح و فرسا خبر سنا رہی تھیں۔

"مجھے نہ وہاب سے نہ کسی اور سے شادی کرنی ہے۔" اس کی آنکھیں غصے کی شدت سے لال ہو رہی تھیں۔

"میری چندا' وہاب کے ہاتھوں بے آبرو ہونے سے بچنے کے لیے تمہیں کسی نہ کسی سے شادی کرنی ہی ہو گی۔" زرینہ آنٹی نے ایک بار پھر اسے حقیقت کا آئینہ دکھانے کی کوشش کی۔ ذیان بالکل خاموش تھی۔ اس کی نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پہ جمی تھیں۔ "تم اچھی طرح سوچ لو۔ میں تمہارے لیے اچھے خاندان میں رشتہ ڈھونڈوں گی آخر کو تم میری سوتیلی بیٹی ہو۔" اس بار زرینہ کا لہجہ مصنوعی نہیں تھا۔ شاید ذیان کی اس بے بسی و کسمپرسی پہ اسے ترس آ گیا تھا۔ وہ اسے ترس آمیز نگاہوں سے دیکھتی چلی گئی تھیں۔

بہت دیر بعد اٹھ کر ذیان نے دروازہ بند کیا۔ اس نے کمرے کی سب لائٹس آف کر دیں کمرے میں رکھے ساؤنڈ سسٹم سے قدرے دھیمی آواز میں زرینہ بیگم کے آنے سے پہلے میوزک لگا تھا۔ ان کے آنے اور جانے کے بعد بھی وہ یکساں رفتار سے چل رہا تھا۔ اسے انسانی احساسات و جذبات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

رعلی عظمت کا آنسو۔ ذیان کے دل کے کئی پرانے درد جگا گیا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑی سب پردے سرکائے باہر اندھیرے میں دیکھتی بے آواز آنسوؤں سے رو رہی تھی۔ ساری عمر اس نے اپنی ماں کے حوالے سے طعنے الزام تراشیاں برداشت کی تھیں۔ اس ماں کے حوالے سے۔ جس کا نام لینا بھی امیر علی کے گھر میں جرم تھا۔ اپنی ماں کی شکل تک اسے یاد نہیں تھی۔

نہ ماں کی ممتا اور گود کے حوالے سے اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں کچھ محفوظ تھا۔ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی وہ "ماں" جیسے وجود سے ناآشنا تھی۔ ہاں اس کے حوالے سے دیے جانے والے طعنے تو جیسے جنم جنم سے اس کے ساتھی تھے۔ بچپن میں اس کا بہت دل چاہتا کہ وہ ماں کے پاس رہے وہ اس کے لاڈ اسی طرح اٹھائے جیسے زرینہ آنٹی اپنے بچوں کے اٹھاتی ہیں۔ پر یہ صرف اس کا خواب ہی رہا۔ امیر علی نے اسے شروع سے ہی اچھی طرح باور کرا دیا تھا کہ اپنی ماں کا نام بھول کر بھی مت لینا نہ یاد کرنا۔ ہاں زرینہ آنٹی وقت بے وقت اس کی ماں کو گالیوں، طعنوں اور الزام تراشیوں سمیت یاد کرتیں تب امیر علی انہیں کچھ نہ کہتے بلکہ خود بھی حسب توفیق گالیوں میں حصہ ڈالتے۔ زیان کے چھوٹے سے دل پہ قیامت گزر جاتی۔

اس نے شروع سے ہی ماں کے حوالے سے اتنا کچھ سنا تھا کہ اب اسے لفظ ماں سے ہی خوف آنے لگا تھا۔ امیر علی جب غصے میں ہوتے تو اسے وارننگ دیتے کہ اپنی ماں جیسی مت بننا کیا اس کی ماں اتنی بری اور قابل نفرت تھی؟ کم سے کم زرینہ آنٹی اور ابو نے اسے یہی باور کرایا تھا۔ ہاں اس کی ماں سچ مچ بری تھی، اچھی ہوتی تو اسے ساتھ لے جاتی نا۔ اگر امیر علی نے زبردستی زیان کو ماں سے الگ کر دیا تھا تو وہ اسے عدالت کے ذریعے حاصل کر لیتی نا۔ پر نہیں وہ اس کی ماں کب تھی۔ وہ تو خود غرض تھی جو اسے چھوڑ کر اپنی نئی دنیا بسانے چل پڑی تھی۔

اس کی دنیا میں ننھی زیان کے لیے جگہ نہیں تھی اور زرینہ کی دنیا میں بھی تو زیان کے لیے جگہ نہیں تھی۔

اس کا پورا چہرا آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔

تنہا تنہا جیون کے
کیسے دن گزاریں
سن لو سن سکو تو ہم کو آنسو پکاریں
چلتے چلتے سوچیں کیوں بے دوری
جائیں گے کہاں
خواہش تو نہ ہوگی پوری جائیں گے کہاں
جائیں گے کہاں جائیں گے کہاں
سن لو سن سکو تو ہم کو آنسو پکاریں
ساتھ دل کے چلے دل کو نہیں روکا ہم نے
جو نہ اپنا تھا اسے ٹوٹ کے چاہا ہم نے
اک دھوکے میں کٹی عمر ساری ہماری
کیا بتائیں کیسے پایا کیسے کھویا ہم نے
دھیرے دھیرے دھیرے کوئی چاہت باقی نہ رہی
جینے کی کوئی بھی صورت باقی نہ رہی
سن لو سن سکو تو ہم کو آنسو پکاریں
ٹوٹے ٹوٹے جو ہیں میرے سپنے آنسو ہی تو ہیں
زندگی کا حاصل اپنے آنسو ہی تو ہیں

☼ ☼ ☼

وہ بے دلی سے چھوٹے چھوٹے لقمے توڑ کے کھانا کھا رہی تھی۔ بوا دو دن سے اس کی غیر معمولی خاموشی نوٹ کر رہی تھیں۔ حالانکہ وہ پہلے بھی اتنا زیادہ بولتی نہیں تھی پر ایسی گم صم بھی تو نہیں تھی جیسے اب تھی ڈری سہمی اپنے ہی خیالوں میں گم۔ بوا کو زیان اور زرینہ بیگم کے مابین ہونے والی گفتگو کا علم نہیں تھا ورنہ وہ ضروریات کی تہ تک پہنچ جاتیں۔

"زیان کیا بات ہے دو دن سے بہت چپ چپ ہو۔ کوئی پریشانی ہے تو بتاؤ۔" بوا سے رہا نہیں گیا تو پوچھ ہی بیٹھیں۔

"مجھے یہ بتائیں کہ میری ماں کو مجھ سے پیار تھا کہ نہیں؟" زیان کا لہجہ بہت سرد تھا پر بوا تو مارے خوف کے سن ہو گئیں۔ انہوں نے فوراً" ادھر ادھر دیکھا کہ کسی نے زیان کا وہ سوال سنا تو نہیں۔

"زیان بٹی اس وقت یہ خیال کہاں سے تمہارے ذہن میں آ گیا ہے۔" وہ ابھی بھی خوف کے زیر اثر بہت آہستہ آواز میں بول رہی تھیں۔ جواباً" زیان عجیب سے انداز میں ہنس پڑی۔ عجیب دیوانوں والی مسکراہٹ تھی۔

"مجھے پتا ہے آپ بھی اس بارے میں بات کرتے

ہوئے ڈرتی ہیں اس لیے کبھی بھی نہیں بولیں گی آپ؟" وہ کتنی جلدی حقیقت کی تہ تک پہنچ گئی تھی۔ بوا نے اس سے نظر چرالی۔ ذیان کے چہرے کی حسرت و کرب اور دکھ کا سامنا کرنا اتنا آسان کہاں تھا ان کے لیے۔

"بوا جن بیٹیوں کی مائیں انہیں ایسے لاوارث چھوڑ کر چلی جاتی ہیں نا وہ بیٹیاں پھر لوٹ کا مال بن جاتی ہیں۔ جس کا داؤ لگتا ہے جیب میں ڈال کر چلتا بنتا ہے۔"

"اللہ نہ کرے میری بچی۔۔۔ ہم سب ہیں نا تم کوئی لاوارث نہیں ہو۔" بوا کے دل کو دکھ نے جکڑا۔ انہوں نے بے اختیار لپک کر ذیان کو سینے سے لگالیا۔ "مجھے جھوٹی تسلیوں سے نہ بہلائیں۔ ابو تو خود فالج کے مریض ہیں میری کہاں حفاظت کرسکتے ہیں۔" وہ ان کی آغوش سے نکل کر دور جا کھڑی ہوئی۔ بوا کے جھریوں بھرے چہرے پہ فکرو تفکر کا جال بچھا ہوا تھا۔ نہ جانے ذیان آج ایسی تلخ تلخ باتیں کیوں کر رہی تھی۔ گہری گہری پراسرار باتیں۔ مبہم اور الجھی ہوئی بوا کو الجھی ڈور کا سرا سلجھانے سے ڈر لگ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں نے رشتے کرانے والی ایک عورت بیگم اختر سے ذیان کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ ڈھونڈنے کے لیے کہا تھا۔ کل وہ اسی سلسلے میں آئی تھی میرے پاس۔" زرینہ کمبل اچھی طرح اوڑھانے کے بعد امیر علی کے پاس بیٹھ گئی تھیں وہ انہیں اپنی کارگزاری بتانے کے لیے بہت بے چین تھیں پر انہوں نے تو خاص توجہ ہی نہیں دی بس خاموش رہے۔ زرینہ کو بے طرح غصہ آیا۔ "آپ کچھ بولیں تو سہی۔"

"میں کیا بولوں بھلا؟" امیر علی کے الفاظ میں بے چارگی نمایاں تھی۔

"جو رشتہ بیگم اختر نے بتایا ہے اب وہ ذیان کو دیکھنے کے لیے ہمارے گھر آنا چاہ رہے ہیں۔"

"ہاں تو آئیں بے شک میں نے کب منع کیا ہے۔" وہ عام سے بے تاثر لہجہ میں بولے۔ زرینہ نے توجہ نہیں دی ان کے لیے یہی بہت تھا کہ امیر علی کو لڑکے والوں کے اپنے گھر آنے پہ اعتراض نہیں تھا۔

"آپ اسی ہفتے میں کوئی دن بتادیں تاکہ میں بیگم اختر کو بتاؤں پھر وہ لڑکے والوں کو لے کر ہمارے گھر آجائیں گی۔" وہ پھر سے پرجوش ہو رہی تھیں۔

"تم خود ہی بتادو ان کو جو دن اور ٹائم مناسب لگتا ہے۔" امیر علی نے ساری ذمہ داری ان کے سر ڈال دی۔ زرینہ کی آنکھیں مارے خوشی کے چمک اٹھیں۔ اب ذیان کو اس گھر سے دفعان ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ انہیں صرف بیگم اختر کو مطلع کرنا تھا۔ بیگم اختر نے تو لڑکے اور اس کے خاندان کی بہت تعریفیں کی تھیں۔

روبینہ بیگم کا سیل فون مسلسل بج رہا تھا۔ وہ باہر لان میں تھیں۔ وہاب ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہا تھا روبینہ کا سیل فون وہیں ٹی وی کے پاس رکھا تھا۔ مسلسل بجتے فون کو اس نے ناگواری سے دیکھا اور بادل ناخواستہ ہاتھ بڑھا کر اٹھالیا' وہ فون بند کرنا چاہ رہا تھا پر زرینہ خالہ کی کال دیکھ کر ارادہ ملتوی کردیا اور فون آن کرکے کان سے لگالیا۔ "آپا آپ کہاں ہیں فون کیوں نہیں اٹھا رہی ہیں؟ آپ کو ایک بات بتانی تھی۔" دوسری طرف زرینہ وہاب کے ہیلو کہنے سے پہلے ہی شروع ہوگئی تھیں ان کے لہجے میں ہیجان صاف محسوس کیا جاسکتا تھا۔

"خالہ امی باہر لان میں ہیں ایک منٹ ہولڈ کریں آپ کی بات کرواتا ہوں۔" وہاب کی آواز کان میں پڑتے ہی زرینہ فوراً" سنبھل گئیں اور باقی بات زبان تلے روک لی۔ شکر تھا انہوں نے کچھ اور نہیں بول دیا تھا۔

وہاب نے فون روبینہ کے حوالے کیا اور خود دروازے کے پاس ٹھہر گیا۔ زرینہ خالہ کے لہجے میں اتنا جوش اور خوشی تھی کہ وہ سبب جاننے کے لیے وہیں رک سا گیا۔ پر روبینہ تو بہت آہستہ آواز میں بات کر رہی تھیں۔ انہوں نے دروازے کے پاس موجود وہاب کی جھلک دیکھ لی تھی۔ اس لیے ادھر ادھر کی چند

باتیں کرنے کے بعد فوراً ہی رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ وہاب کے جانے کے بعد انہوں نے بہن سے تفصیلی بات کرنی تھی۔ انہوں نے خبر ہی ایسی دی تھی کہ زیان کو دیکھنے کے لیے ایک فیملی آ رہی ہے۔ وہاب آفس کے لیے نکلے تو آپ بھی آجائیں۔

وہاب رات دوستوں کے ساتھ باہر نکلا تو تب روبینہ نے بہن کو دوبارہ کال کی۔ انہیں کھد بد سی لگی ہوئی تھی۔ اس وقت وہاب گھر تھا وہ کچھ بھی پوچھ نہ پائی تھیں۔ اب کرید کرید کر ایک ایک بات پوچھ رہی تھیں۔

"آپا، بیگم اختر بتا رہی تھی کہ لڑکے والوں کو شادی کی جلدی ہے وہ ایک ماہ کے اندر اندر بیٹے کی شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔ پھر آپ کی، میری سب کی جان زیان نامی سونامی سے چھوٹ جائے گی۔" زرینہ تنفر سے بتا رہی تھی۔

"دعا کرو کہ وہاب شور نہ مچائے۔" روبینہ متفکر تھیں۔

"آپا آپ وہاب کو کچھ دن کے لیے لاہور بھجوا دیں نا۔" زرینہ نے جھٹ مشورہ دیا جو ان کے دل کو لگا۔

"ہاں اگلے مہینے ارشاد بھائی کے بیٹے کی شادی بھی تو ہے۔" انہوں نے اپنے دیور کا نام لیا۔

"پھر تو آپ سب کو جانا ہوگا۔" زرینہ بولیں۔

"ہاں اور وہ تمہیں بھی کارڈ بھجوائیں گے۔" روبینہ نے یاد دلایا۔ "میں تو نہیں جاسکوں گی۔ امیر علی کی حالت آپ کے سامنے ہے۔" زرینہ کا عذر سچا تھا۔ "میری کوشش ہے کہ زیان کی شادی جتنا جلدی ممکن ہو، ہو جائے۔"

"ہاں اللہ کرے ایسا ہو جائے۔" روبینہ نے صدق دل سے کہا۔ "آپ کوشش کرنا وہاب کو زیان کے رشتے یا کسی اور بات کی ہوا تک نہ لگے۔" زرینہ نے فون بند کرنے سے قبل ایک بار پھر یاد دہانی کرائی تو روبینہ "ہونہہ" کہہ کر رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

زرینہ جوش و خروش سے پورے گھر کی تفصیلی صفائیاں کروا رہی تھیں۔ وقت کم تھا کل لڑکے والے زیان کو دیکھنے آ رہے تھے۔ ثمینہ نے سب کمروں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے دھو کر پھر سے لٹکا دیے تھے۔ مالی نے سب پودوں کی از سر نو گوڈی کی اور گھاس پھونس صاف کی۔ گملے دھلنے کے بعد چمک رہے تھے پورے لان اور گھر کی حالت نکھر آئی تھی۔ مہمانوں کے استقبال کے لیے سب تیار تھے۔

زرینہ پورے گھر میں زیان کو تلاش کر رہی تھیں۔ نیچے وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ اوپر ٹیرس پہ تھی۔ زرینہ کے گھٹنوں میں تکلیف تھی۔ سردی میں یہ تکلیف اور بھی بڑھ جاتی تھی اس لیے انہوں نے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ بوا اندر کچن میں رات کے کھانے کے لیے مٹر چھیل رہی تھیں انہیں زیان کے لیے مٹر پلاؤ بنانا تھا۔ زرینہ ان کے پاس چلی آئی۔ بوا نے انہیں دیکھ کر مٹر چھیلنے بند کر دیے کیونکہ زرینہ بیگم کا چہرہ بتا رہا تھا وہ ان سے کوئی بات کرنے آئی ہیں اور کچھ ہی دیر میں اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔

"بوا زیان کہاں ہے؟"

"اوپر گئی تھی ابھی میرے سامنے۔"

"آپ کو پتا تو ہے کل ایک فیملی زیان کو دیکھنے آ رہی ہے۔" زرینہ نے بات کی تمہید باندھی "جی چھوٹی دولہن آپ نے بتایا تھا کل مجھے۔" تابعداری سے سر ہلاتے بولیں۔

"آپ زیان کو بھی بتا دینا۔ کل کالج سے چھٹی کر لے اور ذرا اچھے کپڑے پہن کر تیار ہو۔"

"چھوٹی دولہن میں اسے بول دوں گی پر کالج سے چھٹی نہیں کرے گی وہ۔" بوا دبے دبے لہجے میں بولیں تو زرینہ بیگم کے ماتھے پہ بل پڑ گئے۔

"کیوں چھٹی نہیں کرے گی۔ میں نے لڑکے والوں کو ٹائم دیا ہوا ہے بارہ بجے کا جبکہ مہارانی زیان دو بجے کالج سے گھر آتی ہے۔" زرینہ کا پارہ ہائی ہونے لگ گیا تھا۔

"وہ کہہ رہی تھیں اس کے کالج میں کوئی ڈرامہ

ہونے والا ہے۔ وہ ادھر ہی مصروف ہے۔ اگر لڑکے والے بارہ بجے بھی آئے تو چائے پانی ناشتے باتوں میں تین چار گھنٹے لگ ہی جائیں گے۔ ذیان بھی دو بجے تک گھر آجائے گی۔" بوا رسان سے سمجھانے والے انداز میں بات کررہی تھیں۔ زرینہ کا غصہ تھوڑا کم ہوگیا تھا پر بالکل ختم نہیں ہوا تھا۔ بوا سے بات کرنے کے بعد ان کی ذمہ داری قدرے کم ہوگئی تھی ویسے بھی ذیان کو بوا ہی سنبھال سکتی تھیں۔

گھر میں غیر معمولی چہل پہل تھی مہمان اپنے ٹائم تشریف لا چکے تھے۔ ڈرائنگ روم میں سب موجود تھے سوائے امیر علی کے۔ اونچی آواز میں گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ ذیان کالج سے لوٹی تو اونچی آوازوں نے اس کا استقبال کیا اس کی حس سماعت خاصی تیز تھی پر جو مہمان آئے تھے وہ غالباً" دوسروں کو بہرا تصور کررہے تھے۔ اونچے اونچے قہقہے اور اسی حساب سے آواز کا والیوم بھی گونجیلا تھا۔ ذیان نے بیگ جاکر ٹیبل پہ رکھا اور حسب معمول بوا کی طرح چلی آئی جو ثمینہ کے ساتھ مل کر کھانے کے انتظامات میں مصروف تھیں۔

کھانا پکنے کے آخری مراحل میں تھا بس سرو کرنا تھا۔ رابیل' آفاق اور منال تینوں میں سے ایک بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"بوا سب کہاں ہیں؟" ذیان نے بے دھیانی میں پوچھا ایک ثانیے کے لیے وہ جیسے مہمان اور ان کی آمد کا مقصد ہی فراموش کرگئی تھی۔ "بیٹا سب ڈرائنگ روم میں ہیں۔ تم جاؤ کپڑے تبدیل کرلو۔ ثمینہ نے تمہارا گلابی سوٹ پریس کرکے بیڈ پہ رکھا ہے ساتھ سینڈلز بھی ہیں۔" بوا نے لجاجت سے کہا۔

"کیوں کپڑے تبدیل کروں میں۔" وہ غصے میں پاؤں پٹخ کے بولی۔ "ابو کہاں ہیں؟" اس نے اگلا سوال کیا حالانکہ اس سوال کا جواب اسے معلوم تھا۔

"امیر میاں اپنے کمرے میں ہیں اور کہاں جانا ہے انہوں نے۔ اللہ کسی کو محتاجی اور معذوری نہ دے۔ امیر میاں کو دیکھ کر دل کٹتا ہے۔ کیسے ہر کام جلدی جلدی کرتے تھے۔ ساری ذمہ داری اپنے سر لی تھی اور

اب خود اوروں کے محتاج ہو کر بستر پہ پڑ گئے ہیں۔" بوا کے لہجے میں دکھ پنہاں تھا۔ ثانیے چپ چاپ ان کا چہرہ تکنے لگی۔

"بیٹا کپڑے بدل کر مہمانوں سے مل لو۔" بوا نے ایک بار پھر منت آمیز انداز میں کہا تو وہ ان کی طرف دیکھے بغیر کچن سے نکل گئی۔ ثمینہ اس دوران بالکل خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی۔ بوا دل ہی دل میں آنے والے متوقع حالات کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ زیان شاید آنے والے مہمانوں کے بارے میں سنجیدہ نہیں تھی ورنہ شور مچاتی احتجاج کرتی۔ کیونکہ بوا اس کے مزاج کی تلخی، کڑواہٹ اور درشتی سے اچھی طرح واقف تھیں۔ اس کی ناپسند سے آگاہ بھی تھیں تب ہی تو ڈر رہی تھیں۔ پر اس کا اندازہ شاید زرینہ بیگم کو نہیں تھا تب ہی تو خوشی خوشی مہمانوں سے باتیں کر رہی تھیں۔

زیان نے جب تک کپڑے تبدیل کیے تب تک مہمانوں کے لیے کھانا لگا دیا گیا تھا۔ اس نے سوچا پہلے اپنی پیٹ پوجا تو کرلی جائے بعد میں مہمانوں سے بھی وہ دو ہاتھ کر لیے جائیں گے۔ بھوک کی وہ ویسے بھی کچی تھی۔ وہ کپڑے تبدیل کر دوبارہ بوا کی طرف آئی تو وہ اسے دیکھتی رہ گئیں۔ گلابی جوڑے میں وہ بے پناہ خوب صورت لگ رہی تھی بال برش کرکے اس نے دوبارہ سنوارے تھے آنکھوں میں کاجل بھی اہتمام سے موجود تھا۔ اس نے وہیں کچن میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ زیان کو مہمان سے ملاقات کا کچھ ایسا خاص شوق تو نہیں تھا پر ان کی تیز تیز آوازوں نے تجسس بڑھا دیا تھا۔

ثمینہ کھانے کے برتن واپس لا رہی تھی، جب اس نے سب برتن اٹھا کر ٹیبل تک صاف کرلی تب زیان مہمانوں کے دیدار کے لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم۔" اس نے بڑی تمیز سے اندر قدم رکھتے ساتھ ہی سلام کیا تو آنے والے سب کے سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ تین عورتوں اور دو مردوں کے ساتھ ایک اور لڑکا نما مرد بھی تھا۔ لڑکا نما مرد اس لیے کہ اس کی ڈریسنگ اور بالوں کا اسٹائل رکھ رکھاؤ نوجوان لڑکے والا تھا جبکہ عمر کسی طرح بھی چونتیس سال سے کم نہیں تھی۔

"یہ میری سوتیلی بیٹی زیان ہے۔ امیر علی کی پہلی بیوی کی بیٹی۔ پر میں نے اسے اپنی بیٹی کی طرح ہی پالا ہے۔" زرینہ بیگم نے بظاہر بڑی محبت سے تعارف کراتے ہوئے ایک ایک لفظ پہ زور دے کر کہا۔ لہجہ عام سا تھا پر لفظوں کی کاٹ سے زیان اچھی طرح واقف تھی۔

"ماشاءاللہ بہت خوب صورت ہے۔" دائیں طرف رکھے صوفے پہ بیٹھی موٹی سی خاتون نے اس کی تعریف کی۔ باقیوں کی نگاہیں بھی اس پہ مرکوز تھیں۔

"ہمیں تو بہت پسند آئی ہے آپ کی بیٹی" باقی دو عورتوں نے تعریف میں اپنا حصہ ڈالا۔ دونوں مردوں کے ساتھ ساتھ لڑکا نما مرد بھی اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"جاؤ زیان بوا سے بولو اچھی سی چائے بنائیں۔ تم چائے خود لے کر آنا۔" زرینہ نے بڑے آرام سے اسے وہاں سے اٹھایا۔ خود زیان سب کی نگاہوں سے الجھن محسوس کر رہی تھی۔ وہ سیدھی بوا کے پاس آئی اور زرینہ بیگم کا آرڈر ان تک پہنچایا۔ "کیا بات ہے کچھ پریشان نظر آ رہی ہو؟" بوا سے اس کے تاثرات پوشیدہ نہ رہ سکے۔

"بوا بہت عجیب لوگ ہیں۔ عورتیں مرد سب مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔" اس کی الجھن زبان پہ آ ہی گئی۔

"چھوٹی دولہن کے جاننے والوں میں سے ہیں۔ سنا ہے اچھے لوگ ہیں۔ لڑکا بھی بر دکھوے کے لیے ساتھ آیا ہے کیونکہ امیر میاں خود تو لڑکے والوں کے گھر جا نہیں سکتے۔" بوا بتا رہی تھیں۔ زیان کے کانوں سے جیسے دھواں نکلنے لگا۔

لڑکا نما مرد یا مرد نما لڑکا ہی اس کا امیدوار نظر آ رہا

تھا۔ تبھی ہی اتنا گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ بوا' زیان کے تیوروں سے خائف سی نظر آرہی تھیں۔

"امیر میاں بیمار ہیں اللہ رہتی دنیا تک ان کا سایہ تمہارے سر پہ سلامت رکھے پر زندگی بڑی بے وفا ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ تم ان کی زندگی میں اپنے گھر کی ہو جاؤ گی تو بہت ساری مشکلات سے بچ جاؤ گی۔ تسلی رکھو امیر میاں کو لڑکا اور اس کے گھر والے پسند آئے تو ہی وہ رضا مندی دیں گے اپنی۔" بوا نے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ کر تسلی دی۔

پر زیان کو کہاں چین آنا تھا وہ انہی قدموں کے پاس سے اٹھ کر امیر علی کی طرف آئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح بستر پہ دراز تھے۔ اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ "آگئیں تم کالج سے"

"جی" وہ اپنی انگلیوں کو اضطراب کے عالم میں مسل رہی تھی۔ اس کی اندرونی کشمکش کا امیر علی کو بھی اندازہ تھا پر وہ کچھ بول نہیں پا رہے تھے۔ "ڈرائنگ روم میں کچھ مہمان آئے بیٹھے ہیں تم ملی ہو ان سے؟" انہوں نے ایسے سوال کیا جیسے ان دونوں باپ بیٹی میں اس نوعیت کی بات چیت چلتی رہی ہو۔ "جی ملی ہوں۔"

"کیسے لگے تمہیں؟" اس سوال کا اس کے پاس جواب نہیں تھا اس کے گلابی چہرے پہ اداسی اور اضطراب تھا جیسے بہت کچھ کہنا چاہ رہی ہو پر بول نہ پا رہی ہو امیر علی کا دل اس کے لیے دکھ اور محبت سے بھر سا گیا۔

"ادھر میرے پاس آکر بیٹھو نا" ان کے لہجے میں تڑپ تھی۔ زیان نے کراہتی نگاہوں سے انہیں دیکھا "اب نہیں۔ جب مجھے آپ کی محبت اور اعتبار کی ضرورت تھی تب آپ نے مجھے مضبوطی نہیں دی۔ اب جب آپ خود کمزور عمارت کی طرح ڈھے گئے ہیں تو محبت اور اعتبار مجھے دینا چاہ رہے ہیں۔ جب وقت گزر چکا ہے جب جذبے اور ان کی صداقتیں میرے لیے بے معنی ہو چکی ہیں۔ آپ امیدوں کے دیے جلائے میری راہوں میں کھڑے ہو گئے ہیں۔ میری ضرورت ختم ہو گئی ہے۔" زیان یہ سب دل میں ہی خود سے کہہ سکی۔ اتنے میں کمرے کا دروازہ چرچراہٹ سے کھلا۔ زرینہ بیگم مہمانوں کے ساتھ داخل ہوئیں۔

"زیان کو وہاں پا کر ایک بار پھر ان سب کی آنکھوں میں اشتیاق امنڈ آیا۔ "بھائی صاحب ہم جا رہے ہیں۔ سوچا جاتے جاتے آپ کو خدا حافظ کہہ دیں اور اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دے دیں۔ کمال کو تو آپ نے دیکھ ہی لیا ہے اب آکر ہمارا گھر بار بھی دیکھ لیں۔" وہی موٹی عورت تیز تیز آواز میں بول رہی تھی جبکہ کمال یعنی مرد نما لڑکے کی نگاہیں زیان کے گرد طواف کر رہی تھیں۔ باری باری سب امیر علی سے ملے۔ جاتے

جاتے وہی موٹی عورت ذیان کے پاس رکی اور اس کے ماتھے پہ زوردار بوسہ دیا۔ باقی مردوں نے ذیان کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ جبکہ ان میں سے ایک نے جو قدرے زیادہ عمر کا تھا اس نے کچھ نوٹ زبردستی ذیان کو تھمائے۔

"زرینہ بہن جلدی آنا ہمارے گھر ہم سے زیادہ انتظار نہیں ہو گا۔" وہی موٹی عورت جاتے جاتے ذیان کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پھر سے یاد دہانی کروا رہی تھی۔ جواباً" زرینہ بیگم نے بھی آنے کی یقین دہانی کروائی۔ کمال نامی موصوف نے ایک آخری بھرپور نگاہ پھر ذیان پہ ڈالی۔ وہ یہاں ہوتے ہوئے بھی یہاں نہیں تھی ورنہ کمال کی اس بے باک حرکت کا ضرور جواب دیتی۔ زرینہ بیگم مہمانوں کو رخصت کر کے آئیں تو بہت خوش تھیں۔

☼ ☼ ☼
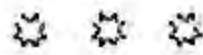
ذیان ہنوز ان کے شوہر نامدار کے پاس بیٹھی تھی۔ پر اس وقت زرینہ کو خاص تکلیف یا حسد کا احساس نہیں ہوا جس سے وہ پہلے دوچار ہوتی آئی تھیں۔ کیونکہ ذیان کے اس گھر سے جانے میں کچھ ہی دن باقی تھے اچھا تھا امیر علی کی بچی کچھی محبت سمیٹ لیتی۔ کمال اور اس کی فیملی نے بہت ہی مثبت رد عمل کا اظہار کیا تھا۔ ویسے زرینہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کمال اور اس کے گھر والے ان سے مرعوب ہیں۔ اتنا خوب صورت گھر 'دو دو گاڑیاں' نوکر چاکر مہنگا فرنیچر' زرینہ بیگم کے پہنے ہوئے زیورات' قیمتی سوٹ کچھ بھی تو زمانے کے مروجہ معیار کے مطابق نظرانداز کرنے والا نہیں تھا اور پھر ذیان کا حسن ہوش اڑانے والا تھا۔ اتنی خوب صورت حسین کم عمر لڑکی کا تصور تو کمال نے خواب میں بھی نہ کیا تھا۔ ابھی تک اس کی شادی نہ ہو پائی تھی۔ حالانکہ پڑھائی مکمل کر کے سب ذمہ داریاں سنبھالے اسے کتنے سال ہو گئے تھے۔ اس سے بڑی تین بہنیں تھیں۔ تینوں کی تینوں زبان دراز اور واجبی شکل و صورت کی مالک تھیں۔

اللہ اللہ کر کے ان کی شادیاں ہوئیں۔ ان کی شادیاں ہونے گھر بسنے میں والدہ کی دوڑ دھوپ کے ساتھ وظیفوں کا بھی عمل دخل تھا جو وہ "وقتاً" فوقتاً" کرتی تھیں۔ اب کہیں جا کر کمال کی باری آئی تھی۔ کمال کی والدہ عفت خانم بیٹے کی عمر سب کو چھبیس سال بتاتی تھیں حالانکہ وہ پینتیس سال سے کم کا نہ تھا۔ ملٹی نیشنل فرم میں اچھے عہدے اور تنخواہ پہ کام کر رہا تھا۔

فی الحال اتنی ہی معلومات زرینہ بیگم کو حاصل ہوئی تھی۔ یہ رشتہ بیگم اختر کے توسط سے آیا تھا انہوں نے تو بہت تعریفیں کی تھیں اور کہا تھا کہ کمال کو کوئی لڑکی نا پسند کر ہی نہیں سکتی۔ تب ہی تو زرینہ بیگم نے بالا بالا ہی بیگم اختر کو کہلوایا تھا کہ لڑکا بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ لازمی ان کے گھر آئے تاکہ امیر علی بھی اسے دیکھ لیں۔ وہ کسی بھی تاخیر کے حق میں نہیں تھیں۔ تب ہی تو کمال اپنی فیملی کے ساتھ ان کے ہاں آیا تھا۔ امیر علی سے اس کی خاصی دیر بات چیت ہوتی رہی وہ اس کے کام گھر' خاندان اور دیگر حوالوں سے چھوٹے چھوٹے سوالات اس سے پوچھتے رہے۔ پر زرینہ کو امیر علی کے تاثرات سے کمال کے بارے میں پسند و ناپسند کا اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

ان کا بس چلتا تو ذیان کو ہاتھ پکڑ کر کمال کے گھر چھوڑ آتیں۔ پر امیر علی کی وجہ سے ایسا سوچنا بھی کار محال تھا۔ آخر کو ذیان ان کی "لاڈلی بیٹی" تھی۔ وہ دفعان ہو جاتی تو زرینہ بیگم سکھ کا سانس لیتیں۔

اس کا کانٹا ہی نکل جاتا جو اتنے سالوں سے دل میں پیوست چبھ رہا تھا۔

زرینہ بیگم کرسی اٹھا کر امیر علی کے بیڈ کے پاس رکھ کر خود بھی بیٹھ گئیں۔ انہوں نے ایک نظر امیر علی کے دائیں طرف بیٹھی ذیان کو دیکھا اور دوسری نظر اپنے مجازی خدا پہ ڈالی جو ہاتھ سے اپنی کنپٹی سہلا رہے تھے۔

"ذیان اپنے کمرے میں جاؤ۔ مجھے تمہارے ابو سے بات کرنی ہے۔" زرینہ نے رخ ہلکا سا موڑ کر ذیان کو دیکھتے ہوئے تحکم آمیز لہجہ میں کہا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

مکمل ناول

نبیلہ ابر راجہ

میں گماں نہیں یقین ہوں

۳ تیسری قسط

زیان ان کی اگلی کوئی بات سنے بغیر اٹھ کر آگئی۔ ویسے بھی وہ زرینہ بیگم کے سامنے آنے سے احتراز ہی کرتی تھی۔ اس کی کوشش ہوتی وہ بات بھی کم سے کم کرے۔ پھر بھی زرینہ بیگم کو اس کے وجود سے تکلیف ہی ہوتی۔

زرینہ نے بھڑ ادروازہ مکمل طور پہ بند کیا اور پھر سے امیر علی کے پاس اپنی جگہ بیٹھ گئیں۔ ان کا انداز انتہائی رازدارانہ اور چوکنا تھا۔ امیر علی بھی انہیں غور سے دیکھنے لگے۔

"آپ نے لڑکا اور اس کی فیملی دیکھی کیسے لگے آپ کو؟" وہ آہستہ آواز میں دلچسپی سے پوچھ رہی تھیں۔ جیسے کسی کے سن لیے جانے کا ڈر ہو۔

"پہلی ملاقات میں ہی کسی کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ کیسے کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی بتایا جاسکتا ہے کہ کوئی کیسا ہے۔" امیر علی نے خاصے محتاط الفاظ کا سہارا لیا تھا پر زرینہ کو پھر بھی ان کی بات یا رائے پسند نہیں آئی۔

"میں نے تو صرف یہ پوچھا ہے کہ کمال کے گھر والے آپ کو کیسے لگے رہی بات اچھائی برائی کی تو بیگم اختر نے ان کی بہت تعریفیں کی ہیں۔ کمال اعلا تعلیم یافتہ ہے' کھاتے پیتے خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ بہت شریف لڑکا ہے۔ بظاہر کوئی عیب بھی نہیں ہے۔ بے غرض اور بے لوث عادات کا مالک ہے۔ پہلے اپنی تین بہنوں کی شادیاں کیں اور صبر سے اپنی باری کا انتظار کیا۔ بہت سی لڑکیوں کے والدین نے خود اپنے منہ سے کمال کے رشتے کا کہا' پر وہ ایسا سعادت مند کہ کہا مجھے اپنے والدین کی پسند پہ اعتبار ہے' جسے وہ میرے لیے چنیں' میں اسی سے شادی کروں گا۔

کمال کے گھر والوں کو ہماری زیان بہت پسند آئی ہے۔ کیونکہ ان کی باتوں سے بار بار اظہار ہو رہا تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ اتنا اچھا لڑکا ہاتھ سے نکل جائے۔" زرینہ نے مجازی خدا کو متاثر کرنے اور کمال کے لیے ہموار کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

"زیان پڑھ رہی ہے' وہ ابھی بیس سال کی بھی پوری نہیں ہوئی ہے اور کمال لڑکا نہیں پورا مرد ہے۔ مجھے اس کے گھر والے بھی پسند نہیں آئے۔ عجیب شو آف سطحی محسوس ہوئے ہیں مجھے۔ میں زیان کا رشتہ دے دوں انہیں۔" امیر علی نے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف انکار کر دیا۔ زرینہ کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔

"ٹھیک ہے کمال کی عمر تھوڑی زیادہ ہے پر اتنی بھی زیادہ نہیں ہے۔ اٹھائیس سال کا ہے صرف۔" انہوں نے مبالغے کی انتہا ہی تو کر دی۔ "اس کی بڑی بہن بتا رہی تھی کہ محنت کر کر کے اور پڑھائی میں جان ماری کی وجہ سے کمال زیادہ عمر کا لگنے لگا ہے۔ ورنہ اٹھائیس سال کوئی ایسی بھی زیادہ عمر نہیں ہے۔ آپ بھی تو مجھ سے چھ سال بڑے ہیں۔ میرے ماں باپ نے تو آپ کی عمر اور ساتھ پہلی بیوی کی بیٹی پہ بھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ آپ نے زیان کو ساری عمر گھر بٹھا کر رکھنا ہے کیا؟ اس کی شادی ہو گی رابیل اور منائل کی باری آئے گی نا۔" شروع میں زرینہ بہت غصے میں

تھیں۔ لیکن آخر میں مصلحت کے تحت نرم پڑ گئیں۔

"رابیل اور منال ابھی بہت چھوٹی ہیں، جس طرح زیان میری بیٹی ہے۔ اس طرح وہ بھی میری ہی اولاد ہیں۔ میں ان کے بارے میں بھی سوچتا ہوں۔ وقت آنے پہ سب کام ہو جائیں گے۔ تم خوامخواہ ہلکان مت کیا کرو خود کو۔"

"کیسے ہلکان نہ کروں میں خود کو۔ آپ بیمار رہتے ہیں گھڑی بھر کا پتا نہیں ہے۔ میں نے ہر مشکل وقت میں آپ کا ساتھ دیا ہے۔ دکھ سکھ کے سب موسم آپ کے ساتھ کاٹے۔ کبھی کوئی شکوہ و شکایت نہیں کی۔ میں زیان کی دشمن تھوڑی ہوں۔ اچھے رشتے بار بار نہیں ملتے۔ میں تو صرف اتنا چاہتی ہوں کہ وہ آپ کے جیتے جی اپنے گھر کی ہو جائے۔ آپ اسے بہت پیار کرتے ہیں۔ لاڈلی ہے وہ آپ کی۔ میں سب جانتی ہوں، تب ہی تو بیگم اختر کو کہلوا کر کمال کو پہلی ملاقات میں ہی آپ سے ملوانے کے لیے گھر بلوایا۔ میں چاہتی ہوں زیان قدردان سسرال میں جائے۔ پہلی بار ہی

کمال کے گھر والے اس پہ واری صدقے ہو رہے تھے۔ اچھے لوگ ہیں۔ ذیان عیش کرے گی۔ کمال عمر میں ذیان سے تھوڑا بڑا ہے، پر یہ کوئی ایسا عیب نہیں ہے جس کو وجہ بنا کر رشتہ ٹھکرا دیا جائے۔ زیادہ عمر کے شوہر بیوی کو خوش رکھتے ہیں۔ آپ نہیں چاہتے تو میں انکار کہلوا دوں گی کمال کے گھر والوں کو۔"

امیر علی ان کی باتوں اور دلائل سے قائل ہوتے جا رہے تھے، تب ہی تو زرینہ نے انداز بدلا تھا۔ پھر اس کے بعد وہی ہوا جو زرینہ بیگم چاہ رہی تھیں۔ امیر علی یک دم نرم پڑ گئے۔

"ٹھیک ہے، تم لڑکے کے گھر جاؤ۔ اسے دیکھو، رہن سہن کا جائزہ لو، چھان بین کراؤ، اس کے بعد دیکھا جائے گا۔" امیر علی نے صاف رضامندی تو نہیں دی تھی، پر انکار بھی نہیں کیا تھا۔ زرینہ بہت مسرور تھیں۔ ان کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ باقی کے مراحل آسان تھے۔ امیر علی کی حیثیت ویسے بھی کمزور ہو گئی تھی۔ انہوں نے بیماری کے دوران تمام جائیداد کا وارث زرینہ بیگم کو بنا دیا تھا۔ اس وقت حالات کا تقاضا ہی یہ تھا۔ زرینہ آسانی سے مختار کل بن گئی تھیں۔ وہ خوش تھے کہ ان کی شوہر پرست شریک سفر ذیان کا حق نہیں مارے گی۔ وہ ماں کی طرح ہی سوچے گی، پر زرینہ کی نیت بدل چکی تھی۔ ان کی پہلی کوشش یہ ہی تھی۔ ذیان کی جلد از جلد شادی ہو جائے۔ اس سے پہلے کہ کسی کمزور لمحے میں امیر علی کی محبت جاگ پڑے اور وہ پھر سے وکیل کو بلوا کے وصیت تبدیل کروا دیں۔ ذیان جب تک یہاں تھی اس کا امکان سو فیصد تھا۔ اس کی شادی کے بعد یہ خطرہ بھی ٹل جاتا اور بعد میں اگر امیر علی وصیت میں تبدیلی کا بولتے تو کون سا انہوں نے انہیں یہ کام کرنے دینا تھا۔ ایک مفلوج معذور انسان کی کسی صحت مند ہاتھ پاؤں والے کے سامنے کہاں چلتی ہے۔ امیر علی کو رام کرنے کے بہت سے طریقے تھے اور وہ ان کے دلائل سے قائل ہو بھی جاتے تھے۔

"ہاں ٹھیک ہے، میں روبینہ آپا کو ساتھ لے کر بہت جلد خود کمال کے گھر جاؤں گی۔ ہر چیز دیکھ بھال کر پرکھ کر خود بتاؤں گی آپ کو۔ اگر مجھے کہیں ذرا سی بھی گڑبڑ لگی تو آپ سے پہلے میں خود انکار کروں گی۔"

"تم کتنی اچھی ہو زرینہ۔ میں سوچتا ہوں تم میری زندگی میں نہ ہوتیں تو میری زندگی کتنی مشکل ہوتی۔" وہ تہ دل سے ان کے شکر گزار احسان مند تھے۔

"ارے آپ ایسی باتیں نہ کریں۔" زرینہ دل میں بہت خوش تھیں۔

"تم ٹھیک کہتی ہو ذیان کی شادی ہو جانی چاہیے۔" اس بار وہ تلملا کر رہ گئیں، کیونکہ امیر علی کے لہجہ اور آنکھوں میں ذیان کے لیے فکرمندی تھی۔

پر وہ وقت جذبات کے اظہار کے لیے مناسب نہیں تھا۔ انہیں کمال کے رشتے کے لیے راہ ہموار کرنی تھی۔ امیر علی سے زیادہ مشکل کام ذیان کو منانے کا تھا۔ وہ ننگی تلوار تھی، کسی وقت کچھ بھی کر سکتی تھی۔ پھر وہاب اس کے حصول کے لیے ہر راستہ اختیار کرنے کے لیے تیار تھا۔ وہاب کے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے انہیں ذیان کی شادی کرنی تھی۔

☼ ☼ ☼

ذیان نے مٹھی میں تھامے نوٹ گنے بغیر ٹیبل پہ پھینکے۔ جس مقصد کے لیے اسے یہ روپے دیے گئے تھے۔ وہ اس وقت اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہ رہی تھی۔ مگر دماغ تھا کہ گھما پھرا کے ادھر ہی لیے جا رہا تھا۔ زرینہ آنٹی نے اسے ابو کے پاس سے اٹھا دیا تھا۔ یقیناً" انہوں نے آج آنے والے مہمانوں، بلکہ خاص الخاص مہمانوں کے بارے میں ہی ان سے بات کرنی تھی۔ خوشی سے زرینہ آنٹی کا چہرہ چمک رہا تھا۔ جیسے آج ہی میدان مار کے رہیں گی۔ ذیان مضطرب تھی۔ بوا رحمت کی ڈھکی چھپی نصیحتیں، زرینہ بیگم کی خوشی، امیر علی کی لاتعلقی و بے نیازی آنے والے مہمانوں کی دلچسپی اس کی پریشانی کو بڑھا رہی تھی۔

شادی کے بارے میں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس کا ٹارگٹ یا مقصد نہیں تھا۔ پھر کیوں

زرینہ بیگم اس کے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ وہ خوش ہے' پرسکون ہے' اسے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے' لیکن زرینہ بیگم اس کی ہر خوشی چھیننے کے درپے ہیں۔

مرد کی ضرورت اگر زندگی کا خاصہ و لازمہ ٹھہرتی ہے تو اس کے سامنے مرد کا روپ باپ کی صورت میں موجود تھا۔ پر باپ کے ہوتے ہوئے بھی اس نے خود کو اکیلا' کمزور اور بے بس ہی تصور کیا تھا۔ ماں کے حوالے سے طعنے ہی سنے تھے۔ حقارت ہی سمیٹی تھی۔ اس نے سب حقارت' ذلت بے بسی اکیلے ہی برداشت کی تھی۔

امیر علی نے تو اسے کبھی بھی زرینہ بیگم کی نفرت سے نہیں بچایا' نہ اس کی مدد کو آئے۔ اب وہاب جو اس کے بارے میں انتہائی حد تک جاکر سوچ رہا ہے' تب بھی تو وہ اکیلے ہی سہ رہی ہے نا۔ پھر وہ کیوں زرینہ بیگم کے سامنے جھکے' سرینڈر کرے۔ وہ اس کے ساتھ زبردستی نہیں کرسکتیں۔ باقی جو وہ چاہے کریں' پر وہ کوئی تر نوالہ نہیں ہے۔ اتنی آسانی سے تو کسی صورت بھی ہار نہیں ماننے گی۔ ناکوں چنے چبوادے گی۔ امیر علی اپنی بیگم کے سامنے بے بس ہوں گے۔ وہ بالکل بھی نہیں ہے اور وہ انہیں ایسا کرکے دکھائے گی۔

زیان کے لبوں پہ زہر میں ڈوبا تبسم رقصاں تھا۔ زرینہ بیگم اگر اس وقت اس کے چہرے کو دیکھ لیتیں تو ایک ثانیے کے لیے ڈر تیں ضرور کہ زیان نے ہار نہ ماننے کا تہیہ کرلیا تھا اور یہ تو وہ بھی اچھی طرح جانتی تھیں کہ زیان ضد میں اپنی منواتی ہے۔ بے شک وہ ان سے خائف تھی' دبتی تھی' پر اس کے سرکش خیالات بدلے نہیں جاسکتے تھے۔

☆ ☆ ☆

زرینہ' روبینہ آپا سے فون پہ بات کررہی تھیں۔ موضوع گفتگو کمال اور اس کی فیملی ہی تھی۔

"کیسے ہیں لڑکے والے؟" روبینہ نے سوال کیا۔

"مجھے تو سب بہت اچھے لگے ہیں۔"

"اور امیر بھائی کیا کہتے ہیں؟"

"مجھے تو لڑکا بہت پسند آیا ہے' پھر آپ کے بھائی صاحب کہتے ہیں کہ اچھی طرح چھان بین کرواکے بات آگے بڑھائی جائے۔ انہیں کمال کی عمر پہ بھی اعتراض ہے۔ اپنی بیٹی ننھی' چوزی لگ رہی ہے' پر زیان ایسی بچی تو نہیں ہے کہ شادی جیسی ذمہ داری بھی نہ اٹھاسکے۔"

زرینہ نے جتاتے ہوئے جیسے ناک بھوں چڑھائی تھی۔ روبینہ نے متفق ہونے میں دیر نہیں لگائی۔

"ویسے بھی لڑکیاں جلدی سیانی ہوجاتی ہیں۔"

"آپا آپ کو اگلے ہفتے میرے ساتھ کمال کے گھر چلنا ہے۔ میں نے اسی لیے آپ کو فون کیا تھا۔"

زرینہ نے باتوں باتوں کے دوران اچانک انہیں بتایا تو وہ پریشان سی ہوگئیں۔ "کس دن جانا ہے؟"

"آپا آپ فکر مت کریں' جب وہاب ہفتہ میں ہوگا ہم تب چلیں گے۔ آپ کے بھائی نے فضول کی بیخ لگادی ہے کہ لڑکے کے گھر جاؤ' سب سے ملو' جائزہ لو۔" زرینہ ان کی پریشانی کی وجہ جانتی تھیں۔ تب ہی تو فوراً تسلی دی۔

"تم جانے سے ایک دن پہلے مجھے بتادینا۔"

"ہاں میں بتادوں گی۔" روبینہ غائب دماغی سے سر ہلانے لگیں۔

☆ ☆ ☆

راعنہ' رات سے مایوں بیٹھ رہی تھی۔ ٹھیک سات دن بعد اس کی بارات آنی تھی۔ وہ سب چنڈال چوکڑی بہت خوش اور پرجوش تھی۔ کومل اور رنم نے روایتی انداز کے سوٹ سلوائے تھے۔ کومل تو خاص طور پر پرجوش تھی۔ اس کی تیاریاں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ پراندے کو اس نے سو سو بار کندھے کے آگے پیچھے ڈال کے دیکھا۔ جبکہ اس کے برعکس رنم ہمیشہ کی طرح پراعتماد تھی۔ سبز چوڑی دار پاجامے' پیلی شرٹ ہم رنگ دوپٹا اوڑھے وہ بڑا مشرقی اور الگ سا تاثر پیش کررہی تھی۔ بالوں میں پراندہ اور موتیے کے

گجرے دیکھ کر فراز اور اشعر نے بے اختیار ہی "واؤ" کہا۔ اس کی آنکھوں میں اعتماد کا رنگ کچھ اور بھی گہرا ہو گیا۔

جوان لڑکیوں کے نقرئی قہقہے شور' ہنگامہ' موج مستی' ماحول پہ چھائے خوب صورتی کے رنگوں کو اور بھی بڑھا رہے تھے۔ ڈھولک کومل کے قبضے میں تھی۔ راعنہ کی کزن کے ساتھ مل کر اس نے شادی بیاہ کے گانوں کی خوب ہی ٹانگ توڑی۔ راعنہ ان سب کے درمیان بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

رنم ہنگامے' شور شرابے سے تھک ہار کر راعنہ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ راعنہ نے سر سے ڈھلکتا آنچل ٹھیک کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے' تم سب کے ساتھ انجوائے کیوں نہیں کر رہی ہو؟"

"میرا دل چاہ رہا ہے تمہارے پاس بیٹھوں' باتیں کروں' تمہاری شادی ہو جائے گی تو کہاں ہاتھ آؤ گی۔" رنم مسکراتے ہوئے شگفتہ انداز میں بولی۔

"شادی کے بعد میں نے شہریار کے گھر ہی جانا ہے اور تو کوئی جگہ نہیں ہے۔ تم جب چاہو آسکتی ہو۔" راعنہ مسکرائی۔ رنم نے ایک نظر ڈھولک بجاتی لڑکیوں پہ ڈالی۔ ان میں کومل سب سے پیش پیش تھی۔ اسے ہنسی آگئی۔ راعنہ بھی مسکرا رہی تھی۔ کومل ایسی ہی تھی' زندگی کے ہر پل سے خوشی کشید کرنے والی' شرارتی' منہ زور جذباتی۔

چند لمحے ڈھولک بجاتی کومل کو دیکھنے کے بعد رنم پھر سے راعنہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ "تم نے برائیڈل لے لیا؟ شوروم والے نے کل کی ڈیٹ دی تھی۔" اسے اچانک یاد آیا۔ "نہیں۔" راعنہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "شہریار نے منع کر دیا ہے۔"

"کیوں' کس وجہ سے؟" وہ حیران ہو کے بولی۔

"فنکشن ختم ہو جائے تو بتاؤں گی۔ ویسے شہریار کے گھر والے میرا برائیڈل اور دیگر سب چیزیں لے آئے ہیں۔ ادھر سے فارغ ہو کر دکھاؤں گی۔" راعنہ کی بات پہ وہ سر ہلانے لگی۔ راعنہ نے تقریب ختم ہونے کے بعد کچھ بتانے کا بولا تھا۔ رنم کو شدت سے انتظار تھا کہ کب فنکشن ختم ہوتا ہے۔

رات کے آخری پہر جاری ہنگامہ ختم ہوا تو ان سب کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ راعنہ کے کمرے میں ہی رنم اور کومل کا بسیرا تھا۔ وہ تو آتے ہی بیڈ پہ ڈھیر ہو گئی۔ پر رنم کو راعنہ کا کچھ گھنٹے پہلے والا پراسرار انداز ہضم نہیں ہوا تھا۔ تب ہی تو اس نے فوراً یاد دہانی کرائی۔ "تم نے مجھے کچھ بتانا تھا راعنہ؟"

"اوہ ہاں...." وہ فوراً بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اتنے میں اس کی گھریلو ملازمہ کافی کے تین مگ ٹرے میں رکھے ان کے لیے لائی۔ رنم نے تو بے تابی سے اپنا مگ اٹھایا۔ راعنہ ملازمہ کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ اس کے جانے کے بعد راعنہ نے اپنا مگ اٹھایا۔

"برائیڈل اور جیولری سب مما کے روم میں ہے۔ میں نے ملازمہ کو لانے کے لیے بھیجا ہے۔" وہ رنم کو بتا رہی تھی۔

"کیسا برائیڈل اور جیولری؟" کومل نے حیرانی سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ اسے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی' ملازمہ شاپرز اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔

"ادھر سامنے ٹیبل پہ رکھ دو۔" راعنہ نے اشارہ کیا تو اس نے ٹیبل سے باقی سب سامان اٹھا کر تمام شاپرز وہاں رکھ دیے۔

راعنہ نے شاپرز کھول کر سب سامان باہر نکالا۔ کومل حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بہت سے سوال مچل رہے تھے۔

"یہ ہے میرا برائیڈل جو شہریار نے خود لیا ہے۔" راعنہ نے ایک عام سا عروسی سوٹ دیکھنے کے لیے ان کی طرف بڑھایا۔

"یہ تمہارا برائیڈل ہے اتنا عام سا۔" کومل کو یقین نہیں آرہا تھا کہ راعنہ کا شادی کا جوڑا اتنا کم قیمت بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ٹھیک کہ راعنہ کے سسرالی اسٹیٹس میں راعنہ کے پاپا کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ پر ان کی حالت ایسی گئی گزری بھی نہیں تھی کہ وہ اپنی بہو کے

لیے شان دار سا برائیڈل نہ بنا سکتے۔ رنم کی آنکھوں میں بھی وہی کومل والا سوال تھا۔

"یہ برائیڈل شہریار نے خالصتاً" اپنی کمائی سے خریدا ہے۔ اتنا کم قیمت بھی نہیں ہے' پورے تیس ہزار کا ہے۔ حالانکہ پاپا نے جیولری' برائیڈل' سینڈلز ہر چیز کا آرڈر کر دیا تھا' پر شہریار نے منع کر دیا۔ انہوں نے پاپا کو صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ نہ جہیز لیں گے' نہ اپنے سسرال والوں کی کوئی مدد لیں گے اور تو اور شہریار نے اپنے گھر والوں کو بھی منع کر دیا ہے کہ وہ میرے لیے کچھ مت لیں۔ شہریار نے میرے لیے سب کچھ خود اپنی کمائی سے لیا ہے۔" راعنہ کے لہجہ میں بے پناہ فخر اور غرور تھا۔

شہریار کی خریدی گئی کم قیمت چیزیں ان چیزوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھیں جو وہ اپنے پاپا کے گھر میں استعمال کرتی رہی تھی۔ "کوائیٹ امیزنگ راعنہ" رنم حیرانی کے حصار سے باہر آئی۔

"شہریار نے پاپا سے بولا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ خود سب کچھ بنائیں گے۔ فی الحال ان کے پاس جو کچھ ہے وہ انہیں قبول کرنا ہو گا۔ انہوں نے ولیمہ کا جوڑا بھی خود خریدا ہے۔" وہ ایک کے بعد ایک ناقابل یقین خبر سنا رہی تھی۔

"اور تمہارے پاپا نے شادی پہ جو لگژری فلیٹ تمہیں گفٹ کرنا تھا اس کا کیا بنا؟" رنم کو اچانک یاد آیا۔

"شہریار نے منع کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ تم پاپا سے کچھ مت لینا۔ میرے پاس جو ہے تم اسی میں گزارا کرو گی۔ وہ بہت خوددار ہیں رنم۔" راعنہ کی آواز میں ایک خاص قسم کا فخر اور غرور تھا۔

"تم کو کوئی اعتراض نہیں ہے؟" کومل نے سوال کیا۔

"نہیں' مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے' بلکہ میں تو بہت خوش ہوں کہ شہریار اتنے خوددار ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو خوشی خوشی ان سب چیزوں سمیت مجھے قبول کرتا' لیکن شہریار کو اپنی محنت پہ بھروسا ہے۔ وہ سسرال کے بل بوتے پہ ترقی کرنا' آگے بڑھنا نہیں چاہتے۔"

"تم گزارا کر لو گی؟" رنم نے سوال کیا۔

"ہاں میں شہریار کے ساتھ ہر قسم کے حالات میں گزارا کر لوں گی' کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔" راعنہ کے چہرے پہ دلکش مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

رنم بے پناہ حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ سب اس کے لیے بہت انوکھا اور حیران کن تھا۔ راعنہ جیسی آسائشوں میں پلی بڑھی لڑکی محبت کے بل بوتے اپنے شوہر کے ساتھ ہر حال میں رہنے کا عزم کر چکی تھی۔ وہ شہریار کی طرف سے آئے عام سے عروسی سوٹ اور زیورات کے باوجود خوش تھی اور شہریار جیسے خوددار کردار تو صرف کہانیوں' فلموں اور ڈراموں میں ہی نظر آتے ہیں' جو گھر آئی لکشمی کو ٹھکرا دیتے ہیں' جو اپنے زور بازو پہ بھروسا کرتے ہیں۔ باقی رات رنم کو نیند ہی نہیں آئی۔ وہ شہریار اور راعنہ کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔

☼ ☼ ☼

زرینہ تیار ہو کر روبینہ آپا کے گھر آگئی تھیں۔ وہاب حسب معمول اپنے آفس میں تھا۔ زرینہ نے اس کی عدم موجودگی سے اطمینان سا محسوس کیا۔ کیونکہ اس کی موجودگی میں کچھ چھپانا دشوار تھا۔ ایک دفعہ زوبان کے ساتھ کمال کا رشتہ طے ہو جاتا' پھر بعد کی بعد میں دیکھی جاتی۔ فی الحال زرینہ وہاب کے تیور اور دھمکی دونوں سے خائف تھیں۔

"آپا جلدی کریں نا۔" وہ بڑے صبر سے روبینہ آپا کو بالوں میں برش کرتا دیکھ رہی تھیں۔ انہیں کمال احمد کے گھر جانے کی جلدی تھی۔ وہ اسی مقصد کے لیے روبینہ آپا کی طرف آئی تھیں۔ کل رات بطور خاص انہیں فون پہ یاددہانی کروائی تھی کہ میرے آنے سے پہلے تیار رہیے گا۔ ابھی آنے سے پہلے بھی انہوں نے آپا کو فون کیا تھا کہ میں گھر سے نکل رہی ہوں۔ یہاں

پہنچیں تو وہ اطمینان سے بیٹھی ہوئی چائے پی رہی تھیں۔ ان کے شور مچانے پہ انہوں نے کپڑے بدلے۔ بال بنانے کے بعد انہوں نے پورے آرام سکون کے ساتھ چادر اوڑھی' پرس اٹھایا اور آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لیا۔ "چلیں" روبینہ' زرینہ کی طرف مڑیں جو اضطراب کے عالم میں تھیں۔ "ہاں آپا چلیں' پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔" زرینہ پہ عجلت سوار تھی۔

کمال کے گھران کا استقبال سب سے پہلے گیٹ پہ متعین چوکیدار نے کیا۔ زرینہ اندر آکر جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ گھر پرانے وقتوں کا تعمیر شدہ تھا۔ اس لیے اس میں جدیدیت مفقود ہی تھی۔ کمال کی والدہ عفت خانم انہیں دیکھ کر پریشان اور ہراساں سی نظر آئیں۔ حالانکہ زرینہ نے دو دن پہلے ہی اپنے آنے کی اطلاع کر دی تھی۔

انہوں نے خیر مقدمی چہرے پہ سجاتے ہوئے حال احوال پوچھنے کے بعد دونوں بہنوں کو ڈرائنگ روم میں لا بٹھایا۔ یہاں جگہ جگہ بے ترتیبی نظر آرہی تھی۔ شاید صفائی کرنے والی نہیں آئی تھی۔ زرینہ نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا جو بعد میں درست بھی ثابت ہوا۔ عفت خانم شرمندہ انداز میں بتا رہی تھیں کہ صفائی کرنے والی پورے ہفتے سے غائب ہے۔

"تب ہی گھر کا یہ حال ہے۔" زرینہ نے دل میں کہا۔ عفت خانم گزشتہ چالیس منٹ سے اپنے دکھڑے رو رہی تھیں۔ اس دوران انہوں نے ایک بار مروتاً" بھی دونوں بہنوں سے چائے پانی کا نہیں پوچھا۔ بہت دیر بعد جب روبینہ نے بے زار ہو کر زرینہ کو آنکھوں آنکھوں میں اٹھنے کا اشارہ کیا تو تب عفت خانم کو مہمانوں کی خاطر مدارات کا خیال آیا۔

"دراصل میں ہماری کھانا بنانے والی پچھلے ہفتے سے اپنے گاؤں گئی ہوئی ہے۔ کھانا بنا کر وہ فریج میں رکھ گئی تھی۔ کمال اور میں گرم کر کے کھا لیتے ہیں۔ روٹی کمال ہوٹل سے لے آتا ہے۔ میں صرف چائے ہی مشکل سے بنا پاتی ہوں۔ جوڑوں کے درد نے لاچار کر دیا ہے' کچھ بھی نہیں ہوتا مجھ سے۔ لیکن آپ دونوں تو خاص الخاص ہیں ہمارے لیے۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" عفت خانم وضاحت دینے کے بعد باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

روبینہ کی نگاہ پورے ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہی تھی۔ سامنے رنگ اتری دیوار پہ ایک تصویر فریم میں ٹنگی تھی۔ انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے بہن کی طرف دیکھا' جیسے پوچھنا چارہی ہوں کہ یہ کس کی ہے۔ زرینہ نے فوراً" ان کا سوال سمجھ لیا۔

"یہ کمال کی فوٹو ہے' عفت خانم کا بیٹا تین بہنوں کا اکلوتا بھائی جس کا رشتہ زیان کے لیے آیا ہے۔" روبینہ سرہلا کر رہ گئیں۔ وہ معنی خیز نگاہوں سے زرینہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ انہیں عفت خانم' گھر اور کمال کی فوٹو کچھ بھی پسند نہ آیا تھا۔ بندہ مہمانوں کا ہی خیال کرلیتا ہے۔ پورے ایک گھنٹے بعد عفت خانم کو چائے پانی کا خیال آیا تھا۔ روبینہ اٹھنا چارہی تھیں۔ پر زرینہ نے ہاتھ پکڑ کر اس عمل سے باز رکھا۔

وہ کون سا یہاں خوشی سے بیٹھی تھیں۔ رشتے کا خیال نہ ہوتا تو کب کی یہاں سے جا چکی ہوتیں۔ فطرتاً" وہ صفائی پسند اور سلیقہ مند عورت تھیں۔ یہاں جگہ جگہ گرد' مٹی' دھوں اور بے ترتیبی دیکھ کر ان کی نفاست پسند طبیعت خراب ہونا شروع ہو چکی تھی۔ اسی وجہ سے عفت خانم کی بنائی چائے کے چند گھونٹ زبردستی پیے۔ کالی' بدرنگ' بدذائقہ چائے تھی ساتھ باسی فروٹ کیک۔ حالانکہ زرینہ آتے ہوئے ان کے گھر کیک' مٹھائی اور کافی سارا موسمی فروٹ بھی لائی تھیں۔ عفت کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ ان میں سے ہی کچھ مہمانوں کے آگے رکھ دیتیں۔

چائے پی کر عفت خانم کے لاکھ روکنے کے باوجود دونوں وہاں سے اٹھ آئیں۔ باہر نکل کر سکون کا سانس لیا۔ جیسے جیل سے رہائی ملی ہو۔ عفت خانم کے گھر عجیب سی بساند پھیلی ہوئی تھی جو وہاں بیٹھے مسلسل محسوس ہوتی رہی' پھر زرینہ نے ایک بار بھی اظہار نہیں کیا۔ انہیں گھٹیا سی خوشی ہو رہی تھی۔ زیان کو کمال کے گھر میں جو' جو مسائل پیش آنے تھے اس کا

اندازہ زرینہ کو قبل از وقت ہی ہو گیا تھا۔ زیان کا سارا غرور' نخرہ' اکڑ دھری کی دھری رہ جانے والی تھی۔ امیر علی اپنے باپ کے گھر میں اس نے بہت عیش کر لیے تھے۔ اب عفت خانم کے گھر بھگتنے کی باری اس کی تھی۔ زرینہ بہت مسرور تھیں۔

☼ ☼ ☼

زرینہ' امیر علی کے بیڈ کے پاس کرسی رکھے اس پہ بیٹھی آہستہ آواز میں بات کر رہی تھیں۔ سب اپنے اپنے کمروں میں تھے۔

"میں دیکھ آئی ہوں آپا روبینہ کے ساتھ کمال کا گھر!" اتنا بول کر وہ چپ ہو گئیں۔ وہ دراصل ان کی تجسس کو ابھارنا چاہ رہی تھیں۔ امیر علی خاموشی سے ان کے اگلے جملے کا انتظار کر رہے تھے۔ سو زرینہ خود ہی پھر سے شروع ہو گئیں۔

"اتنے بڑے گھر میں صرف عفت خانم تھیں کمال آفس میں تھا۔ انہوں نے اتنے اچھے طریقے سے خاطر مدارات کی کہ دل خوش ہو گیا ہے۔ زیان وہاں راج کرے گی راج۔ نہ کوئی روک نہ ٹوک سب اپنی مرضی سے کرے گی۔ میں تو کہتی ہوں کہ اب کوئی چھوٹی موٹی سی رسم ہی کریں اور ساتھ ہی شادی کی تیاری کریں۔"

"تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے؟" ان کی اتنی باتوں کے جواب میں انہوں نے مختصر سوال کیا پر زرینہ تیار تھیں۔

"کمال بہت اچھا لڑکا ہے' انہیں شادی کی جلدی ہے' ایسا نہ ہو ہم سے مایوس ہو کر وہ کسی اور طرف کا رخ کریں اور زیان بیٹھی رہ جائے۔" آخری جملے پہ امیر علی نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔

"میری بیٹی میں کوئی عیب یا کردار میں خرابی نہیں ہے۔ لاکھوں میں ایک ہے وہ۔ بہت اچھا مقدر ہو گا اس کا۔ اللہ نہ کرے وہ بیٹھی رہے۔" امیر علی اچانک تلخ ہو گئے۔ زرینہ وقتی طور پہ خاموش ہو گئیں پر امیر علی کا رویہ حیران کن تھا۔ وہ جلدی زیان نامی بلا کو سر سے اتارنا چاہ رہی تھیں۔ اس میں اتنی ہی رکاوٹیں پیش آ رہی تھیں۔ ادھر امیر علی کی محبت جاگ اٹھی تھی۔

"میرا وہ مطلب نہیں ہے' جو آپ سمجھ رہے ہیں۔" زرینہ نے فوراً "مصلحت کا لبادہ اوڑھتے ہوئے نرم لہجہ اختیار کیا۔ "زیان ماشاء اللہ خوب صورت ہے۔ تب ہی تو کمال جیسے نوجوان کا رشتہ آیا ہے۔" انہوں نے بمشکل خود کو "مرد" کہنے سے روکا۔

"زیان میں کوئی کمی یا عیب نہیں ہے۔ میں تو ہر وقت آپ کی صحت کی طرف سے پریشان رہتی ہوں۔ میں کہتی ہوں آپ جلدی اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔" بوجھ کہتے کہتے زرینہ نے بروقت فرض بولا تھا۔ دل ہی دل میں خود کو داد بھی دی۔

"ہاں دیکھو کیا حکم میرے رب کا۔ وہ اچھی ہی کرے گا۔" امیر علی نے آنکھیں موند لی تھیں جیسے اب مزید کوئی بات نہ کرنا چاہ رہے ہوں۔ زرینہ کو دل میں بہت غصہ آیا۔

☼ ☼ ☼

افشاں بیگم اور ملک جہانگیر دونوں لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ موسم بہت خوب صورت تھا۔ ملک جہانگیر نے بہت دن بعد لان میں بیٹھ کر چائے پینے کی فرمائش کی تھی۔

"ملک صاحب آپ اپنے دوست کے گھر دوبارہ کب جائیں گے۔ پہلے آپ بہت جلدی میں تھے۔" افشاں بیگم کے دل میں اس وقت اچانک یہ بات آئی تھی۔ انہوں نے قصہ چھیڑ کر ملک جہانگیر کی توجہ پھر سے اس زیر التوا مسئلے کی طرف مبذول کروادی تھی۔

"ہاں جاؤں گا سیال کی طرف بھی۔ اس نے بولا تو تھا کہ پہلے اپنی بیٹی کی رائے لوں گا۔ اس کے بعد بتاؤں گا۔" چائے سپ کرتے ہوئے ملک جہانگیر نے اطمینان سے افشاں بیگم کو جواب دیا۔

"ویسے معاذ کی جگہ ایک کی بات چلا کر آپ نے اچھا نہیں کیا ہے' ممکن ہے اس کے دل میں یہ بات

ہو، تب ہی تو میرا ایبک خاموش خاموش سا رہنے لگا ہے۔" افشاں بیگم نے نازک سی بات کردی تھی۔

"میں ایبک کا باپ ہوں، اس کی مرضی کے بغیر اس کی زندگی کا اتنا اہم فیصلہ کیسے کرسکتا ہوں۔"

"آپ کی مہربانی ہوگی، ملک صاحب اگر آپ ایسا کریں تو۔۔۔" جواباً" وہ مسکرانے لگے۔ "تم فکر مت کرو۔"

"ٹھیک ہے ملک صاحب میں فکر نہیں کرتی پر معاذ کے بارے میں بھی سوچیں، وہ پردیس جاکر بیٹھ گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی گوری بغل میں داب کے لے آئے۔" ایک ماں کی حیثیت سے افشاں بیگم کی پریشانی فطری تھی۔

"معاذ کا بھی کرنا پڑے گا کچھ۔ سچ پوچھو تو احمد سیال کی بیٹی میں نے اس نالائق کے لیے ہی پسند کی تھی۔ وہ ناخلف مجھے مشورہ دے رہا تھا کہ پہلے بڑے بھائی کی شادی کردیں۔" ملک جہانگیر تھوڑے تلخ ہوگئے تھے۔ اس لیے افشاں بیگم نے فوراً" ہی ان سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کردیں۔

☼ ☼ ☼
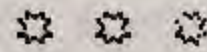
راعنہ پارلر جانے کے لیے تیار تھی۔ ملازمہ اس کا عروسی لباس اور دیگر چیزیں رکھ رہی تھی۔ کومل اور رنم دونوں اس کے ساتھ جارہی تھیں۔ "تمہیں اپنا برائیڈل پسند ہے؟" گاڑی پارلر جانے والی سڑک پہ مڑ رہی تھی، جب کومل نے گھما پھرا کر تیسری بار یہ ہی سوال کیا۔

"ہاں مجھے بہت پسند ہے۔" وہ پورے اعتماد سے بولی۔

"تمہیں اس آرڈینری ڈریس کو پہن کر آکورڈ فیل نہیں ہوگا؟" کومل نے اب ایک نئے زاویے سے سوال کیا۔

"کیوں آکورڈ فیل ہوگا ساری عمر اپنے پاپا کے دیے ہوئے پیسوں سے خریداری کی ہے، بے دردی سے رقم خرچ کی ہے۔ یہ شہزر نے اپنی کمائی سے خریدا ہے، مجھے فخر ہے اس پہ۔" راعنہ اس بار قدرے غصے سے بولی تو کومل جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی۔

دلہن بن کر راعنہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کا عروسی لباس اور جیولری اتنی قیمتی نہیں تھی پر ایسی گئی گزری بھی نہیں تھی۔ شہیار کو جاب شروع کیے اتنا زیادہ ٹائم نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنی حیثیت کے مطابق ہی سب کچھ لیا تھا۔ نہ تو اس نے اپنے والدین سے شادی جیسا معاشرتی فرض نبھانے کے لیے کوئی مالی مدد لی تھی اور نہ ہی راعنہ کے پاپا سے کچھ لینا گوارا کیا تھا۔ اسے اپنی محنت اور اللہ پہ بھروسا تھا۔ وہ اکثر نوجوانوں کی طرح شارٹ کٹ جیسے راستوں سے راتوں رات ترقی کی منازل طے کرنے والے خواب نہیں دیکھتا تھا۔ اس نے اللہ کا نام لے کر جاب کے ساتھ اپنا پارٹ ٹائم بزنس بھی شروع کردیا تھا۔ یہ اسی کی برکت تھی کہ اس نے راعنہ کے لیے شادی کی خریداری کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا چھوٹا سا گھر بھی خرید لیا تھا۔

اسے جب راعنہ کے برابر لاکر بٹھایا گیا تو انجانے سے تفاخر سے اس کی گردن اور سر اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے کی چمک بتا رہی تھی کہ راعنہ کے مقابلے میں اپنی حیثیت پہ شرمندہ نہیں ہے۔ اس کے پاس راعنہ کے پاپا جتنی دولت نہیں تھی، لیکن اس کے انداز اور شخصیت سے کسی بھی قسم کا احساس کمتری نہیں جھلک رہا تھا۔

رنم، راعنہ سے قدرے دور کھڑی اسے دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔ اگر ایسا برائیڈل ڈریس اس کا ہوتا تو وہ اتنے مہمانوں کے بیچ کبھی نہ پہنتی۔ پر راعنہ کتنی مسرور تھی۔ رنم کے لیے تو یہ بات ہی حیران کن تھی کہ شہزر، راعنہ سے کم حیثیت ہونے کے باوجود سسرال سے کسی بھی قسم کی مدد نہیں لے رہا تھا۔ وہ چاہتا تو بہت آسانی سے سب کچھ حاصل کرسکتا تھا۔ کیونکہ راعنہ کے پاپا بیٹی کو گھر، گاڑی، بینک بیلنس، بیش قیمت فرنیچر، زیورات سب کچھ ہی تو دینا چاہ رہے تھے۔ پر شہیار نے سب کچھ لینے سے انکار کردیا تھا اور

راعنہ کو بھی سختی سے منع کیا تھا۔

رنم جلد از جلد گھر جا کر اپنے پاپا سے یہ خبر شیئر کرنا چاہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

روبینہ آپا آئی ہوئی تھیں۔ کمال اور عفت خانم کے گھر سے واپسی کے بعد آج زرینہ کے یہاں ان کا پہلا چکر تھا۔ اس کے بعد بہن سے ان کی بات ہی نہیں ہوئی۔ وہ معلوم کرنا چاہ رہی تھیں کہ کمال کے بارے میں امیر علی نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے دوران روبینہ نے اچانک بہن سے یہ سوال کرلیا۔

"امیر بھائی نے کیا فیصلہ کیا کمال کے رشتے کے بارے میں؟"

"ابھی تک تو اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھا ہے۔ آپ کے بھائی کہتے ہیں کہ اتنی جلدی کا ہے کی ہے۔"

وہ برا سا منہ بناتے بولیں۔

"ویسے سچ پوچھو تو مجھے کمال کی ماں سے مل کر ذرا بھی کسی خلوص یا گرمجوشی کا احساس نہیں ہوا۔ پھر گھر کی حالت کیسی عجیب سی ہے۔ اوپر سے کمال کی جو فوٹو میں نے دیکھی، مجھے کمال بھی پسند نہیں آیا ہے۔ اتنی زیادہ عمر کا لگ رہا ہے۔ کم سے کم لڑکا زیان کے جوڑ کا ہو۔" روبینہ نے تو بڑے عام سے انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ پر زرینہ بیگم کو بہت غصہ آیا۔

روبینہ آپا کمال، اس کے گھر اور اس کی ماں عفت خانم کے خلاف بولتے ہوئے درحقیقت زیان کی سائیڈ لے رہی تھیں اور یہ ہی اس معاملے کا اختلافی پہلو تھا۔

"اتنی بھی زیادہ عمر کا نہیں ہے کمال۔ رہی گھر کی بات تو اچھا کماتا کھاتا لڑکا ہے۔ گھر بھی ٹھیک کروا لے گا۔ زیان سے عیش ہوں گے۔ نند یں اپنے گھروں کی ہیں۔ ساس بوڑھی اور بیمار ہے۔ اس کا اپنا راج ہوگا۔" زرینہ بڑھ بڑھ کر منگنی کی حمایت میں بول رہی تھیں۔

پر بہن کے لاکھ چاہنے کے باوجود بھی وہ اس سے متفق نہیں ہو پا رہی تھیں۔ کچھ بھی سہی وہ لاکھ بری ہونے کے باوجود زرینہ کی طرح دشمنی اور بدگمانی میں اندھے ہو جانے والوں میں شامل نہیں تھیں۔ وہاب ان کا لاڈلا بیٹا زیان کی محبت میں پاگل تھا۔ اس کی خوشی دیکھتے ہوئے روبینہ ماں ہونے کی حیثیت سے چاہ رہی تھیں کہ زیان کا رشتہ وہاب سے طے ہو جائے پر زرینہ ان کی ماں جائی اس حق میں نہیں تھی۔

روبینہ اپنی بہن کی فطرت، ہٹ دھرمی اور ضد سے اچھی طرح واقف تھیں۔ اس لیے انہیں ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ زرینہ اس رشتے پہ آمادہ ہوگی۔ اس لیے وہ خاموش ہو گئی تھیں۔ پر کمال کی صورت میں زرینہ نے زیان کے لیے جو رشتہ اسے دکھایا تھا، وہ بھی زیان کے لیے ہر لحاظ سے ناموزوں تھا۔ چپ چاپ خاموش گہری اداس آنکھوں والی زیان پہ نہ جانے کیوں انہیں رہ رہ کر ترس آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

زیان کالج سے لوٹی تو گھر میں سناٹا تھا سو ویسے بھی اس وقت سب کھانا کھا کر آرام کرتے تھے۔ آفاق، رابیل اور منابل اس سے پہلے گھر آتے اور کھانا کھا کر اپنے اپنے کمرے کی راہ لیتے۔ زیان کی کالج سے گھر واپسی پہ کوئی بھی باہر نہ نکلتا، سوائے بوا کے۔ وہ ایک ماں کی طرح اس کا خیال رکھتیں اور ایک ایک چیز کی فکر کرتیں۔ عرصہ دراز سے اس گھر میں تھیں، سو مکینوں کے مزاج سے واقف تھیں۔

زیان نے بیگ ٹیبل پہ رکھا، پاؤں جرابوں اور شوز کی قید سے آزاد کیے۔ موسم میں خنکی تھی۔ اس نے لینن کا سوٹ الماری سے نکالا اور یونیفارم اتار کر وہی پہنا۔ کپڑے بدل کر وہ باہر ہی آرہی تھی جب بوا سے مڈبھیڑ ہوئی۔

"السلام علیکم بوا۔" زیان نے خوش گوار لہجہ میں کہا تو وہ نہال سی ہو گئیں۔ کتنے دن بعد انہوں نے آج اس کا ہلکا پھلکا موڈ دیکھا تھا۔ وہ اداس یا پژمردہ نظر نہیں آرہی تھی۔

"کیا بات ہے، آج بہت خوش نظر آرہی ہو بٹیا۔" انہوں نے محبت سے اسے تکتے ہوئے پوچھا۔

"بوا کل سے ہمارے کالج میں اسٹوڈنٹس ویک شروع ہو رہا ہے' میں نے بھی ایک ڈرامے میں حصہ لیا ہے۔ کل وہ ڈراما ہماری کلاس کالج اسٹیج پر ایکٹ کرے گی۔ سب میری بہت تعریف کر رہے ہیں۔ آپ کو کیا بتاؤں۔" وہ بے پناہ خوش تھی۔

"اچھا تو کل تم ڈرامے میں حصہ لوگی؟" اسے خوش دیکھ کر بوا بھی خوش تھیں۔

"بوا کل میں اپنی فرینڈز کے ساتھ کالج جاؤں گی ڈرائیور کے ساتھ نہیں۔"

"ہاں میں اسے بتادوں گی تم بے شک اپنی سہیلیوں کے ساتھ چلی جانا۔ اب تم آؤ ہاتھ منہ دھولو میں کھانا لا رہی ہوں۔"

"بوا آج مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"کیسے بھوک نہیں ہے' میں نے تمہاری پسند کی چیزیں بنائی ہیں۔" بوا نے پیار بھرا اصرار کیا۔

"رات کو کھالوں گی نا' ابھی ابھی بھوک نہیں ہے۔ آپ چائے کے ساتھ دو کباب فرائی کر دیں مجھے۔" بوا مایوس سی ہو گئیں تو ذیان سے رہا نہیں گیا' جھٹ چائے کا بول دیا۔

"میں ابھی لاتی ہوں۔" بوا کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔ وہ کچن میں گئیں تو ذیان پھر سے کل کے دن کے خیال میں ڈوب گئی' جب کل اسے اسٹیج پہ ڈراما ایکٹ کرنا تھا' اپنا رول ادا کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات سر پہ آگئی تھی اور نیند تھی کہ آنے کا نام نہ لے رہی تھی۔ کروٹیں لینے کے باوجود نیند کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ذیان بستر سے اٹھی اور کپڑوں کی الماری کے ساتھ مصروف ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اسے کھول چکی تھی۔ اوپر والے خانے میں ایک کالا شاپر رکھا تھا۔ ذیان نے ہاتھ بڑھا کر وہ شاپر اتارا۔ اندر شاپر میں امیر علی کا براؤن کرتا اور سفید شلوار تھی۔ ایک چھوٹے لفافے میں مونچھیں تھیں ساتھ ہی استعمال کے عام چپل بھی تھے' جو سائز میں اس کے نرم و نازک پاؤں سے تھوڑے زیادہ تھے۔ اس نے یہ ہی سوٹ پہن کر اور نقلی مونچھیں لگا کر ریہرسل کی تھی اور سب ٹیچرز ساتھی طالبات سے خوب داد وصول کی تھی۔ آواز بدلنے میں اس کا کافی تجربہ ہو گیا تھا۔ یہ ہی وجہ ہے جب وہ اپنے مکالمے بول رہی تھی تو بالکل بھی نہیں لگ رہا تھا کہ یہ آواز کسی لڑکی کی ہے۔ بالکل مردانہ آواز محسوس ہو رہی تھی۔

ذیان نے شاپر بستر پہ اپنے سرہانے رکھ لیا۔ لائٹ بند کر کے وہ پھر سے بستر پر دراز ہو گئی۔ اس بار نیند کے مہربان ہونے میں دیر نہیں لگی تھی۔

صبح اس کی آنکھ معمول سے پہلے کھولی' لیکن اس کے لیے یہ مناسب وقت تھا۔ وہ دوبارہ سوئی نہیں۔ باتھ روم میں جا کر کپڑے تبدیل کیے۔ اب اس کے جسم پہ براؤن مردانہ کرتا اور سفید شلوار تھی۔ کرتا بہت کھلا اور شلوار لمبی تھی۔ شلوار اس نے ٹخنے والی جگہ سے موڑ کر اندر کر لی۔ اب اس کی لمبائی اتنی زیادہ نہیں لگ رہی تھی مگر کرتا گھٹنوں تک تھا۔ یہ بات اس کے حق میں جا رہی تھی' کیونکہ کھلے کرتے نے اس کے جسمانی نشیب و فراز کو کافی حد تک چھپا لیا تھا۔ ویسے بھی تو وہ دبلی پتلی سی تھی۔

اب بالوں کا مسئلہ تھا۔ ذیان کے بال لمبے کمر سے نیچے تک جا رہے تھے۔ اس نے موڑ کر بل دے کر چٹیا سی بنائی۔ پھر اسی چٹیا کو بل دے کر سر کے گرد گولائی میں لپیٹ کر سر کے بالوں پہ مضبوطی سے ڈھیر سی پنیں لگا دیں۔ اب بالوں کا آسانی سے کھلنا کافی مشکل تھا۔ پھر ذیان نے اپنی سفید چادر نکالی' اسے لمبائی میں تہ لگا کر درمیانے سائز کے دوپٹے کی شکل دی۔ اب اسی چادر نما دوپٹے کو اس نے سر کے گرد پگڑی کی صورت میں لپیٹ دیا۔ اب اس کے سر کے بال ماتھے کے اوپر والا حصہ پگڑی میں چھپ گیا تھا۔ کانوں میں پہنی گئی چھوٹی چھوٹی بالیاں وہ رات کو ہی نکال چکی تھی۔ باقی کسی قسم کی جیولری وہ پہنتی ہی نہیں تھی۔ ہاں کلائی میں ایک موٹا سا کڑا خاص طور پہ پہنا تھا' جو لڑکے عام طور پہ پہنتے ہیں۔

ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کے ناخن وہ کاٹ چکی تھی۔ تیار ہونے کے بعد اس نے خود کو آئینے میں دیکھا تو ایک ثانیے کے لیے پہچان ہی نہیں پائی کہ آئینے میں نظر آنے والی صورت اسی کی ہے۔ مونچھیں لگانے سے رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ اب کہیں سے بھی وہ لڑکی نہیں لگ رہی تھی۔ بلکہ دبلا پتلا نوعمر لڑکا نظر آ رہی تھی۔

ڈھیلے ڈھالے کرتے اور نقلی مونچھوں کے اضافے نے بہت کچھ چھپا لیا تھا۔ وہ اپنے بہروپ سے پوری طرح مطمئن تھی۔ بس گھر سے نکلنے کا مرحلہ باقی تھا۔

بوا کو اس نے رات میں ہی کہہ دیا تھا کہ صبح وہ ناشتا نہیں کرے گی نہ ڈرائیور کے ساتھ کالج جائے گی۔ چھ سات دن سے وہ ڈرائیور کے ساتھ کالج جا رہی تھی' ورنہ پہلے وین اسے کالج چھوڑتی اور گھر واپس لاتی تھی۔ جب سے نیا ڈرائیور آیا تھا' تب سے وہ اس کے ساتھ جاتی تھی۔

پر آج ڈرائیور کے ساتھ کالج جانا اس کے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ صبح کے سات بجتے ہی زیان نے اپنے کمرے کا دروازہ ذرا سا کھول کر خود کو چھپے کیے باہر جھانکا' کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ رابیل' مناہل اور آفاق تینوں آٹھ بجے ڈرائیور کے ساتھ گھر سے نکلتے۔ زیان بھی ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ وہ سب سے آخر میں زیان کو کالج چھوڑتا۔ پر آج زیان نے پروگرام بدل لیا تھا۔

بوا اٹھ چکی تھیں اور ناشتے کی تیاری میں لگی تھیں۔ ان کے ساتھ مدد کروانے کے لیے ثمینہ بھی تھی۔ گویا زیان کے لیے میدان صاف تھا۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل پہ پڑی امیر علی کی مردانہ ریسٹ واچ اٹھا کر اپنی کلائی پہ باندھی یہ قیمتی مردانہ گھڑی اس کی کلائی میں کافی ڈھیلی تھی۔ پر زیان کو غنیمت لگ رہی تھی۔ امیر علی کی یہ گھڑی کافی پرانی تھی۔ کچھ دن پہلے ہی زیان کو دراز میں سب سے نچلے حصے میں پڑی نظر آئی تو اس نے اٹھا کر اپنے کمرے میں رکھ دی۔ یہ ریسٹ واچ اس مردانہ بہروپ پہ بہت کام آ رہی تھی جو زیان نے اس وقت دھارا ہوا تھا۔

پاؤں میں ناپ سے قدرے بڑے سلیپر پہن کر اس نے آخری بار آئینے میں خود کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھا۔ بہروپ مکمل تھا۔ اس نے مطمئن ہو کر گھر سے نکلنے سے قبل ایک بار پھر باہر کا جائزہ لیا۔ کچن اس کے بیڈ روم کے مخالف سمت میں قدرے الگ جگہ بنا ہوا تھا۔ وہ اگر اپنے کمرے سے نکل کر بیرونی گیٹ تک جاتی تو کسی کی بھی نظروں میں نہ آتی کیونکہ بوا اور ثمینہ کچن میں اپنے کام میں لگی ہوئی تھیں۔ زرینہ بیگم نو بجے بے دار ہو کر ناشتا کرتیں۔ تینوں بچے اسکول کے لیے تیار ہو رہے تھے' جبکہ ڈرائیور اپنے کوارٹر میں تھا۔ فی الحال کوئی اور نہیں تھا جس کی نظر زیان پہ پڑتی۔ اس نے آہستگی سے دروازہ کھول کر کمرے سے باہر پہلا قدم رکھا اور پھر تقریباً" بھاگنے والے انداز میں کمرے سے گیٹ تک کا فاصلہ طے کیا۔ گیٹ سے باہر کوئی ذی روح نہ نہیں آ رہا تھا۔

اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ سرمستی کا احساس رگ و پے میں بھر چکا تھا۔ اسے پہچانا نہیں گیا۔ وہ نئے روپ میں قبول کی جا چکی ہے۔ گویا اس نے ڈرامے کے لیے جو مردانہ روپ دھارا تھا وہ سو فیصد کامیاب تھا۔ بہروپ مکمل تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس کی چال میں اور بھی اعتماد آ گیا تھا۔ وہ ٹہلنے کے انداز میں آرام سے چلنے لگی۔ کچھ آگے چند قدموں کے فاصلے پہ ایک مارکیٹ تھی۔ زیادہ تر دکانیں بند تھیں۔ ایک آدھ ہی کھلی تھی۔ دکانوں سے آگے کنارے پہ کھڑے دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ زیان نے فوراً" ایک فیصلہ کیا اور عمل بھی کر ڈالا۔ وہ ان دو آدمیوں کے پاس پہنچ گئی۔

"بھائی جان پی سی او کدھر ہے؟" اس نے لہجے میں حتی الامکان اکھڑپن سمونے کی کوشش کی۔ وہ اچانک ان کے سامنے آ گئی تھی۔ دونوں اپنی اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ جب دبلے پتلے لڑکے نے انہیں مخاطب کیا۔ وہ منتظر نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ موٹی موٹی مونچھوں کے برعکس اس کے چہرے پہ بڑی

ملاحت تھی۔ مونچھیں کسی طرح بھی اس کی پوری شخصیت کے ساتھ میل نہیں کھا رہی تھیں۔

دونوں آدمیوں میں سے ایک نے بڑے غور سے اس کی سمت دیکھا۔ اس کا رنگ سانولا، جسم مضبوط اور آنکھوں میں سرخی تھی، تیر چھیدتی نگاہ تھی اس کی۔

"یہاں کوئی پی سی او نہیں ہے۔ ہمارے گھر چلو پاس ہی ہے، فون کرلینا ساتھ دو چار باتیں کریں گے۔ چائے پانی بھی پی لینا۔ ویسے اس شہر کے لگتے نہیں ہو۔"

دوسرے آدمی نے آفر کی۔ یہ پہلے کی نسبت کالا اور بھاری ڈیل ڈول کا مالک تھا۔ چہرے پہ چیچک کے داغ تھے جو اس کی بدنمائی میں اور بھی اضافہ کررہے تھے۔ پہلے والے آدمی نے زیان کے پاؤں میں موجود اس کے سائز بڑے جوتوں کو معنی خیز چبھتی نگاہوں سے دیکھا اور ساتھ ہی دوسرے آدمی کو ہاتھ سے کوئی اشارہ کیا۔ جسے زیان بالکل بھی نہیں سمجھ پائی۔ دونوں اب زیان کے نرم و نازک گلابی پاؤں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے آپس میں نگاہوں کی زبان میں کوئی بات کی۔ زیان کے دل میں خدشات کا اژدہام زور و شور سے بجنے لگا۔

"نہیں بھائی جان! میں آگے جاکر کہیں اور سے فون کرلوں گا۔" ان دونوں مردوں کی ہوس ناک نگاہوں کو زیان نے عورت کی فطری حس کی وجہ سے فورا" پڑھ لیا۔ وہ جلد از جلد ان سے دور ہونا چاہ رہی تھی۔ لیکن ان کے تیور ہرگز ایسے نہیں تھے جو آسانی سے اسے جانے دیتے۔ ایک زیان کے دائیں اور دوسرا بائیں جانب آکر کھڑا ہوگیا۔

"کیا چکنی ملائی ہونڈا ہے تو یار... لگتا ہے اوپر والے نے لڑکی بناتے بناتے بالکل آخری وقت میں تمہیں لڑکا بنا دیا ہے۔" ایک نے زیان کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے یہ جملہ سو فیصد اسی کے بارے میں کہا تھا۔ اپنے کندھے پہ پڑا ہاتھ زیان کو کسی سانپ کی مانند زہریلا محسوس ہوا۔ اس نے تیزی سے اس آدمی کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹاتے قدم آگے بڑھائے۔ وہ دونوں بھی اس کے ساتھ چلنا شروع ہوگئے۔ زیان کی کوشش تھی جلد از جلد ان سے آگے نکل جائے۔ اگلے موڑ پہ پی سی او نما کھوکھا تھا۔ وہ سوچے سمجھے بغیر اس کی سمت بڑھی۔

اندر دو، تین آدمی تھے اس کے دل کو ڈھارس سی ہوئی۔ زیان کو کھوکھے کی سمت لپکتا دیکھ کر وہ دونوں ادھر ہی رک گئے۔ تاہم زیان اب بھی ان کی نگاہوں کا مرکز تھی۔ "میں نوں فون کرنا اے" (مجھے فون کرنا ہے) زیان نے اپنی طرف سے بڑی گاڑھی پنجابی بولی۔

کھوکھے کے باریش مالک نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور سامنے پڑا فون سیٹ اس کی سمت کھسکایا۔ زیان نے اعتماد سے اپنی ایک کلاس فیلو کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے کسی ملازم نے فون اٹینڈ کیا۔

"السلام علیکم طارق گل کروا آں (السلام علیکم! طارق بات کررہا ہوں۔) وہ دوسری طرف کی سنے بغیر شروع ہوگئی۔" باریش آدمی نے اپنے سامنے کھڑے دوسرے گاہک کو دیکھا اور پھر باتیں کرتی زیان کو۔

"اللہ کی شان یہ نرم و نازک نوجوان بالکل لڑکی لگ رہا ہے۔" باریش شخص نے یہ جملہ اپنے سامنے کھڑے دوسرے آدمی سے زیان کی سمت اشارہ کرتے ہوئے ادا کیا۔ وہ فون پہ اپنی ہی ہانک رہی تھی۔ ورنہ سن کر پریشان ہوجاتی۔ بات ختم کرکے اس نے مطلوبہ رقم باریش آدمی کے ہاتھ پہ رکھی اور آگے کی سمت بڑھ گئی۔

جوں ہی وہ کھوکھے سے باہر آئی وہ دونوں آدمی بھی فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چل پڑے۔ ان کی نظر زیان پہ تھی زیان اس بات سے بے خبر سوزوکیوں کے اڈے کی طرف جارہی تھی۔ وہاں بڑی چہل پہل تھی۔ پاس ہی مین روڈ تھا۔ اسکول و کالج، دفاتر میں آنے جانے والے اپنی اپنی گاڑی کے انتظار میں تھے۔ زیان کو فورا" اپنے کالج کے روٹ کی سوزوکی مل گئی اور وہ اس میں سوار ہوگئی۔ اس کے ساتھ وہ دونوں آدمی بھی سوزوکی میں سوار ہوگئے۔ زیان سے پہلے دو آدمی گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لیڈیز والی ساری سیٹیں خالی تھی۔ زیان اس طرف بیٹھی تھی۔ ذرا دیر بعد حواس قابو میں

آتے تو اس کی نگاہ فوراً" ان ہی دو آدمیوں پہ پڑی۔ وہ زیان کو ہی دیکھ رہے تھے۔ غلیظ' خباثت بھری نگاہیں' جو ان کے ہوس ناک ارادوں کا پتا دے رہی تھی۔ وہ کسی طرح بھی اس کا پیچھا چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ اگلے اسٹاپ سے عورتیں سوار ہوئیں تو کلینر نے زیان کو مردوں والے حصے کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

"بھائی وہاں بیٹھو' یہ لیڈیز سیٹیں ہیں۔" ناچار زیان مردوں والے حصے کی آخری سیٹ پہ بیٹھ گئی۔ بھاری ڈیل ڈول رکھنے والے آدمی کا کندھا اس کے کندھے سے ٹکرا رہا تھا۔ وہ جان کر مزید اس کے قریب ہوا تو زیان بالکل کونے کی طرف ہو گئی۔ پہلی بار اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ سوزوکی دوبارہ چلنے لگی۔ آگے جا کر زیان کی دو کلاس فیلوز سوار ہوئیں تو اس کی جان میں جان آئی۔ وہ جھٹ اپنی سیٹ سے اٹھی اور ان کے برابر بیٹھ گئی۔

"اندھے ہو کیا نظر نہیں آتا۔ یہ عورتوں کی سیٹ ہے۔" اس کی کلاس فیلو سدرہ دھاڑ سے مشابہہ آواز میں غرائی۔ زیان کے چہرے پہ پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ کیونکہ سب مرد اسے دیکھ رہے تھے۔ کیا خبر سدرہ کے شور مچانے پہ اس کی ٹھکائی ہی نہ شروع کر دیتے۔

"سدرہ یہ میں ہوں زیان۔" وہ سرگوشی سے مشابہ آواز میں بولی۔ سدرہ نے اسے غور سے دیکھا' پل بھر کے حیران ہوئی' وہ اسے پہچان چکی تھی۔ آواز سو فیصد زیان کی تھی۔ کیونکہ وہ اصلی آواز میں بولی تھی۔ غور سے دیکھنے پہ نقوش بھی مانوس تھے۔ مگر زیان کی یہ بے تکی حرکت اور گیٹ اپ اسے بہت الجھا رہا تھا۔ پر اس وقت وہ سوال کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ زیان نے ہونٹوں پہ انگلی رکھتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

گاڑی میں موجود سب مردوں کی نگاہیں ان ہی کا طواف کر رہی تھی۔ وہ دبلا پتلا نوعمر لڑکا جس کے چہرے پہ موجود مونچھیں عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔ ان دو لڑکیوں کے ساتھ بیٹھا تھا اور وہ لڑکیاں اب شور بھی نہیں کر رہی تھیں۔ جو کہ خلاف عقل تھا۔ سب اپنی عقل کے مطابق قیاس کے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ سانولا کالا آدمی اور اس کا دوسرا ساتھی مایوس ہو چکے تھے کہ زوردار لونڈا ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اس کم بخت کا آنکھ مٹکا تو ایک ایک نہیں دو دو لڑکیوں کے ساتھ تھا۔

کالج گیٹ کے سامنے جوں ہی سوزوکی رکی تو زیان سب سے چھلانگ مار کر اتری۔ تیزی سے اترنے کی وجہ سے اس کی مونچھ کی ایک سائیڈ جلد سے الگ ہو کر اس کے ہونٹوں پہ جھک آئی تھی۔ زیان غڑاپ سے کالج گیٹ سے اندر غائب ہو چکی تھی۔ سوزوکی میں موجود سب لوگ ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔ ان دو آدمیوں کی حالت دیکھنے والی ہو رہی تھی' جو زیان کا پیچھا کرتے یہاں تک پہنچے تھے۔

☼ ☼ ☼

گیٹ سے اندر چوکیدار زیان سے سوالی جواب کے لیے تیار تھا۔ سدرہ اور نائلہ پیچھے پیچھے تھی۔ چوکیدار سے کلیئر ہونے کے بعد تینوں آگے بڑھیں۔

"میں نے تو صرف ایڈونچر میں آکر ایسا کیا کہ دیکھوں اس روپ میں کوئی مجھے پہچانتا ہے کہ نہیں۔ سب سے چھپ کر گھر سے نکلی ڈرائیور کو بھی منع کر دیا کہ دوستوں کے ساتھ جاؤں گی۔" وہ انہیں اپنی بے وقوفی دوسرے الفاظ میں ایڈونچر کے بارے میں بتا رہی تھی۔

"تمہاری اس بے وقوفی کی وجہ سے تمہیں اگر کچھ ہو جاتا تو۔" نائلہ غصے سے بول رہی تھی۔

"ہوا تو کچھ نہیں میں بس ان دو آدمیوں کی وجہ سے پریشان ہو گئی تھی۔ لیکن اب ٹھیک ہوں۔" وہ اندرونی خوف و بزدلی پہ قابو پاتے ہوئے (جس سے کچھ دیر پیشتر وہ دوچار ہوئی تھی۔) ہنس دی۔ پر سدرہ اور نائلہ دونوں کو اس کی بات پہ یقین نہیں آیا۔

"اس وقت تو ہوائیاں اڑ رہی تھیں چہرے پہ۔ کیسے گاڑی میں میرے ساتھ چپکی جا رہی تھی۔"

سدرہ چہک کر بولی۔

"اچھا جو بھی ہے یہ بتاؤ لگ رہا ہوں نہ لڑکا؟" ان کے سامنے آکر ذوین اسٹائل سے کھڑی ہو گئی۔ آس پاس سے گزرنے والی طالبات بھی رک کر انہیں دیکھنے لگ گئی تھیں۔

"ہاں لگ تو رہے ہو نرم نرم سے لڑکے۔" سدرہ قدرے چہک کر عاشقانہ انداز میں بولی۔ ذوین نے جھینپ کر اسے ایک دھپ لگائی۔

"مجھے تمہاری اس حماقت پہ ابھی تک یقین نہیں آرہا ہے۔ صرف اس شوق و تجسس میں کہ اس گیٹ اپ میں تم لڑکا لگتی ہو کہ نہیں، تم صبح سویرے گھر سے ایسے نکل آئیں۔ نتائج تک کی پروا نہیں کی۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" نائلہ اسے سمجھانے کے موڈ میں تھی۔

"آئندہ ایسے نہیں کروں گی۔ یہ تو ڈرامے کی وجہ سے اچانک میرے دل میں یہ عجیب خیال آیا۔"

"عجیب نہیں واہیات نامعقول خیال کہو۔" سدرہ نے تیزی سے کہا۔

"شکر کرو بچ گئی ہو۔" نائلہ نے ایک بار پھر اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ ذوین نے جان چھڑانے والے انداز میں ان کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

تینوں ہال میں پہنچ چکی تھیں۔ جہاں سب طالبات اور ٹیچرز جمع تھیں۔ ذوین ڈرامے کی ٹیم کی طرف بڑھ گئی۔

⁂ ⁂ ⁂

احمد سیال کھانا کھا رہے تھے۔ رنم انہیں راعنہ کی شادی کی روداد سنا رہی تھی۔ "پپا! راعنہ کے ان لاز نے کوئی ڈیمانڈ نہیں کی ہے اور نہ کوئی جہیز لیں گے وہ لوگ۔"

"اچھا۔" احمد سیال کو سن کر حیرانی نہیں ہوئی۔ وہ نارمل موڈ میں تھے۔ رنم کا چہرہ بجھ سا گیا۔ اس نے اپنے تئیں اتنی زبردست عجیب و غریب شاکڈ کرنے والی بات بتائی تھی، لیکن پاپا نے کوئی خاص رسپانس ہی نہیں دیا۔

"تم کب تک فری ہو گی؟" احمد سیال نے کھانا کھاتے کھاتے سوال کیا۔ "کیوں پاپا؟"

"تم راعنہ کی شادی کی مصروفیت سے فری ہو جاؤ تو انفارم کرنا۔" وہ مبہم سے انداز میں بولے۔ "کیوں پاپا؟" اس نے پھر سوال کیا۔

"میں نے تمہیں بتایا تو تھا میرے دوست جہانگیر ملک نے تمہارے لیے اپنے بیٹے کا پروپوزل دیا ہے۔ تمہارے ایگزام کے دوران وہ آیا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد آرہا ہے آپ نے ذکر کیا تھا۔" اس نے بھی احمد سیال کے انداز میں کہا۔

"میں ملک جہانگیر کی فیملی کو بلواتا ہوں کسی دن، تم بھی مل لو۔" وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

رنم نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا تو انہوں نے سیدھے اسٹڈی روم کا رخ کیا۔ رنم ادھر ہی بیٹھی دل ہی دل میں پپا سے خفا ہو رہی تھی۔ پر ابھی اس کے پاس لمبی چوڑی ناراضی دکھانے کا ٹائم نہیں تھا، کیونکہ کل راعنہ اور شہریار کا ولیمہ تھا۔ اسے تیاری بھی کرنی تھی۔ اس موضوع پہ پاپا سے بعد میں بھی بات کی جاسکتی تھی۔

⁂ ⁂ ⁂

ولیمہ پہ شہریار نے بہت زیادہ مہمانوں کو انوائیٹ نہیں کیا تھا۔ راعنہ کی فیملی اور ان دونوں کے مشترکہ رشتہ دار اور کچھ دوست احباب تھے۔ کھانے میں چار ڈشز تھیں۔ راعنہ کے ولیمہ کا جوڑا بہت نفیس پر زیادہ قیمتی نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ بے پناہ خوش نظر آرہی تھی۔ راعنہ کے گھر والے بھی مسرور تھے۔ شہریار کے کسی بھی عمل پہ انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بلکہ راعنہ کے پپا بے پناہ خوش تھے کہ انہیں شہریار کی صورت میں اپنی بیٹی کے لیے خوددار، غیرت مند شوہر ملا ہے۔ وہ سب دوست راعنہ اور شہریار کا گھر دیکھنے بھی گئے۔ یہ گھر کسی پوش علاقے میں نہیں تھا۔

پر صاف ستھری کالونی میں تھا۔ چھوٹا سا متناسب اور موزوں فرنیچر سے آراستہ تین کمروں کا گھر راعنہ اور شہریار کی محبت کے وجود سے سج لیا تھا۔

رنم حیرانی سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔ شہریار کے پاس سیکنڈ ہینڈ گاڑی تھی۔ راعنہ کو شہریار کے ساتھ اس گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ذرہ بھر احساس کمتری نہیں تھا۔

"میری یہ لائف پاپا کے گھر کی لائف سے بالکل ڈیفرنٹ ہے۔" انہیں کھانے پینے کی سب چیزیں خود سرو کرتے ہوئے راعنہ خوشی سے بتا رہی تھی۔

"تم یہاں آرام سے رہ لوگی؟" رنم نے نگاہیں اس کے چہرے پہ نکادیں۔

"میں یہاں رہتے ہوئے بہت کمفرٹیبل فیل کررہی ہوں۔ پپا مجھے اور شہریار کو بہت کچھ دینا چاہ رہے تھے مگر شہریار عام مردوں کی طرح لالچی نہیں ہیں۔ ورنہ ہمارے طبقے میں اکثر شادیاں بزنس ڈیل ہوتی ہیں۔ پر ہماری شادی بزنس ڈیل نہیں ہے' رئیل شادی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے تحمل سے رنم کے جواب دے رہی تھی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو ہمارے سوشل سرکل میں شادی بزنس ڈیل ہی ہوتی ہے۔" اس نے تائید کی۔

"تمہارے لیے بھی تو ایک جاگیر دار فیملی سے رشتہ آیا ہے۔ بہت اونچا ہاتھ مارا ہے تم نے۔" کومل کو یاد آیا۔ رنم کے ماتھے پہ بل پڑ گئے۔

"میری شادی پپا میری مرضی سے کریں گے۔" وہ غصے سے بولی۔ پتا نہیں کومل کے عام سے جملے پہ وہ کیوں بانجھ ہوگئی تھی۔

"ہاں تمہارے پپا تمہاری شادی اپنی مرضی سے اپنے کسی دوست کے بیٹے سے کریں گے۔ جو ان کی طرح بزنس مین ہوگا بہت امیر۔" کومل اسے تنگ کررہی تھی۔ رنم ناراض ہوکر وہاں سے اٹھ آئی۔

☆ ☆ ☆

رنم' احمد سیال کے پاس بیٹھی پورے ایک گھنٹے سے مسلسل بول رہی تھی۔ "پاپا' راعنہ کے ہزبینڈ نے کچھ نہیں لیا ہے نہ جہیز' نہ گاڑی' نہ بنگلہ' نہ بینک بیلنس۔ شہریار بھائی نے خود راعنہ کے لیے شادی کا جوڑا اور جیولری خریدی۔ وہ شہریار بھائی کے لائے ہوئے جوڑے میں ہی اپنے پاپا کے گھر سے رخصت ہوئی۔ پاپا میں بہت حیران ہوں' پر یہ سب مجھے بہت اچھا لگا ہے۔" احمد سیال اس کی حیرانی سی چمکیلی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے مسکرائے۔ "راعنہ کا شوہر خوددار اور سیلف میڈ ہے' اسے اپنے زور بازو پہ بھروسا ہوگا' تب ہی اس نے کسی قسم کی ہیلپ نہیں لی ہے۔" احمد سیال نے تبصرہ کیا۔ "اور ہاں وہ جہانگیر کے گھر والے آنا چاہ رہے ہیں تمہیں دیکھنے۔" انہیں اچانک یاد آیا۔

"پپا میری خواہش ہے' میری شادی جس شخص کے ساتھ ہو۔ وہ شہریار بھائی کی طرح خوددار ہو۔ کسی قسم کی ہیلپ نہ لے سب کچھ اپنی محنت سے بنائے۔" رنم اپنی دھن میں بول رہی تھی۔ اس نے احمد سیال کی بات سنی ہی نہیں۔

"میں اتنی زیادہ دولت و جائیداد کا کیا کروں گا رنم۔ اگر تم کچھ لیے بغیر میرے گھر سے رخصت ہوجاؤ گی۔" احمد سیال کو اپنی لاڈلی کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔

"پاپا آپ جہاں میری شادی کریں گے' کیا ان کے پاس گھر' دولت' جائیداد یہ سب کچھ نہیں ہوگا؟" وہ اچانک سنجیدہ ہوئی۔

"میری جان۔ بے شک سب کچھ ہوگا' لیکن میں اپنی اکلوتی اولاد کو کسی بھی چیز سے محروم نہیں کرسکتا۔ میں تمہاری شادی دھوم دھام سے کروں گا۔ میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ میں تمہیں اس گھر سے خالی ہاتھ رخصت نہیں کروں گا' ایسا جہیز دوں گا کہ دنیا دیکھے گی اور تمہاری شادی ہمارے سوشل سرکل کی شان دار اور یادگار شادی ہوگی۔" احمد سیال باتوں باتوں میں بہت دور نکل گئے تھے۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے' پپا مجھے شہریار بھائی جیسا لائف پارٹنر چاہیے بس۔" وہ جھنجلا گئی۔

"تمہاری سوچ بچوں والی ہے۔" وہ مسکرائے۔ احمد

سیال اسے بچوں کی طرح ہی ٹریٹ کر رہے تھے۔

"پاپا میں سیریس ہوں۔" وہ اپنی بات پہ زور دے کر بولی۔

"اگلی وے میں ملک جہانگیر کے گھر والوں کو انوائیٹ کروں گا۔ تم ان کے بیٹے کو دیکھ کے ٹیسٹا مل لینا۔" احمد سیال نے اس کی بات کو اہمیت نہیں دی۔ رنم کو بے طرح غصہ آیا۔

"میں کسی سے نہیں ملوں گی پاپا۔" وہ دھم دھم کرتی وہاں سے چلی آئی۔ احمد سیال اس دروازے کو دیکھ رہے تھے، جہاں سے وہ نکل کر ابھی ابھی گئی تھی۔ وہ اس کے غصے کا سبب تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ جب سے وہ راعنہ کی شادی اٹینڈ کر کے آئی تھی۔ تب سے اس کے پاس ایک ہی موضوع تھا کہ شہریار نے سسرال والوں سے اپنی کم حیثیتی کے باوجود کسی قسم کی مالی امداد قبول نہیں کی ہے۔ وہ اس پہ غور کر رہے تھے۔ رنم نے ملک جہانگیر کی فیملی سے ملاقات کرنے کے ضمن میں کسی قسم کی رضامندی نہیں دی تھی۔

☆ ☆ ☆
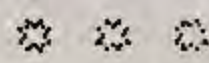
ملک ارسلان شہر گئے ہوئے تھے۔ عنیزہ کچھ دیر افشاں بیگم کے پاس بیٹھی رہیں۔ ویسے بھی ارسلان کے بغیر ان کا جی گھر میں گھبراتا اس لیے ادھر آ جاتیں۔ شام اپنے پر پھیلانا شروع کر چکی تھی، جب انہوں نے افشاں بھابھی سے اجازت چاہی۔

حویلی میں سناٹا طاری تھا۔ ملازم کام نپٹا کر اپنے اپنے کوارٹرز میں تھے جو حویلی کے مشرقی حصے میں بنائے گئے تھے۔ گھر میں اس وقت دو خاتون ملازمائیں تھیں جو عنیزہ کو دیکھ کر فوراً ہی متحرک نظر آنے لگیں۔ عنیزہ انہیں نظر انداز کرتی اپنے بیڈ روم میں چلی آئیں۔ انہوں نے دروازہ لاک کر کے اپنی دیوار گیر الماری کھولی۔ سب سے نچلے حصے میں ایک خفیہ خانہ تھا۔ عنیزہ نے اسے اپنی طرف کھینچا اور چابی گھمائی۔ لاک کھل چکا تھا۔ اندر ایک پیکٹ موجود تھا۔ عنیزہ نے پیکٹ اٹھا کر باہر بیڈ پہ رکھا۔ اس پیکٹ کی حفاظت اٹھارہ سالوں سے وہ قیمتی خزانے کی طرح کرتی آ رہی تھیں۔ نرم آرام ہاتھوں سے انہوں نے پیکٹ کھول کر اندر موجود اشیا باہر نکالنی شروع کیں۔ بیڈ پہ ننھے منے کپڑوں، بے بی پاؤڈر، آئل سوپ اور دو عدد چھوٹے چھوٹے شوز کے جوڑوں کا چھوٹا سا ڈھیر لگ گیا تھا۔ سب چیزیں پرانی اور استعمال شدہ تھیں۔ بے بی آئل بوتل میں آدھے سے کم بچا تھا۔ پاؤڈر کا ڈبا بھی تقریباً خالی تھا۔ چھوٹے چھوٹے شوز قدرے میلے تھے۔ پرانے کپڑوں، فراکس، نیکر کا رنگ اتنے سالوں میں مدھم پڑ گیا تھا۔ گتے کے ڈبے میں ایک فیڈر بھی تھا۔ کچھ کھلونے بھی تھے۔

عنیزہ نے اس چھوٹے سے ڈھیر کو سمیٹ کر سینے سے لگا لیا۔ آنسوؤں کا جھرنا اس کی آنکھوں سے پھوٹ پڑا۔ وہ ایک ایک چیز کو بار بار چھو رہی تھیں، چوم رہی تھیں، سونگھ کر کچھ محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جیسے ان کپڑوں اور بے جان کھلونوں میں کوئی زندہ وجود ہو، ان کا لمس ہو۔ وہ اب سسک سسک کر رو رہی تھی۔ نڈھال انداز میں روتے ہوئے وہ بیڈ کے ہی ایک کونے میں گٹھڑی بن کر لیٹ گئی۔ اس عالم میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ دل کا غبار کم ہوا تو انہوں نے اٹھ کر سب چیزیں سمیٹیں اور پہلے کی طرح ایک پیکٹ بنایا۔ الماری میں رکھ کر پہلے کی طرح الماری لاک کر کے چابی اپنی مخصوص جگہ پہ رکھ دی۔ اسی اثنا میں عشاء کی اذان ہونا شروع ہو گئی۔ وہ وضو کر کے اپنے رب کے حضور جھک گئیں۔ دل کا سارا درد آنسوؤں میں بہہ رہا تھا۔ یہاں انہیں دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ جی بھر کر اپنے رب سے حال دل کہہ سکتی تھیں۔ فریاد کر سکتیں۔ دنیا کے دربار میں اس کی شنوائی نہیں تھی۔ پر وہ جس کے دربار میں تھیں وہ پاک ہستی لامحدود اختیار کی مالک تھی۔

"میرے اللہ میرے اللہ۔ میرے مالک تو خوب جانتا ہے، خوب سمجھتا ہے۔ مجھ پہ میری طاقت سے زیادہ بوجھ مت ڈالو۔ میں تھک گئی ہوں اس آبلہ پائی

ہے۔ میرے مالک میری آزمائش ختم کردے مجھے شکر گزار بنا۔" روتے روتے وہ اپنی جملوں کی تکرار کررہی تھیں۔ "میرے مالک، میں تھک گئی ہوں، اب مجھے اس اذیت، اس کرب سے نجات دلادے۔" اپنی فریاد رب کے حضور پہنچا کر انہیں قدرے سکون حاصل ہوا۔

* * *

ملک ارسلان رات گھر واپس آئے تو عنیزہ بخار میں تپ رہی تھیں۔ بہت زیادہ رونے اور ٹینشن کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہوئی تھی۔ انہوں نے ان کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا۔

"میں تمہیں اچھا خاصا چھوڑ کر گیا تھا کیا ہوا ہے تمہیں؟" وہ ان کی سوجی متورم آنکھیں دیکھ رہے تھے۔

"بخار ہوگیا ہے تھوڑا اور تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائیں۔

"صرف بخار نہیں ہوا، تمہاری طبیعت اچھی خاصی خراب ہے اور تم روتی بھی رہی ہو، تمہیں پتا ہے تمہارا رونا میں برداشت نہیں کرسکتا۔"

"میں نہیں روئی ہوں۔" عنیزہ نے بے اختیار ان کی بات کاٹی۔

"میں تمہارے مزاج کے ہر رنگ سے واقف ہوں۔ محبت نہیں عشق کیا ہے تم سے۔ عیاں ہو تم پوری کی پوری۔" وہ تپتی اور نروٹھے پن سے اسے دیکھ رہے تھے۔ عنیزہ کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو اچانک پھیلے اور وہ ارسلان کے سینے سے لگ گئیں۔ "میں آج بہت اذیت میں ہوں۔" وہ بری طرح رو رہی تھیں۔ ارسلان نے انہیں اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

"تم ماضی کو بھول کیوں نہیں جاتیں، ماضی کی اذیت کی وجہ سے مجھے اپنے آپ کو کیوں نظر انداز کرتی ہو۔ تمہارا ماضی دفن ہوگیا ہے۔ میں تمہارا فیوچر ہوں۔ اپنی آنے والی زندگی کے بارے میں سوچو۔ تمہیں مجھ پہ ترس نہیں آتا۔ تمہارے آنسو مجھے کتنی تکلیف دیتے ہیں، تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے۔" وہ اس کے آنسو صاف کررہے تھے۔ اسے بہلا رہے تھے۔ یہ سب باتیں وہ پچھلے اٹھارہ برس سے کرتے آرہے تھے۔ ہر بار عنیزہ خود کو سمیٹنے کا عہد کرتیں اور ہر بار بکھر جاتیں۔ اس ٹوٹی پھوٹی محبوب بیوی کو سمیٹنے کا ہنر ملک ارسلان کے ہی پاس تھا۔

"ملک صاحب میرے پاس آنے والی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں ہے۔ نہ کوئی خوشی، نہ امید، نہ روشنی کے جگنو، میں آپ کو ایک بچہ تک نہ دے سکی۔ میرے کرب کو آپ کیا سمجھ پائیں گے۔" وہ ایک بار پھر رونے لگیں۔ ملک ارسلان نے جگ سے پانی گلاس میں انڈیل کر انہیں پلایا۔

"میری محبت ہمیشہ تمہارے ساتھ ہے اور رہے گی۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ تم جس دن جان جاؤ گی اس دن اپنی قسمت پہ رشک کروگی۔ باقی ہماری اولاد نہیں ہے تو کیا ہوا، میں اس کے بغیر بھی تمہارے ساتھ بے پناہ خوش ہوں۔ میری زندگی میں تم ہو اور صرف تمہاری وجہ سے میں پوری زندگی ہنسی خوشی گزار سکتا ہوں۔ تم اکیلی نہیں ہو۔ میں ہمیشہ سے تمہارے ساتھ ہوں۔"

وہ ہمیشہ کی طرح اپنی محبت کے سہارے ان کے سب دکھ، سب کانٹے چنتے جارہے تھے۔ ملک ارسلان کی محبت کو عنیزہ کبھی بھی نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ وہ گہرے پرسکون سمندر کی مانند تھے۔ بہت دیر بعد ارسلان کی کوشش سے وہ نارمل ہوئیں۔

* * *

دو دن سے اس کی پاپا کے ساتھ کوئی بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ نہ اس نے ان کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ یہ اس کی طرف سے مکمل ناراضی کا اظہار تھا۔ احمد سیال ایک ڈیلی گیشن کے ساتھ مصروف تھے۔ اس لیے رتم کی خاموش ناراضی ان کے علم میں نہیں تھی۔ رتم فی الحال دو دن فری تھی، کیونکہ یونیورسٹی

سے چھٹی تھی۔ اس نے شام ڈھلتے ہی فراز کو کال کی۔

"میں تم سے ملنا چاہ رہی ہوں۔" اس نے کسی بھی سلام ودعا کے تکلفات میں پڑے بغیر تیزی سے کہا۔

"میں جم میں ہوں ایک گھنٹہ تک فارغ ہوں گا۔"

"مجھے تم سے ابھی ملنا ہے۔ مون لائٹ ریسٹورنٹ میں پہنچ جاؤ۔ میں پندرہ منٹ میں گھر سے نکل رہی ہوں۔" رنم ضدی انداز میں بولی۔

دوسری طرف موجود فراز گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اسے پتا تھا کہ اسے ابھی اور اسی وقت جم سے نکلنا ہوگا اور اگلے پندرہ سے بیس منٹ میں مون لائٹ ریسٹورنٹ جانا ہوگا۔ "او کے تم پہنچو میں بھی آرہا ہوں۔" فراز نے ہار ماننے والے انداز میں کہا۔

رنم کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ اسے پتا تھا کہ فراز اس کی بات ٹال نہیں سکتا۔ وہ گنگناتے ہوئے بال سنوارنے لگی۔

☆ ☆ ☆

فراز اس کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھا پوری سنجیدگی سے اس کی بات سن رہا تھا۔ رنم نے الف تا یے سب بتا دیا تھا۔ "پاپا نے کوئی رسپانس نہیں دیا' بلکہ الٹا کہا' تمہاری سوچ بچوں والی ہے۔ میں تمہیں دھوم دھام سے رخصت کروں گا۔ لیکن مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں چاہتی ہوں کہ راعنہ کی طرح میری شادی جس شخص سے ہو وہ جہیز کے نام پہ کچھ بھی میرے پاپا سے نہ لے۔ بس مجھے ایسے ہی قبول کرلے۔ مجھے جہیز لینا' بہت سا بینک بیلنس' کار' کوٹھی' بنگلہ' شادی کے گفٹ کی صورت میں لینا کسی صورت بھی منظور نہیں۔ پاپا کے فرینڈ بہت امیر ہیں' ظاہر ہے ان کا بیٹا بھی ویسا ہی ہوگا۔ انہیں بھلا کسی چیز کی کیا ضرورت ہے۔" وہ ایک ہی سانس میں تیز تیز بول رہی تھی۔ فراز نے ایک بار بھی اسے نہیں ٹوکا اور نہ ہی خود درمیان میں بولا۔ جب وہ خاموش ہوئی' تب فراز نے خاموشی توڑی۔

"میں سمجھ گیا ہوں تم کیا چاہتی ہو۔"

"رئیلی فراز تم اتنی جلدی سمجھ گئے ہو' میرے بیسٹ فرینڈ ہونا۔ پر پاپا میری بات کو کیوں اہمیت نہیں دے رہے ہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ تمہارے پاپا کے وہ دوست کب آرہے ہیں؟" فراز نے اس کی روہانسی صورت نظر انداز کرکے بالکل غیر متوقع سوال کیا۔

"میں نے پاپا کو کوئی رسپانس ہی نہیں دیا۔" وہ منہ بنا کے بولی۔

"ایسے تو کام نہیں چلے گا۔ کچھ نہ کچھ کرنا تو ہوگا۔" وہ پرسوچ لہجہ میں بولا۔

"سو سمپل میں ایسے انسان سے شادی ہی نہیں کروں گی جو مجھ سے ان سب چیزوں کے بغیر شادی نہیں کرے گا۔"

"اس کا مطلب ہے تم کسی مڈل کلاس نوجوان سے شادی کروگی؟"

"ہرگز اب ایسی بھی کوئی آفت نہیں آئی' میرا ایک اسٹینڈرڈ ہے۔ مجھے بس ایک ایسا انسان چاہیے جو شہروز بھائی کی طرح ہو۔" فراز اس بار اپنی مسکراہٹ نہیں روک سکا۔ اس نے مشکل سے اپنے قہقہے کا گلا گھونٹا تھا۔

"تم کیوں ہنس رہے ہو؟" رنم نے اسے گھور کر دیکھا۔

"مڈل کلاس نوجوان سے تم شادی کروگی نہیں' کیونکہ وہ تمہاری کلاس سے نہیں ہے اور تمہارے سوشل سرکل میں ایسا لڑکا ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا جو تمہارے پاپا کی سپورٹ سے فائدہ نہ اٹھائے۔ دولت دولت کو کھینچتی ہے اور جس کسی کی بھی شادی تمہارے ساتھ ہوگی۔ اسے تمہارے ساتھ ساتھ بہت ساری دولت بھی ملے گی۔" فراز نے حقیقت بیان کی تھی۔

"میں ایسے کسی بھی شخص سے شادی نہیں کروں گی۔" رنم کا انداز قطعی اور دو ٹوک تھا۔

"ویسے ایسا شخص تمہیں مل سکتا ہے۔" فراز خلا میں کسی غیر مرئی چیز کو دیکھ رہا تھا۔

"کہاں ملے گا ایسا شخص۔" رنم اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے

اچھل ہی تو پڑی۔

"کوئی ایسا شخص جو تم سے سچی بے پناہ محبت کرتا ہو۔ صرف ایسا شخص ہی تم سے تمہاری دولت کے بغیر شادی کر سکتا ہے۔" "اسے صرف تم سے محبت ہو' تمہاری یا تمہارے پاپا کی دولت سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔" وہ جیسے کھوئے کھوئے انداز میں بول رہا تھا۔

"ایسا تو کوئی بھی بندہ نہیں ہے جسے مجھ سے محبت ہو۔" رنم بہت سادگی اور مایوسی سے گویا ہوئی۔

"ایسا کرو کہ تم کوئی بندہ ڈھونڈو' جو تم سے سچی محبت کرے۔ ایک دن پھر اسے اپنے پاپا سے ملواؤ۔ آگے کے کام آسان ہو جائیں گے۔ وہ تم سے شادی کرلے گا۔ اپنے گھر لے جائے گا۔" جانے فراز نے یہ سب سنجیدگی سے کہا تھا یا اس سے مذاق کر رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی۔ "پلیز وے تم اپنے پاپا سے بات کرو۔" فراز کو اس کے چہرے پہ چھائی مایوسی ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

"میں تمہارا بیسٹ فرینڈ ہوں نا' میری بات مان لو۔ اپنی ضد سے باز آجاؤ۔ تمہارے پاپا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تم ان کی اکلوتی اولاد ہو' ہر چیز کی وارث ہو۔ ساری عمر انہوں نے جان لڑا کر اپنے بزنس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ اس ساری کامیابی کا دولت کا کیا فائدہ جب تم اپنی زندگی کو ہی آسان نہ بنا سکو۔ ہر چیز کو ٹھوکر مار دو' ان کی تو سب محنت اکارت جائے گی۔" فراز نے اچانک نیا پینترا بدلا تو رنم سے ہضم نہیں ہوا۔

"فراز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ۔"

"میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہر نئی چیز نیا منصوبہ تمہیں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ تمہیں لگے بندھے فرسودہ راستوں پہ چلنے سے نفرت ہے۔ تمہیں نئے نئے کام کرنے کا شوق ہے' کچھ ایسا کہ سب حیران ہو جائیں۔ یہ سب خیالات تمہارے ذہن میں راعنہ کی شادی کے بعد آئے ہیں۔ کیونکہ اپنے سرکل میں تم نے راعنہ کے ہزبینڈ جیسا کوئی نوجوان نہیں دیکھا۔ اس لیے تم شہریار کی خودداری سے متاثر ہو گئی ہو' کیونکہ اس خودداری میں کم سے کم تمہارے لیے نیا پن ہے' اب تم بھی یہ ہی چاہتی ہو کہ راعنہ کی طرح خالی ہاتھ رخصت ہو۔ تمہارے خاندان میں ملنے جلنے والوں کے لیے یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہو گا کہ احمد سیال جیسے کامیاب بزنس ٹائیکون کی بیٹی جہیز کے نام پہ ایک تنکا بھی لے کر نہیں گئی۔ یہ خبر ہر جگہ ڈسکس ہو گی۔ تم اور تمہاری شادی گرما گرم موضوعات کا حصہ بنے گی اور تم سب کو چونکانے میں کامیاب رہو گی۔ تمہارے لیے یہ سب وقتی ایڈونچر ہے۔ کیونکہ تم جدت پسند ہو' ایکسائیٹڈ ہو رہی ہو کہ تمہیں ایسا شخص ملے جو کہے کہ میں تین کپڑوں میں قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اس کے بعد کیا ہو گا' تمہیں نہیں معلوم۔ راعنہ کی شادی اپنی فیملی میں ہوئی ہے۔ بعد میں شہریار کا طرز عمل کیا ہو گا' ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جبکہ تمہارے لیے آؤٹ آف فیملی پروپوزل آیا ہے' تمہیں نہیں معلوم وہ لوگ کیسے ہیں۔ تمہارے پاپا کا ایک نام ہے۔ عزت ہے وہ بھلا اپنے منہ سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں اپنی بیٹی کو کچھ نہیں دوں گا یا میری بیٹی کو یہ سب پسند نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے میں معاشی لحاظ سے کیا گزرا گھرانہ بھی بیٹی کو جب رخصت کرتا ہے تو اپنی حیثیت کے مطابق سب کچھ دینے کی کوشش کرتا ہے بیٹی پیدا ہوتے ہی اس کے لیے جہیز جمع کرنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ ایسے ہی تمہارے پاپا کی بھی خواہش ہے کہ تمہیں شایان شان طریقے سے رخصت کرسکیں۔ تمہاری سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی۔"

فراز بہت دھیان سے بات کر رہا تھا۔ رنم کے چہرے سے لگ رہا تھا۔ وہ اس سے ذرا بھی متفق نہیں ہے۔ بس بحالت مجبوری اس کی بات سن رہی ہے۔ تب ہی تو فراز کو بولتا چھوڑ کر تھوڑی دیر بعد وہ بیگ اٹھائے چلتی بنی۔ فراز الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ایڈونچر' ایک تبدیلی' ایک نئے پن' ایک تجربے کی خاطر کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اس سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

زیان دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد بوا کے ساتھ گپ شپ کر رہی تھی۔ جب وہاب کی اچانک آمد ہوئی۔ بوا اور زیان صحن میں بیٹھی تھیں۔ وہاب سیدھا ادھر ہی آیا۔ بہت دن بعد اپنے گوہر مقصود کو دیکھا تھا۔ اس کے روم روم میں سکون و راحت طاقت بن کر دوڑنے لگی۔

"السلام علیکم کیسے ہیں آپ لوگ۔" اس کی چہکتی آواز سے ہی اس کی خوشی صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ زیان نے ہلکی آواز میں سلام کا جواب دیا۔ جبکہ بوا گرمجوشی سے اس سے حال احوال پوچھ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد بوا اس کی خاطر مدارات کے لیے اٹھ گئیں۔ تب وہاب نے بڑی فرصت سے زیان کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی یہ حرکت زیان سے کیسے پوشیدہ رہ سکتی تھی۔ زرینہ بیگم نے اسے قبل از وقت ہی وہاب کے ارادوں سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس لیے وہاب کی نظروں نے اسے بے پناہ غصے سے دوچار کر دیا تھا۔ وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھی۔ وہاب کو پتا تھا' زیان یہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جائے گی اور پھر اس کے جانے کے بعد ہی باہر نکلے گی۔ اس کے لیے اس نے کمال جرات سے کام لیتے ہوئے اچانک اپنا ایک بازو آگے کر دیا' جیسے اسے جانے سے روکنا چاہتا ہو۔

"یہ کیا ہے؟" وہ کڑوے لہجے میں بولی۔

"تمہیں آئے مہمان سے ذرا بھی خوش اخلاقی برتنا نہیں آتی۔" وہاب اس کا تپا تپا چہرہ دیکھتے ہوئے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ سامنے سٹنگ روم میں بیٹھی زرینہ نے گلاس ونڈو سے یہ منظر پوری وضاحت کے ساتھ دیکھا۔ نفرت میں ڈوبی مسکراہٹ ان کے لبوں پہ آئی۔ زیان کو جلدی یہاں سے بھگانا پڑے گا۔ ورنہ وہاب جھگڑے کھڑے کر سکتا ہے۔ وہاب کے چہرے کے والہانہ تاثرات نوٹ کرتے ہوئے زرینہ کے دل میں اس خیال نے جڑ مضبوط کر لی۔

٭ ٭ ٭

بہت زوردار طوفان تھا ہوا کے بہت تیز جھکڑ چل رہے تھے۔ بند دروازوں اور کھڑکیوں کے باوجود ہوا کی زوردار سائیں سائیں کی آواز اندر کمروں تک آ رہی تھی۔ عنیزہ ایک کونے میں سکڑی سمٹی خوف زدہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ حویلی میں کام کرنے والی ایک نوکرانی ان کے پاس تھی۔ ارسلان باہر زمینوں پہ ڈیرے کی طرف تھے۔ وہیں سے وہ اپنے ایک دوست کی دعوت پہ اس کے گھر چلے گئے تھے۔ سر شام سے ہی موسم کے تیور بدلے تھے' پہلے آہستہ آہستہ ہوا چلنا شروع ہوئی' پھر اس نے زوردار طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ عنیزہ نے فوراً" حویلی کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کروائیں۔

باہر سے زوردار آواز آئی تھی' شاید کوئی درخت ٹوٹ کر گرا تھا۔ عنیزہ نے سہم کر بند دروازے کی طرف دیکھا' جیسے طوفان دروازے سے اندر کا رخ کرے گا۔ نوکرانی اپنی مالکن کے خوف کو بہت اچھی طرح محسوس کر رہی تھی اور اسے ہمدردی بھی تھی' کیونکہ جب بھی آندھی یا طوفان آتا عنیزہ کمرے میں بند ہو جاتیں۔

اچانک ہی لائٹ چلی گئی اور گھپ اندھیرا چھا گیا۔ کھڑکیوں پہ پہلے ہی بھاری پردے پڑے تھے۔ رہی سہی کسر لائٹ نے پوری کر دی۔ نوکرانی نے اٹھ کر ایمرجنسی ٹارچ آن کی۔ تب تک باہر موجود ملازم جنریٹر آن کرنے کی تیاری میں جت گئے۔ چند منٹ بعد ہی جنریٹر کے چلنے سے حویلی پھر سے جگ مگ کرنے لگی۔ عنیزہ اپنے ماضی میں پہنچ گئیں۔ یہاں سے بہت دور بہت سال پہلے کا ایک منظر ذہن کے بند دروازوں پہ رہ رہ کے دستک دے رہا تھا۔

اس کھلے کھلے برآمدے والے گھر میں ایسی ہی ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ بہت تیز طوفان تھا۔ وہ اپنے سامنے پڑے ننھے منے سے وجود کو پریشان نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ جسے طوفان یا تیز ہواؤں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

دروازے کو زور زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ عنیزہ کے ذہن میں سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ وہ مضبوط

تنومند ہاتھ، چھینا جھپٹی، چیخ و پکار، آنسو، آہیں، پھر لمبی خاموشی۔ دروازے پہ پھر سے دستک ہو رہی تھی، مگر یہ ماضی نہیں تھا۔ عنیزہ چونک کر حال میں آئیں۔ نوکرانی دروازہ کھول چکی تھی۔ آنے والے ملک ارسلان تھے۔ عنیزہ نے سکون کی سانس لی۔ کم سے کم ملک ارسلان اس کی زندگی میں طوفان لانے والے نہیں تھے۔

☼ ☼ ☼

بند کھڑکی کے شیشے سے چہرہ لگائے وہ باہر دیکھ رہی تھی، جہاں تیز ہوا کی شدت سے ہر چیز پھڑپھڑا رہی تھی۔ درخت زوردار طریقے سے ہل رہے تھے۔ بند دروازوں کی دھمک سے عجیب سی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ زرینہ بیگم اور سب اپنے اپنے کمروں میں دبک گئے تھے۔ وہ طوفان اور آندھی سے بہت ڈرتی تھیں۔ یہی حال بوا کا تھا۔ موسم کے باغی تیور دیکھتے ہوئے انہوں نے تسبیح اٹھا کر استغفار کا ورد شروع کر دیا تھا۔ وہ اس طوفان کو دیکھتے ہوئے اس کی شدت سے ڈر گئی تھیں۔ ذیان کو تیز ہوا اس کی شدت اور طوفان سے ذرہ بھر بھی ڈر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ پوری دلچسپی سے ہوا کو مختلف چیزوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھ رہی تھی۔ پر بوا کو چین نہیں آ رہا تھا۔ تسبیح اٹھائے ہانپتے کانپتے اس کے پاس پہنچ گئیں۔ سب سے پہلے کچھ پڑھ کر اس پہ پھونک ماری۔

"تم یہاں کھڑکی کے پاس کیوں کھڑی ہو؟ جاؤ، وہاں جا کر بیٹھو۔" انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں بوا، یہاں کیا ہے، طوفان سے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔" اس نے ہنس کر بے نیازی دکھائی۔

"تمہیں نہیں پتا، میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ طوفان میں بہت سی بلائیں بھی آتی ہیں ہوا کے ساتھ۔"

"بوا ایسا کچھ بھی نہیں ہے، یہ سب فرسودہ باتیں ہیں۔ ایمان کی کمزوری کی علامت ہے یہ۔" اس نے ہنس کر بات ٹالی۔ بوا اسے پریشانی سے دیکھ کر رہ گئیں۔

"بہت سال بعد آج پھر ویسا ہی طوفان دیکھ رہی ہوں۔ اللہ خیر کرے۔" بوا کا ہاتھ اپنے سینے پہ تھا۔

"کیا بہت پہلے بھی ایسا طوفان آیا تھا؟" وہ دلچسپی سے بولی۔

"ہاں ایسا ہی ہولناک دہشت ناک طوفان تھا وہ۔"

"میں تب کہاں تھی، مجھے کیوں نہیں پتا اس طوفان کا؟" اس کے لبوں پہ ڈھیروں سوال مچل رہے تھے۔

"تب تم چھوٹی سی تھی، اتنی سی۔ تمہیں طوفان کا کیسے پتا چلتا۔" بوا نے بمشکل جتن کر کے آنکھوں میں چھلکنے والی نمی کو روکا۔ ذیان پھر سے کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ بوا نے شکر ادا کیا، ورنہ اس کے مزید سوالوں کا جواب دینا نہایت کٹھن ہوتا۔

☼ ☼ ☼

روبینہ، زرینہ سے فون پہ بات کر رہی تھیں۔ زرینہ ہمیشہ کی طرح اپنے دکھڑے رو رہی تھیں۔ آدھے گھنٹے سے وہ مسلسل ذیان کے موضوع سے چمٹی ہوئی تھی۔ کافی دیر بعد وہ زرینہ سے بات کر کے فارغ ہوئیں تو وہاب کو غور سے اپنی طرف دیکھتے پایا۔

"امی آج کل خالہ آپ سے کچھ زیادہ ہی قریب نہیں ہو گئی ہیں۔" وہ استفسار کر رہا تھا۔

"کیوں کیا ہوا ہے؟" روبینہ نے پوچھا۔

"آج کل جب دیکھو آپ ان ہی کے ساتھ فون پہ بات کر رہی ہوتی ہیں۔ ویسے ایک لحاظ سے اچھا ہی ہے۔ بہت جلد آپ دونوں بہنیں ایک اور رشتے میں منسلک ہو جائیں گی۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ روبینہ فوراً اس کی بات کی تہ میں پہنچ گئیں۔

"یہ خواب دیکھنا چھوڑ دو وہاب۔" بیٹے کی بات پہ ان کے دل کو کچھ ہوا، مگر اسے سمجھانا بھی ضروری تھا۔

"ہاں یہ خواب نہیں ہیں، مجھے خوابوں کو حقیقت میں کیسے بدلنا ہے، مجھے اچھی طرح اس کا علم ہے۔ آپ زرینہ خالہ کے گھر جانے کی تیاری کر لیں۔ بہت جلدی آپ کو میرا رشتہ مانگنے جانا ہے۔" اس کے لبوں پہ پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ روبینہ سر پکڑ کر

بیٹھ گئیں۔ وہ اب تو کسی صورت بھی پیچھے ہٹنے یا ان کی ماننے والا نہیں لگ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

احمد سیال زندگی میں پہلی مرتبہ سخت غصے میں تھے۔ انہوں نے رنم کو بہت بار سمجھایا' لیکن وہ ماننے میں نہیں آرہی تھی۔ انہیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی فضول سی ضد چھوڑنے کے لیے تیار کیوں نہیں ہے۔ تھک ہار کر وہ رنم کے علم میں لائے بغیر راعنہ اور شہریار سے ملے۔ احمد سیال کی پریشانی کی وجہ جان کر وہ دونوں خود بھی فکر مند ہوگئے۔ راعنہ نے تو پولی ورشی میں رنم کو جا پکڑا۔ کچھ دن سے وہ بے حد مضطرب اور تھکی تھکی نظر آرہی تھی۔ اکثر کلاس بنک کردیتی' جب دیکھو گراؤنڈ میں بیٹھی غیر مرئی نقطے کو دیکھتی پائی جاتی۔

"رنم کیا بات ہے' کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔ مجھے فیل ہو رہا ہے تم بہت اپ سیٹ ہو؟" راعنہ نے بہت ہوشیاری سے بات شروع کی۔

"ہاں اپ سیٹ ہوں۔" اس نے فوراً" اقرار کیا اور رکے بغیر سب بتاتی چلی گئی۔

"پاپا میری بات نہیں سمجھ رہے ہیں۔ مجھے صرف شہریار بھائی جیسا لائف پارٹنر چاہیے جو کوئی ڈیمانڈ نہ کرے۔"

"فرض کیا کوئی ایسا شخص مل بھی جاتا ہے جو بغیر کسی ڈیمانڈ کے تم سے شادی کرلے اور پھر کچھ عرصے بعد سب چیزوں کا مطالبہ کردے' کیونکہ تمہاری احمقانہ ضد تمہیں کسی بھی بڑے نقصان سے دوچار کرسکتی ہے۔"

"مجھے نقصان ہوگا کسی اور کو تو نہیں۔" وہ نروٹھے پن سے بولی۔

"رنم تمہاری ضد کا ہر جگہ چرچا ہے۔ بہت سے نوجوان لالچ میں آکر تم سے شادی کرنے پہ تیار ہوجائیں گے کہ جی ہمیں کچھ نہیں چاہیے' بعد میں جب تم نکاح کے بندھن میں جکڑی جاؤ گی تو تمہارا شوہر زبردستی دھونس' دھمکی' بلیک میلنگ کے ذریعے تمہاری سب دولت' جائیداد اپنے نام کرواسکتا ہے۔ تب تم کیا کروگی۔ انکل سیال کا سب کچھ تمہارا ہی تو ہے' وہ اپنی خوشی سے تمہیں شادی کے موقع پہ ہر چیز دینا چاہتے ہیں۔ تم مان جاؤ۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ہر شخص ہی لالچی ہو۔ انکل کسی ایسے ویسے نوجوان سے تمہاری شادی نہیں کریں گے۔" راعنہ نے اسے ایک اور پہلو سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو کوئی ایسا ویسا نوجوان مجھ سے میرے پاپا کی دولت کے بغیر شادی کیوں نہیں کرلیتا۔ اتنی بڑی دنیا میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے کیا؟ جیسا مجھے چاہیے۔" ایک عجیب سی حسرت پنہاں تھی اس کے لہجے میں۔

"مائی ڈیئر فرینڈ یہ لائف ہے' کوئی فلم یا ناول کی کہانی نہیں ہے۔"

"تمہاری شادی بھی تو شہریار بھائی سے ہوئی ہے نا۔" وہ چمک کر بولی۔

"شہریار میرے کزن ہیں۔ بچپن سے دیکھے بھالے ہیں' پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں شروع سے ہی۔ میں نے ان کی محبت میں سب کچھ قبول کیا ہے' کیونکہ شہریار میری فیملی سے کسی قسم کی فائننشل سپورٹ حاصل کرکے زیربار نہیں ہونا چاہتے' انہیں اللہ کی ذات پہ' محنت پہ بھروسا ہے۔" راعنہ نے اسے حقیقت بتائی۔

"ہماری فیملی میں آپس میں بہت سے Conflicts ہیں جس کی وجہ سے شہریار نے یہ سب کیا۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتی' بس اتنا کہوں گی اپنی ضد سے باز آجاؤ۔" رنم جواب میں کندھے جھٹک کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

بہت دن بعد رنم اور احمد سیال اکٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ "تم نے مجھے کوئی جواب ہی نہیں دیا ملک جہانگیر کی فیملی کے بارے میں۔" احمد سیال نے کھانے کے درمیان بات شروع کی۔ رنم نے حیرانی سے انہیں دیکھا جیسے اسے پاپا سے اس سوال کی توقع نہ ہو۔

"میں کیا جواب دوں۔" وہ ناراض لہجے میں بولی۔

"ابھی وہ لوگ آرہے ہیں تم خود کو تیار کرلو اس کے بعد خواجہ صاحب ہیں وہ بھی تمہارے سلسلے میں آنا چاہ رہے ہیں۔" انہوں نے اسے انفارم کیا۔

"پاپا مجھے نہ تو ملک جہانگیر کی فیملی میں کوئی انٹرسٹ ہے اور نہ کسی خواجہ صاحب میں۔ اگر آپ میری بات مانتے ہیں تو میں اس بارے میں سوچوں گی۔" نہ چاہنے کے باوجود بھی رنم کے لہجے میں تیزی آگئی۔

"میں تم پہ کوئی اپنی مرضی نہیں ٹھونس رہا' صرف یہ چاہ رہا ہوں کہ مہمانوں سے مل تو دیکھ لو۔ اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ ہوگا۔" احمد سیال نرم لہجے میں بول رہے تھے۔

"پاپا۔ آپ چاہتے ہیں کہ میری شادی ہوجائے۔ پاپا میں شادی کروں گی' لیکن میں آپ سے کچھ بھی نہیں لوں گی۔ یہ بات آپ ان لوگوں کو بھی بتادیں جو ہمارے گھر آئیں گے۔ اگر وہ لوگ بغیر کسی جہیز کے مجھے قبول کرنے کے لیے تیار ہیں تو پھر ٹھیک ہے۔" رنم کا انداز قطعی بے لچک اور ٹھوس تھا۔ وہ ایک انچ بھی اپنے موقف سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"رنم کیوں بچوں والی باتیں کررہی ہو۔ سب لوگ ہنسیں گے مجھ پہ۔" احمد سیال کی قوت برداشت آہستہ آہستہ ختم ہورہی تھی۔

"پاپا آپ کو لوگ عزیز ہیں یا اپنی اکلوتی اولاد؟" وہ انہیں جذباتی طور پہ بلیک میل کرنے پہ اتر آئی۔

"مجھے تم پوری دنیا سے عزیز ہو مگر تمہاری خواہش ناقابل قبول ہے۔" وہ بے چارگی سے بولے۔

"پاپا آپ میری شادی کسی مڈل کلاس غریب خاندان میں تو کریں گے نہیں۔ جہاں بھی کریں گے وہ لوگ ہمارے ہم پلہ ہوں گے۔ ان کے پاس وہ سب کچھ ہوگا جو ہمارے پاس ہے۔ پھر میں کیوں آپ سے کچھ لوں۔" رنم اپنی بات پہ اڑی ہوئی تھی۔

"رنم میں پاگل ہوجاؤں گا۔ تم سمجھتی کیوں نہیں۔"

"پاپا آپ میری بات سے اتفاق کرتے ہیں تو ٹھیک' ورنہ۔"

"ورنہ کیا' بولو تم۔" احمد سیال نے غصے میں اس کی بات کاٹ دی۔

"پاپا میں کبھی بھی شادی نہیں کروں گی۔" اس نے تیزی سے جواب دیا۔ وہ کھانا چھوڑ کر جاچکی تھی۔ احمد سیال ناسمجھی کے عالم میں ابھی تک ادھر ہی دیکھ رہے تھے جہاں سے وہ باہر گئی تھی۔ ان کے چہرے پہ بے پناہ پریشانی تھی۔

☆ ☆ ☆

بہت تیز ہوا چل رہی تھی۔ رنم بار بار چہرے پہ آجانے والے بالوں کو سمیٹ رہی تھی۔ وہ فراز کے ساتھ پارک میں بیٹھی تھی۔ اسی نے فراز کو کال کرکے پارک میں بلوایا تھا۔ وہ سب کام چھوڑ کر چلا آیا۔ کیونکہ نہ آنے کی صورت میں رنم سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔ وہ ہر الٹی سیدھی بات سوچ سکتی تھی۔

اب وہ اس کے سامنے بیٹھا اس کا پریشان چہرہ اور تاثرات دیکھ رہا تھا۔ "تم میرے بیسٹ فرینڈ ہو' پر تم بھی میرے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔" اس کا لہجہ رونے والا ہورہا تھا۔

"میں تمہارے لیے ایک ایسا نوجوان ڈھونڈ سکتا ہوں جو تم سے بغیر جہیز کے شادی کر سکے۔" اس نے قصداً" ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا۔

"میں یہاں پریشان بیٹھی ہوں اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔"

"مذاق کون کر رہا ہے۔"

"فراز پاپا نے مجھ پہ غصہ کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ لوگ آرہے ہیں تم ملو اور فیصلہ کرو۔"

"ہاں تو مل لینا۔" اس نے روانی میں کہا تو رنم نے اسے گھور کے دیکھا۔

"میں نے پاپا سے بول دیا ہے کہ اگر آپ نے میری بات نہ مانی تو میں ساری عمر شادی نہیں کروں گی۔"

"تم نے اپنے پاپا سے بول دیا۔" وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں بول دیا ہے۔" اس نے تصدیق کی۔

"تم پاپا کی بات مان لو۔" اس نے خلوص دل سے ایک بار پھر اپنا مشورہ دہرایا۔

"بھاڑ میں جاؤ تم۔" وہ پاؤں پٹختی اٹھ کھڑی ہوئی۔ فراز سر پہ ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ راکنگ چیئر پہ بیٹھی آنکھیں موندے ہلکے ہلکے جھول رہی تھی۔ اسے آج فراز پہ بے پناہ غصہ تھا۔ وہ پارک سے نکل آئی تھی' بعد میں اس نے رنم کو کتنی بار کال کی' پر اس نے غصے میں ریسیو نہیں کی۔

اچانک دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی۔ "لیس کم آن۔"

اس نے آنکھیں کھولیں اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ آنے والے احمد سیال تھے۔ رنم نے انہیں بیٹھنے کے لیے نہیں کہا۔ وہ بھی اپنے انداز سے بیٹھنے والے نہیں لگ رہے تھے۔

"میں نے کبھی تم پہ اپنی مرضی نہیں ٹھونسی ہے' لیکن مجبوراً" یہ کام کرنا پڑ رہا ہے۔ میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ ملک جہانگیر کی فیملی کو بلوا رہا ہوں میں۔ بس یہ ہی بتانے کے لیے آیا تھا۔" احمد سیال کا لہجہ بے لچک اور سخت تھا۔ اپنی بات پوری کر کے وہ جا چکے تھے۔ جھولتی راکنگ چیئر اب ساکت تھی۔

"پاپا آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں بھی برداشت نہیں کروں گی۔ تمام عمر آپ نے میرے منہ سے نکلی ایک ایک بات پوری کی ہے اور اب چھوٹی سی بات ماننے میں آپ کو اعتراض ہے۔ کیا شہریار رہائی جیسا ایک ہی مرد تھا دنیا میں۔ اگر ایسا ہے تو میں شادی ہی نہیں کروں گی۔" رنم غصے کی انتہائی حد پہ جا کر سوچ رہی تھی۔ احمد سیال نے اسے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ اس لیے یہ سب اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

اس نے لمحوں میں فیصلہ کیا۔ ویسے بھی فیصلے کرنے میں وہ دیر نہیں لگاتی تھی۔ جذباتی تو شروع سے ہی تھی۔ اس وقت بھی شدید غصے اور جذبات کے زیر اثر اس نے انتہائی فیصلہ کیا تھا۔ وہ اب الماری کے سامنے کھڑی تھی۔ نچلے خانے میں کچھ کیش پڑا تھا۔ ساتھ گولڈ کی جیولری تھی۔ اس نے دونوں چیزیں اپنے ہینڈ بیگ میں ڈالیں۔ پھر کپڑوں کی باری آئی۔ تین' چار جوڑے اس نے ایک الگ چھوٹے سے بیگ میں ڈالے جسے آسانی سے اٹھایا جا سکتا تھا۔ دوسرے دراز سے اس کا اے ٹی ایم اور کریڈٹ کارڈ بھی مل گیا۔ وہ بھی اس نے ہینڈ بیگ کے چھوٹی پاکٹ میں ڈال دیے۔ اس دوران اس کی آنکھیں دھواں دھار برستی رہیں۔

غصے کے عالم میں اس نے اچانک گھر چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس پہ عمل کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ جانے سے پہلے اس نے آخری مرتبہ اپنے کمرے پہ نظر دوڑائی۔ سائیڈ ٹیبل پہ فوٹو فریم میں اس کی اور پاپا کی ایک یادگار فوٹو سجی ہوئی تھی۔ اس نے دھندلائی نگاہوں سے فوٹو کو آخری بار دیکھا۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

☆ ☆

نبیلہ ابر راجہ

میں گماں نہیں یقیں ہوں

چوتھی قسط

سارا منظر ہی دھندلا رہا تھا۔ اس کے واپسی کے لیے باہر کی طرف پلٹتے قدم جیسے یکایک ہی لڑکھڑانے لگے۔ آوازیں اس کے کانوں میں چیخ رہی تھیں۔ وہ ان پہ غور نہیں کرنا چاہتی تھی پر وہ اسے اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ پلٹنے پہ مجبور کر رہی تھیں۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی غور سے سنا۔ یہ تو اس کے گھر کی تعمیر میں لگی ایک ایک اینٹ کی آواز تھی اس نے بمشکل تمام آوازوں سے پیچھا چھڑاتے ہوئے آگے کی طرف قدم بڑھائے۔ یہاں بھی آوازیں اس کا دامن تھام کے فریاد کرنے لگیں۔

درخت، گھاس، لان کی دیوار، براؤن آہنی گیٹ سب ہی اسے التجا کر رہے تھے کہ خدارا اپنے بڑھتے قدم پیچھے ہٹالو۔ چھوٹا سا سوٹ کیس ہاتھ میں تھامے وہ تیز تیز قدموں سے گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔

اس نے ہزار جتن کر کے آوازوں کی طرف سے دھیان ہٹایا۔ اب وہ گیٹ سے باہر تھی۔ سب آوازیں پیچھے رہ گئی تھیں۔ اس نے پیچھے مڑ کر براؤن گیٹ اور سبزے سے ڈھکی دیوار کو دیکھا دونوں خاموش تھے مایوس تھے انہیں یقیناً" پتا چل گیا تھا کہ وہ اب واپس پلٹنے والی نہیں ہے۔

وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر کومل کے پاس اس کے گھر پہنچی تھی۔ اتفاق سے گھر میں کومل اور ملازموں کے سوا اور کوئی نہیں تھا کیوں کہ اس کے مما پاپا ایک فیملی فنکشن میں گئے ہوئے تھے۔ کومل کا جانے کا موڈ نہیں تھا اس لیے وہ گھر رک گئی تھی۔ ایک لحاظ سے رنم کے حق میں یہ اچھا ہی ہوا کیوں کہ کومل کے گھر پہ نہ ملنے سے اسے پریشانی لاحق ہو سکتی تھی۔

کومل اسے دیکھ کر فوراً" کھٹک گئی کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ کیوں کہ رنم کے پاس ہینڈ بیگ کے علاوہ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس بھی تھا۔ اس کے چہرے پہ حد درجہ پریشانی چھائی ہوئی تھی۔ دروازہ جیسے ہی کھلا وہ کومل کو ہاتھ سے ہٹاتی جھپاک سے اندر داخل ہوئی جیسے کسی کے دیکھ لیے جانے کا خطرہ ہو۔ بیٹھتے ہی اس نے رونا شروع کر دیا۔ کومل کے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔

"ارے کیا ہوا ہے کچھ بتاؤ تو۔ میرا دل ہول رہا ہے۔" اس نے چھٹی بار بڑے صبر سے اپنا سوال دہرایا۔ پر رنم اسی رفتار سے روتی رہی۔ دسویں بار اس نے جھنجلائے ہوئے انداز میں پوچھا تب رنم نے منہ کھولا۔

"میں گھر چھوڑ آئی ہوں۔" کہیں دھماکا ہوتا تو شاید کومل کی ایسی حالت نہ ہوتی جو اب ہو رہی تھی اسے تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ شاید اسے سننے میں غلطی ہوئی تھی۔ بڑی مشکل سے اس کے منہ سے آواز نکلی۔

"کک... کیا کہہ رہی ہو تم مذاق تو نہیں کر رہی نا۔" کومل کے منہ سے بے یقین سا جملہ بر آمد ہوا۔

"نہیں... نہیں ہاں میں ہمیشہ کے لیے اپنا گھر چھوڑ آئی ہوں۔"

"کیوں چھوڑا تم نے گھر؟" کومل نے اپنے منتشر حواس یکجا کرتے ہوئے خود کو سنبھالا۔

"پاپا میری بات جو نہیں مان رہے تھے۔" اس نے پریشانی سے جواب دیا۔

"تم اب کیا کرو گی؟"

"میں گھر چھوڑ آئی ہوں واپس نہیں جاؤں گی۔ یہ لو میرا بیگ اس میں کپڑے ہیں اور یہ میرا ہینڈ بیگ بھی حفاظت سے رکھ دو اس میں جیولری اور کیش ہے۔"

رنم نے آنکھیں مسلتے ہوئے دونوں چیزیں اس کی طرف بڑھائیں۔ کومل یوں پیچھے ہوئی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"نہیں رنم تم گھر واپس لوٹ جاؤ میرے مما پاپا فنکشن میں گئے ہیں انہیں پتا چل گیا تو میری شامت آجائے گی۔" کومل سخت خوف زدہ لگ رہی تھی۔ اس نے رنم کے ہاتھوں کی طرف مطلق توجہ نہ دی جن میں سامان دبا تھا۔

"نہیں میں واپس نہیں جاؤں گی مجھے تم اپنے پاس رکھ لو۔" رنم ایسے بولی جیسے کومل انکار نہیں کرے گی۔

"پلیز کومل تم میری دوست ہو۔" وہ روہانسی ہو رہی

تھی۔

"تمہارے پاپا کی اپروچ سے سب واقف ہیں اگر انہیں تمہاری یہاں موجودگی کی خبر ہو گئی تو میری فیملی کی شامت آجائے گی۔ ویسے تم رکنا چاہو تو موسٹ ویلکم، مگر دوسری صورت میں یہ ممکن نہیں ہے۔ میری دوست بن کر تم سو بار آؤ، مگر گھر چھوڑ کر آنے کی صورت میں، میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔" اس کا لہجہ بااعتماد اور مضبوط تھا۔

کومل سمجھ دار اور باشعور تھی۔ احمد سیال کے بارے میں، ان کی طاقت اور اثر ورسوخ کے بارے میں بھی سب کچھ جانتی تھی۔ اگر انہیں رنم کی یہاں موجودگی کا علم ہو جاتا تو اس کی ذات لازمی شک کی لپیٹ میں آتی۔ وہ مما پاپا کے گھر واپس آنے سے پہلے پہلے رنم کو یہاں سے چلتا کرنا چاہ رہی تھی۔ دوستی اپنی جگہ پر اسے پاپا کی عزت اور سلامتی بھی عزیز تھی۔

رنم پہ پہلے اسے ہمیشہ رشک آتا تھا پر ابھی ترس آرہا تھا۔ اچھی خاصی سیر لائف انجوائے کرتے کرتے وہ جانے کیوں یہ حماقت کرنے پہ مل گئی تھی اور گھر چھوڑ کر یہاں پہنچ چکی تھی۔

"دوسری صورت میرے پاس نہیں ہے۔" رنم کا لہجہ تلخ ہو رہا تھا۔ کومل نے فوراً" اپنے اندرونی احساسات پہ قابو پایا اور زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پہ سجائی۔

"تم ابھی غصے میں ہو کل تک تمہارا غصہ دور ہو جائے گا۔ آج کی رات تم میرے گھر مہمان ہو۔ کل میں اور پاپا تمہارے ساتھ تمہارے گھر جائیں گے اور احمد انکل کو سمجھا کر راضی کرنے کی کوشش کریں گے۔" کومل جیسے اسے لالی پوپ دے کر بہلا رہی تھی۔

"مجھے تمہاری کسی بھی قسم کی ہیلپ کی ضرورت نہیں ہے۔" رنم کا لہجہ یکسر ہی سرد ہوا۔ کومل کی باتوں کے پیچھے چھپے معانی نے اسے ازحد تکلیف پہنچائی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" کومل روہانسی ہونے لگی۔

"مطلب یہ کہ میں جا رہی ہوں یہاں سے۔" رنم نے ہینڈ بیگ اٹھایا اور چھوٹا سا سوٹ کیس اپنی طرف کھسکایا جو اس کے پاؤں کے پاس پڑا تھا۔ کومل کے چہرے پہ خوشی سی آگئی وہ جانے رنم کے جملے سے کیا سمجھی تھی۔

"شکر ہے تمہیں عقل آگئی ہے۔ اپنے گھر سے کوئی ایسے تھوڑی نکلتا ہے۔ پاپا کو راضی کرو جا کر۔ کب تک ناراض رہو گی۔ میری مانو تو واپس جا کر سب سے پہلے سوری کرنا۔" اس نے سکون کا سانس لیا۔

رنم دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئی اور پلٹی۔

"تمہاری ایڈوائس کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے تمہاری فرینڈ شپ پہ بہت ٹرسٹ تھا، لیکن اب No further more ۔" یہ طنزیہ فقرہ اس کی دل گرفتی کا مظہر تھا۔ رنم دروازے سے باہر نکلی تو کومل اس کے پیچھے لپکی۔

"رنم تم تو ناراض ہو کر جا رہی ہو۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا جو تم سمجھی ہو۔" وہ شرمندہ سی تھی۔

"میں اب سمجھ گئی ہوں۔" رنم رکے بغیر بولی۔

"دیکھو میں نے تم سے جو کچھ بھی کہا تمہاری بھلائی کے حوالے سے کہا تم گھر سے ایک رات بھی غائب رہتی تو اسکینڈل بن جاتا۔ میں اس لیے چاہ رہی ہوں کہ تم گھر واپس چلی جاؤ۔ گھر میں اختلافات ہو ہی جاتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ گھر ہی چھوڑ دیا جائے۔ تم لڑکی ہو گھر سے نکلے ہوئے تمہیں زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی ہے انکل کو ابھی پتا بھی نہیں چلا ہو گا۔ مما پاپا گھر نہیں ہیں ورنہ میں تمہیں خود ڈراپ کر آتی۔" کومل ہر ممکن طریقے سے اس کا غصہ اور ناراضی ختم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تو تھینکس میں خود چلی جاؤں گی۔" رنم سرد مہری سے بولتی بیرونی گیٹ بھی عبور کر گئی۔ کچھ دیر کومل وہیں کھڑی رہی پھر وہ بھی پلٹ کر گھر کے اندرونی حصے میں آگئی۔ دل میں وہ شکر ادا کر رہی تھی کہ رنم بخیرو خوبی واپس چلی گئی ہے۔ مما پاپا کو پتا چلتا تو اس کی کلاس

لیتے کیوں کہ احمد سیال کے اثرو رسوخ کا انہیں بھی اچھی طرح علم تھا۔

☆ ☆ ☆
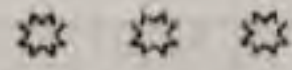
رنم، کومل کے گھر سے نکل آئی تھی اور بیگ تھامے روڈ پر چلی جارہی تھی۔ رفتہ رفتہ شام ہو رہی تھی۔ اس نے پاس سے گزرتی ایک ٹیکسی کو روکا۔ ڈرائیور کو فراز کے گھر کا پتا سمجھا کر وہ پچھلی سیٹ پہ ڈھیر ہو گئی۔ کومل کے رویے نے اسے سخت صدمے سے دوچار کیا تھا۔

اس نے تو دوستی کا بھی لحاظ نہیں کیا تھا، جھٹ آنکھیں ماتھے پہ رکھ لی تھیں۔ اب ایک دم کیسے بدل گئی تھی۔ رنم کو بہت شدید طریقے سے رونا آرہا تھا پر وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر رونا نہیں چاہتی تھی۔ ڈرائیور شوقین مزاج لگتا تھا۔ رنم کے بیٹھتے ہی اس نے میوزک سسٹم آن کر دیا تھا۔ رنم اپنی ٹینشن میں تھی ورنہ اسے ٹوکتی ضرور۔

میں ڈھونڈنے کو زمانے میں جب وفا نکلا
پتا چلا کہ میں لے کے غلط پتا نکلا...

گلوکار سریلے انداز میں دنیا کی ایک اہم حقیقت بیان کر رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی رنم نے سنا اور پھر اس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ آگئی۔ وہ بھی کومل کے پاس کتنی امیدیں لے کر پہنچی تھی۔

فراز اس کا بیسٹ فرینڈ تھا۔ رنم کو اس پہ بے پناہ مان تھا۔ اس لیے اس نے فراز کی طرف جانے کا فیصلہ کیا تھا کیوں کہ فی الحال اس کی آخری امید فراز ہی تھا۔ فراز کے گھر کے سامنے ٹیکسی والے کو اس نے ہزار کا نوٹ دے کر فارغ کیا۔ وہ کبھی اسے دیکھ رہا تھا اور کبھی ہزار کے نیلے نوٹ کو۔

رنم پیسے دے کر آگے بڑھ گئی تھی اس نے نہ کرایہ پوچھا اور نہ باقی پیسے طلب کیے۔ ٹیکسی ڈرائیور اس کی عقل پہ ماتم کرتا اور دریا دلی پہ خوش ہوتا واپس جا چکا تھا۔ رنم کو فراز کا چوکیدار بہت اچھی طرح پہچانتا تھا سو اس نے رنم کو زوردار سلام جھاڑا اور گیٹ کھول دیا۔

اندر ایک اور ملازم نے ڈرائنگ روم تک اس کی رہنمائی کی۔ فراز یہاں اکیلا اپنے ملازمین کے ساتھ رہتا تھا۔ اندرون پنجاب اس کا آبائی گھر اور سینکڑوں ایکڑ زمین تھیں یہاں وہ پڑھائی کے ارادے سے رہ رہا تھا۔ اس کے والد کھاتے پیتے خوشحال زمیندار تھے اس لیے وہ یہاں ٹھاٹھ سے رہ رہا تھا دیکھنے والے اس کی قسمت پہ رشک کرتے تھے۔

فراز کو جیسے ہی ملازم نے رنم کے آنے کی اطلاع دی وہ فوراً" ڈرائنگ روم میں آگیا۔ نظر رنم کے پاس رکھے سوٹ کیس پہ پڑی۔ ہینڈ بیگ اس کی گود میں دھرا تھا۔ ذہین تھا فوراً" تاڑ گیا کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

"کیا یہاں رہنے کے ارادہ ہے، جو سوٹ کیس بھی ساتھ لائی ہو۔" اس نے قصداً" ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا۔ ادھر فراز کے پوچھنے کی دیر تھی رنم کی آنکھیں برس پڑیں۔ اس نے نئے سرے سے سب کچھ دہرایا۔ کومل کی بے حسی، خود غرضی، طوطا چشمی پہ وہ بے پناہ رنجیدہ تھی۔ فراز اس کی رگ رگ سے واقف تھا اس لیے اس نے کوئی اظہار خیال کرنے کی حماقت نہیں کی۔

"تم کتنی دیر پہلے گھر سے نکلی تھیں۔" فراز کی نگاہیں دیوار گیر کلاک پر مرکوز تھیں۔

"کافی گھنٹے ہو گئے ہیں۔" رنم بڑبڑائی۔

"ابھی تک تمہارے پاپا کو تمہاری گمشدگی کا علم نہیں ہوا ہوگا وہ یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ تم فرینڈز کے ساتھ ہو اور تمہارا سیل فون کہاں ہے؟" اسے اچانک خیال آیا۔

"میں آف کر کے گھر رکھ آئی ہوں۔" اس نے فراز سے نظر چراتے ہوئے کہا۔

"اچھا تب ہی ایک گھنٹہ پہلے میں نے تمہیں کال کی تو آف مل رہا تھا۔" فراز نے جیسے خود کلامی کی۔

"فراز میں اب ادھر ہی رہوں گی جب تک پاپا میری بات نہیں مان جاتے تمہیں کومل کی طرح کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟" رنم کی آنکھوں میں بے پناہ

اندیشے نظر آرہے تھے۔

"تم جب تک چاہو یہاں رہو۔" اس نے دوستانہ آفر کی تو رنم پہلی بار پرسکون ہو کر مسکرائی۔

"تم سیریس ہو؟" اسے جیسے یقین نہیں آرہا تھا۔

"ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تم اپنا سامان رکھو۔ ملازم کمرا تیار کردے گا۔ میں کہتا ہوں اسے اور جاؤ تھوڑا فریش ہو جاؤ۔" فراز اسے تسلی دے کر اٹھا۔

"سنو مجھے بھوک لگی ہے۔" رنم کو تھوڑا اطمینان ہوا تو بھوک ستانے لگی ویسے بھی اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔

"تم ایزی ہو جاؤ میں کھانے کا بول کر آتا ہوں۔" فراز باہر جا چکا تھا۔ رنم صوفے سے ٹیک لگائے ٹانگیں اوپر کیے نیم دراز تھی اسے نیند آرہی تھی۔ صبح کی جاگی تھی دن بھر کی بے آرام تھی اب پریشانی کچھ کم ہوئی تو جسم آرام طلب کرنے لگا۔ ساتھ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ فراز کو گئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ رنم اسے دیکھنے کے لیے باہر آئی۔

ٹی وی لاؤنج سے کسی کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ اور یہ سو فیصد فراز ہی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی فراز بہت آہستہ آواز میں بات کر رہا تھا۔

"انکل وہ یہاں میرے گھر میں ہے۔ میں نے کافی تسلی دی ہے اسے آپ جلدی آئیں۔ میں فون بند کر رہا ہوں ایسا نہ ہو اسے شک ہو جائے۔" وہ اگرچہ آہستہ آواز میں بول رہا تھا پر بغور کان لگا کر سننے سے حرف حرف رنم کی سماعتوں میں اتر گیا تھا۔ فراز فون بند کر چکا تھا۔

رنم کچھ ثانیے کے لیے جیسے ادھر ہی سن ہو گئی قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ فراز نے بھی کومل کی طرح اسے دھوکا دیا تھا۔ کتنی بری طرح فراز نے اس کے اعتبار کو توڑا تھا۔ اس کا سب سے بیسٹ فرینڈ اس کی پیٹھ پر چھرا گھونپ چکا تھا۔ یہ وقت افسوس کرنے کا نہیں تھا اسے یہاں سے نکلنا تھا۔ فراز پاپا کو کال کر کے انفارم کر چکا تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی تھے انہوں نے فراز کے گھر پہنچ جانا تھا۔ وہ ایک اور نمبر ملا کر بات کر رہا تھا۔ رنم الٹے قدموں چلتی ڈرائنگ روم میں پہنچی۔ وہاں سے سوٹ کیس اور ہینڈ بیگ اٹھایا۔ اس کا کل اثاثہ یہ ہی دو چیزیں تھیں۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی گیٹ تک آئی ورنہ باہر موجود چوکیدار کو شک ہو سکتا تھا۔

پر خیریت رہی۔ گیٹ کے ساتھ رکھی اس کی کرسی خالی تھی۔ وہ شاید کسی ضرورت سے کہیں گیا ہوا تھا۔ وہ تیز تیز چلتی ہوئی روڈ تک آئی۔ اب آہستہ چلنے کا مطلب ناکافی تھا۔ خوش قسمتی سے فوراً" ٹیکسی بھی مل گئی۔ وہ پھرتی سے دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

"کسی اچھے سے ہوٹل لے چلو مجھے۔" اس نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔ اس کے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کومل اور فراز کو اس نے آزما لیا تھا اب اشعر کو آزمانے کی کوشش فضول تھی وہ اگر راعنہ کے پاس جاتی تو اس نے بھی نصیحتوں کے انبار لگا دینے تھے اور فوراً" سے بھی پیشتر اس کے پاپا کو انفارم کرنا تھا۔ اس لیے رنم نے تھک ہار کر ہوٹل کا سوچا تھا۔ اس کے ذہن میں کوئی بھی لائحہ عمل نہیں تھا حماقت در حماقت کرتی جا رہی تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے بیک مرر سے اس کا جائزہ لیا۔ رنم کوشش کر رہی تھی اس کی کسی حرکت سے پریشانی یا اضطراب کا اظہار نہ ہو۔ ٹیکسی والے نے بہت غور سے اسے سہ بار دیکھا۔ لڑکی شکل و صورت ولب و لہجہ اور لباس سے امیر گھر کی لگ رہی تھی اور جس جگہ سے وہ ٹیکسی رکوا کر بیٹھی تھی وہ علاقہ بھی پوش تھا۔ سو ایسے لوگ کس قسم کے ہوٹلز میں قیام کرتے ہیں ٹیکسی ڈرائیور کو اچھی طرح علم تھا۔ اس نے اپنی ٹیکسی ایک عمدہ مہنگے قسم کے ہوٹل کے سامنے لا کھڑی کی۔

☼ ☼ ☼

ڈرائنگ روم میں کمال اور اس کی والدہ عفت خانم آئی ہوئی تھیں۔ بوا نے شاندار طریقے سے خاطر مدارات کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

اتوار کا دن تھا۔ عفت خانم بغیر کسی اطلاع کے

اچانک اپنے سپوت کے ساتھ آن وارد ہوئی تھیں۔ زرینہ بیگم کو پتا ہوتا کہ آج انہوں نے آنا ہے تو وہ انہیں منع کر دیتیں۔ کیوں کہ اتوار کے دن وہاب لازمی ان کے گھر آتا تھا اور اچھا خاصا ٹائم گزار کے جاتا۔ وہ زیان کے دیدار کے لیے آتا تھا اور گھنٹوں بیٹھتا تھا۔ کیوں کہ اسے چھٹی کا ایک ہی دن ملتا تھا ویسے بھی وہ درمیان میں گاہے بگاہے چکر لگاتا تھا ہر اتوار کے دن اس کی آمد لازمی ہوتی۔

بوا نے جلدی جلدی میں اچھا خاصا کھانا تیار کر لیا تھا جسے مہمان ڈکار کے ہضم بھی کر چکے تھے۔ اب زرینہ بیگم ان کے ساتھ باتوں میں لگی ہوئی تھیں۔ عفت خانم جواب لینے آئی تھیں کیوں کہ زرینہ بیگم نے امیر علی کی عدم دلچسپی کی وجہ سے ابھی تک انہیں کچھ نہیں کہا تھا اسی لیے آج وہ خود آئی تھیں کچھ کمال کا دباؤ بھی تھا۔

زیان کی خوب صورتی، کم عمری، معصوم موہنی صورت نے اسے بے صبرا کر دیا تھا اسی کے نتیجے میں وہ اس وقت عفت خانم کے ساتھ امیر علی کے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ جبکہ زرینہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھیں کہ وہاب آج یہاں کا رخ کرنا بھول جائے۔ پر ہونی ہو کر رہتی ہے وہاب آج خاصا لیٹ آیا جب تک خاص الخاص مہمان پر تکلف لنچ کر کے گپیں ہانک رہے تھے۔

وہاب نے ڈرائنگ روم کے باہر سے ہی جھانکا اندر نہیں گیا اور سیدھا بوا رحمت کے پاس آ گیا۔

"بوا کوئی مہمان آئے ہیں کیا؟" اس نے استفسار کیا۔

"ہاں وہاب میاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔" بوا نے وہاب کا چہرا غور سے دیکھا۔

"کون سے مہمان ہیں؟" وہ تیزی سے بولا۔

"آپ خود اندر چل کر دیکھ لیں۔ چھوٹی دلہن کے کوئی جاننے والے ہیں۔" بوا نے مصلحت سے کام لیا۔ کیوں کہ اڑتی اڑتی کچھ باتیں ان کے کانوں تک بھی پہنچی تھیں۔ اس لیے انہوں نے وہاب کو زیادہ تفصیل نہیں بتائی۔ پر نہ جانے کیوں اس کا چہرا اندرونی اضطراب کی شدت سے لال ہو رہا تھا۔ بوا مہمانوں کے لیے چائے کے ساتھ دیگر لوازمات رکھ رہی تھیں۔ زیان کے کمرے کا دروازہ حسب معمول حسب توقع بند تھا۔ امیر علی اپنے کمرے میں تھے۔ بوا نے چائے کا کپ اس کے آگے رکھا اس نے چھوا بھی نہیں۔

اندر ڈرائنگ روم سے اونچی آوازیں باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ ہنسی مذاق اور قہقہے بتا رہے تھے جیسے کسی دلچسپ موضوع پہ بات ہو رہی ہو۔ وہاب ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر زرینہ خالہ کا انتظار کرنے لگا۔ نہ جانے کیوں رہ رہ کر اسے احساس ہو رہا تھا ان مہمانوں کا آنا بے سبب نہیں ہے اور جو سب اس کی سوچ میں آیا تھا اس نے وہاب کے ذہن میں ہلچل مچا دی تھی۔

کچھ دنوں سے وہ نوٹ کر رہا تھا کہ امی اور زرینہ خالہ میں فون پہ لمبی لمبی باتیں ہونے لگی ہیں حالانکہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا بہت ہوا تو روبینہ نے فون کر کے زرینہ سے دعا سلام کر لی' خیر خیریت پوچھ لی اور بس' لیکن اب جب وہ آفس سے کبھی امی کی سیل نمبر پہ فون کرتا تو نمبر ہمیشہ مصروف ملتا۔ گھر میں ہوتا تب بھی زرینہ خالہ کی کال وقفے وقفے سے آتی اور روبینہ اپنا فون لے کر ادھر ادھر ہو جاتیں۔ وہاب نے ایک دوبار بے دھیانی میں ان کی یک طرفہ گفتگو سنی تو خدشوں کے ناگ سر سرانے لگے۔ آج وہ اپنے خدشات کی تصدیق کے لیے ہی یہاں آیا تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا اس کے بے نام خدشات بہت جلد حقیقت بن کر اس کے سامنے آنے والے ہیں۔

وہ صبر سے خالہ کا انتظار کر رہا تھا۔ مہمان چائے پینے کے ساتھ ساتھ خوش گپیوں میں بھی مصروف تھے۔ اسے اونچی آوازوں سے کوفت سی ہونے لگی۔ زرینہ خالہ خاصی دیر بعد مہمانوں سے فارغ ہوئیں تب انہوں نے وہاب کو دیکھا۔

"تم کب آئے؟" وہ خاصی پریشان نظر آ رہی تھیں حالانکہ وہاب کو دیکھنے سے پہلے ان کا موڈ بالکل نارمل تھا اب چہرے پہ تفکر نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔

کوشش کے باوجود وہ اپنی پریشانی چھپانے میں کامیاب
نہیں ہوئیں۔ وہاب یک ٹک انہیں دیکھ رہا تھا جیسے
ان کے تاثرات میں آنکھوں میں کوئی راز چھپا ہو۔
"تم کب آئے وہاب مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔"
وہ گڑبڑائیں۔
"مجھے تو آئے ہوئے تین گھنٹے سے اوپر ہو گئے
ہیں۔" وہاب کا لہجہ عجیب سا تھا۔
"کوئی چائے وائے پی تم نے؟" زرینہ بیگم اس کی
طرف دیکھنے سے احتراز برت رہی تھیں۔
"خالہ یہ کون سے مہمان تھے' میں نے پہلے نہیں
دیکھا کبھی۔"
"میرے ملنے والے تھے۔"
"آپ کے سب ملنے والوں کو میں جانتا ہوں۔" وہ
سخت لہجہ میں ایک ایک لفظ کو چبا کر بولا تو زرینہ کے
تاثرات بھی یکسر بدل گئے۔ اسے کیا ضرورت تھی
وہاب سے ڈرنے یا دبنے کی۔
"یہ مہمان زیان کے رشتے کے لیے آئے تھے۔"
زرینہ کے انداز میں فطری اعتماد لوٹ آیا تھا۔
"تو گویا آپ اور امی اتنے دن سے مل کر یہی کھچڑی
پکا رہی تھیں۔" وہ زہر خند ہو کر بولا۔
"خالہ آئندہ مجھے یہ مہمان یہاں نظر نہ آئیں۔"
وہ انگلی اٹھا کر وارننگ دینے والے انداز میں بولا تو زرینہ
کے تلوؤں میں آگ لگی اور سر پہ بجھی گویا۔ ان کا چہرا
غصے سے لال انار ہو گیا۔
"تم مجھے یہ حکم دینے والے کون ہوتے ہو۔ میرے
گھر کس کو آنا ہے' کس کو نہیں آنا اس کا فیصلہ میں
کروں گی نہ کہ تم۔ میں تمہاری مرضی یا حکم کی پابند
نہیں۔"
"خالہ یہ لوگ زیان کے رشتے کے لیے آئے ہیں
اس لیے میں نے کہا ہے کہ آئندہ مجھے یہاں نظر نہ
آئیں۔"
"زیان ہماری اولاد ہے۔ یہ ہمارا گھر ہے اور زیان کی
شادی کس کے ساتھ کرنی ہے یا ہونی ہے اس کا فیصلہ
بھی ہم نے کرنا ہے تم نے نہیں۔" زرینہ چیخ ہی تو
پڑیں' وہاب تھوڑا خائف سا ہو گیا۔ کچھ بھی سہی وہ اس
وقت خالہ کے گھر میں تھا اور کچھ کہنے کی پوزیشن میں
بھی نہیں تھا۔ اس اچانک صورت حال نے اس کے
حواس سلب کر لیے تھے اوپر سے خالہ شیرنی کی مانند اس
پہ چڑھ دوڑی تھیں۔
"خالہ آپ کو شاید پتا نہیں ہے میں زیان کو پسند
کرتا ہوں شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس کا انداز اب
دفاعی ہو گیا تھا۔
"مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا ورنہ کچھ نہ کچھ
کرتی۔" زرینہ نے بھی ایک دم پینترا بدلا۔
"کیا مطلب خالہ میں سمجھا نہیں۔"
"مطلب یہ کہ امیر علی کبھی نہیں مانیں گے
تمہارے اور زیان کے رشتے کے لیے۔"
"کیوں خالہ آخر کیوں نہیں مانیں گی وہ؟"
"کیوں کہ وہ میرے خاندان میں اپنی بیٹی کی شادی
نہیں کرنا چاہتے۔" زرینہ وہاب کی نرمی اور پسپائی
محسوس کر کے شیر ہو گئی تھیں۔
"خالہ آپ امیر خالو سے بات تو کریں بلکہ میں امی کو
بھیجوں گا رشتے کے لیے فوراً' پہلے میرا ارادہ کچھ اور تھا
پر اب دیر نہیں کروں گا ایسا نہ ہو "ٹور شور" بنانے کے
چکر میں سب کچھ ہی میرے ہاتھ سے نکل جائے۔"
"ٹور شور سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" وہ وہاب کی
بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔
"میں کچھ سیونگ کے چکر میں تھا اتنا ہو جائے کہ
میں گولڈ کا ایک سیٹ منگنی کے لیے اور شاندار سا
سوٹ لے سکوں۔ کسی اچھے ہوٹل میں اپنی منگنی کا
فنکشن دھوم دھام سے کروں۔ زیان کے شایان
شان۔" اس نے ٹور شور کی طویل وضاحت کی۔
"میں امی کو جلدی بھیجوں گا آپ کے پاس۔"
"آپا کو میرے پاس رشتے کی نیت سے بھیجنے کی
ضرورت نہیں ہے ہم عفت خانم کو ہاں کر چکے ہیں۔"
زرینہ نے جھوٹ فراٹے سے بولتے ہوئے اس کے
اعتماد کی مضبوط دیوار میں پہلا سوراخ کیا۔ تب زرینہ کو
وہاب کے چہرے پہ چٹانوں کا سا عزم نظر آیا۔

"آپ نے صرف رشتے کے لیے ہاں کی ہے نا۔ نکاح تو نہیں ہوا نا۔" وہ عجیب سے انداز میں بولا۔
"شریف خاندانوں میں زبانی رضامندی نکاح سے کم نہیں ہوتی۔" جواباً" وہ ٹھنڈے ٹھار لہجہ میں بولیں۔
"خالہ میں اس وقت جا رہا ہوں بعد میں پوری تیاری کے ساتھ آؤں گا۔" وہاب دروازے کو پاؤں سے ٹھوکر مار کر کھولتے ہوئے عبور کر گیا۔ بوا حیرانی اور ناسمجھی کے عالم میں وہاب کو دیکھ رہی تھیں۔
زرینہ نے اسی وقت زیان کے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑایا۔ اس نے لاک کیا ہوا تھا اور سر منہ لپیٹ کے لیٹی تھی۔ وہ مہمانوں کی آمد پہ ایک بار بھی باہر نہیں نکلی تھی۔ حالانکہ عفت خانم نے کتنی بار اس کا پوچھا تھا۔ زرینہ نے جھوٹ بول کر انہیں مطمئن کیا تھا۔ زرینہ کو پتا تھا زیان اس کے کہنے کے باوجود بھی کمرے سے نکل کر عفت خانم سے نہیں ملے گی اس لیے انہوں نے ایسی کوشش کی ہی نہیں تھی۔
زیان نے بولٹ گرا کر لاک ہٹا دیا تھا۔ زرینہ تیز قدموں سے آگے اس کی طرف آئی تھیں۔
"تم مہمانوں کے آنے پہ کمرے سے باہر کیوں نہیں نکلیں؟" انہیں زیان پہ شدید غصہ آرہا تھا کیوں کہ وہی تو اس سارے فساد کی جڑ تھی۔
"وہ آپ کے مہمان ہیں اس لیے آپ خود ہی ڈیل کریں۔"
"خیر میں تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ کمال کی والدہ رشتے کی رضامندی کا جواب لینے آئی تھیں۔ تمہارے ابو کو کمال بہت پسند آیا ہے اس لیے تم خود کو ذہنی طور پر کمال سے شادی کے لیے تیار کرلو۔"
"مجھے نہیں کرنی کسی بھی کمال یا جمال سے شادی۔" وہ سرد لہجہ میں بولی۔
"تمہارے ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ان کے حال پہ رحم کرو۔" زرینہ کا لہجہ کاٹ دار تھا۔
"آپ میرے حال پہ رحم کریں نہیں کرنی مجھے شادی۔" اس بار زیان نے بلاقصد ہاتھ جوڑ دیے۔
"تمہاری ماں خود عیش کر رہی ہے تمہیں میرے سینے پہ مونگ دلنے کے لیے یہاں چھوڑ گئی ہے۔"
زرینہ نے آواز دبا کر ایک ایک لفظ پہ زور دیا۔ یہ زیان کی کمزوری اور دکھتی رگ تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ یک دم متغیر ہوا۔ زرینہ دل ہی دل میں خوش ہوئیں۔
"کمال نہیں پسند تو نہ سہی وہاب بھی تمہارے امیدواروں میں شامل ہے۔" انہوں نے ناک کرا یک اور وار کیا۔
"میں لعنت بھیجتی ہوں وہاب پر اور آپ سے وابستہ ہر چیز پہ۔" زیان زہر میں بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ پہلی بار زرینہ نے اس کے اندر سرکشی کو سر اٹھاتے دیکھا۔
"ایسی صورت میں کمال بیسٹ چوائس ہے۔" غصے میں بھی زرینہ نے عقل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔
"آپ کو کمال اتنا ہی پسند ہے تو رابیل یا مناہل میں سے کسی ایک کی شادی اس کے ساتھ کردیں۔" زیان نے یہ مشورہ دے کر گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔
"رابیل یا مناہل کا نام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ان کی ماں ابھی زندہ ہوں میری بیٹیاں لاوارث نہیں ہیں۔ زبان کاٹ ڈالوں گی جو آئندہ ان کا نام لیا۔ تمہاری ماں کی طرح نہیں ہوں اپنی بچیوں کی بھلائی عزیز ہے مجھے۔"
زیان کا چہرا دھواں دھواں سا ہو گیا۔ زرینہ کا وار نشانے پہ لگا تھا۔ زیان صوفے پہ گرنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔ زرینہ کو اس کا شکست خوردہ چہرا دیکھ کر دلی خوشی ہوئی اپنی ماں کا نام لیے جانے پہ اس کی یہی حالت ہوتی تھی۔ زیان کی آنکھوں میں آنسو ڈول رہے تھے۔ زرینہ اسے چھوڑ کر باہر آگئی۔ اب جو طوفان پیچھے آتا ان کی بلا سے۔ انہیں سروکار نہیں تھا۔
زیان نے وحشیانہ انداز میں تکیے پہ مکے برسائے۔ دیواروں پہ لاتیں ماریں اپنے بال نوچے' لیکن گھٹن

بڑھتی جارہی تھی۔ تھک ہار کر اب وہ گھٹنوں میں سر دیے سسک سسک کر رو رہی تھی۔ اس کی چند ثانیے پہلے والی ساری اکڑ اور تیزی رخصت ہو گئی تھی۔ طوفان آنے کے بعد سناٹے اور خاموشی والی کیفیت تھی۔

☼ ☼ ☼
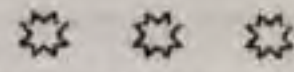
رنم کو گئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ کومل اس کے جانے کے بعد کافی دیر بلاوجہ لان کے چکر کاٹتی رہی۔ وہ اسی کے بارے میں مسلسل سوچ رہی تھی۔ جانے گھر پہنچی ہو گی کہ نہیں۔ یہاں سے نکلے ہوئے اسے دو گھنٹے سے اوپر ہو چکے تھے۔ وہ ناراض ہو کر اس سے رخصت ہوئی تھی اسے منانا دشوار امر تھا' لیکن یہ کام تو کرنا ہی تھا۔ کومل نے اسے فون کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سیل فون اٹھا کر رنم کا نمبر ڈائل کیا۔ پر اس کا نمبر آف جا رہا تھا۔ اس نے تین چار بار ٹرائی کیا' لیکن ہر بار ایک ہی جواب ملا۔

اس نے فراز کا نمبر ڈائل کیا۔ اس وقت کومل کے دل پہ بے پناہ بوجھ تھا وہ فراز سے شیئر کرنا چاہ رہی تھی۔ فراز رنم کا کلوز فرینڈ تھا اسے سمجھا بجھا کر کومل کی طرف سے اس کا دل صاف کر سکتا تھا۔

فراز نے فوراً" فون ریسیو کیا۔ کومل کے بولتے ہی وہ جان گیا کہ وہ اس وقت بہت پریشان ہے۔

"کومل آر یو او کے؟"

"نو ناٹ ایٹ آل۔ فراز رنم اپنا گھر چھوڑ کر میرے پاس آئی تھی' لیکن میں نے سمجھا کر اسے گھر واپس بھیج دیا تھا وہ ناراض ہو کر گئی ہے مجھ سے۔ میں اس کے نمبر پہ کال کر رہی ہوں' لیکن وہ پاور آف ہے۔ تم اس کی ناراضی دور کرنے کی کوشش کرنا ہو سکتا ہے میں کل یونیورسٹی نہ آسکوں بہت ڈسٹرب ہوں۔" جواب میں فراز نے اسے جو کچھ بتایا وہ کومل کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔

وہ گھر نہیں گئی تھی سیدھی فراز کے پاس آئی تھی اور اب وہاں سے بھی غائب تھی۔ یعنی کومل کے سمجھانے کا اس پہ کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"میں اپ سیٹ ہوں بہت۔ میرا خیال ہے اس نے فون پہ میری باتیں سن لی تھیں جو میں احمد انکل کے ساتھ کر رہا تھا۔ گیٹ پہ چوکیدار بھی نہیں تھا جو اسے روکتا یا مجھے انفارم کرتا۔" فراز کی آواز سے اس کی دلی پریشانی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

"فراز وہ کہاں گئی ہے۔ تم نے اس کے گھر سے معلوم کیا؟" کومل کا سوال بہت سے اندیشے سمیٹے ہوئے تھا۔

"ہاں میں نے ابھی ابھی کال کی ہے کسی ملازم نے اٹینڈ کی ہے کال اور بتایا ہے کہ رنم بی بی گھر پہ نہیں ہیں۔"

"اس کا سیل فون بھی آف ہے۔" کومل نے بتایا۔

"سیل فون آف کر کے وہ اپنے گھر ہی چھوڑ آئی ہے۔ اس لیے آف مل رہا ہے۔"

"فراز تم نے احمد انکل کو بتایا اس کے بارے میں؟" کومل نے محتاط ہو کر پوچھا۔

"نہیں میں نے کچھ نہیں بتایا ہے' جب وہ مجھ سے پوچھیں گے۔ تو بتاؤں گا ورنہ نہیں۔"

"فراز وہ مجھ سے بھی تو پوچھیں گے نا۔"

"ڈونٹ وری کومل۔" فراز نے اسے تسلی دی۔

"وہ کہاں ہو گئی اب؟"

"مجھے جیسے ہی پتا چلا کہ وہ ڈرائنگ روم میں نہیں ہے تو اسی وقت میں نے اسے پورے گھر میں تلاش کیا۔ ناکامی پہ میں نے اسے ادھر ادھر قریب کے علاقے میں ڈھونڈا۔ ابھی تمہاری کال آنے سے پانچ منٹ پہلے ہی گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے آیا ہوں۔" فراز خود بہت پریشان تھا۔

"میں راعنہ سے کال کر کے پوچھتی ہوں اور اشعر سے بھی۔ ہو سکتا ہے وہ ان کی طرف ہو۔" کومل پر امید تھی۔

"اشعر کو میں نے کال کی تھی اس نے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ باقی میرا نہیں خیال کہ وہ راعنہ کی طرف جا سکتی ہے۔ پھر بھی تم پوچھ لو۔"

فراز کے ساتھ رابطہ منقطع کر کے کومل نے فوراً راعنہ کو کال ملائی۔ فراز کا اندیشہ سچ ثابت ہوا۔ رنم اس کی طرف بھی نہیں گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

امیر علی کا کمرا ڈرائنگ روم کی مشرقی سمت میں واقع تھا اس لیے گھر کے دیگر حصوں میں ہونے والی سر گرمیوں کی سن گن بہت کم ان تک پہنچ پاتی تھی۔ جب تک کوئی بات مکمل طور پہ ان کے علم میں نہ لائی جاتی وہ آگاہی سے محروم رہتے۔ پر وہاب اور زرینہ کے جھگڑے کی آواز ان کی سماعتوں تک بھی پہنچی تھی اسی لیے انہوں نے زرینہ سے استفسار کیا۔

"یہ وہاب اتنا تیز تیز کیوں چلا رہا تھا؟" دوائی کھاتے کھاتے انہوں نے اچانک سوال کیا۔

"اس کا دماغ خراب ہو رہا ہے اور بس۔" زرینہ نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"وہ زیان کا نام بھی لے رہا تھا کیوں؟" اس بار سوالیہ بے بسی ان کے لہجے سے واضح تھی۔

"اصل میں وہاب کی مرضی ہے زیان سے اس کا رشتہ ہو جائے پر آپا روبینہ ایسا نہیں چاہتیں انہوں نے خاندان کی ہی ایک لڑکی وہاب کے لیے پسند کر رکھی ہے۔ وہ میرے پاس آیا تھا کہ اس کی ماں کو سمجھاؤں۔" زرینہ نے اعتماد سے جھوٹ بولا۔

"یہ میرا گھر ہے کوئی مچھلی بازار نہیں ہے، جو وہ اتنا شور شرابا کر کے گیا ہے۔" امیر علی کا انداز بتا رہا تھا کہ انہوں نے بہت کچھ سن لیا ہے۔

"معفت خانم کو آپ کوئی صاف جواب دے ہی نہیں رہے ہیں زیان کی کشتی جب تک کسی کنارے نہیں لگتی تب تک یہی ہو گا۔ آپ کو کتنی بار کہا کہ کمال کے رشتے کے لیے ہاں کر دیں ورنہ زیان کی ماں کی شہرت کی وجہ سے اس کے ساتھ یہی ہو گا۔"

زرینہ نے ان کے زخموں پہ نمک چھڑکنے میں انتہا کر دی تھی۔ جواباً" وہ بے بسی سے انہیں دیکھ کر رہ گئے۔ بہت سال پہلے انہوں نے ذرا سے شک کے پیچھے اپنا گھر اجاڑ کر زرینہ سے شادی رچائی تھی اور اسے ایک ایک کمزوری سے آگاہ کیا۔ زرینہ بیگم تب سے اب تک ان کی کمزوریوں سے کھیلتی آ رہی تھی۔ زیان کی صورت میں ایک جیتا جاگتا کھلونا بھی ان کے پاس تھا۔

"بس کر جاؤ زرینہ بیگم۔ میں نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔" امیر علی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا تھا۔ وہ دور بیٹھی تمسخرانہ نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼
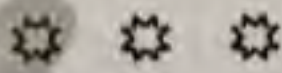
عنیزہ سونے کے لیے لیٹ چکی تھیں۔ ارسلان مطالعے میں مصروف تھے۔ عنیزہ بستر پہ نیم دراز ہوئیں تو انہوں نے بھی کتاب رکھ دی۔

"کل کے لیے تیاری کر لی ہے نا؟" وہ انہیں سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

"جی ہاں سب تیاری مکمل ہے۔" وہ آنکھیں موندے موندے بولیں۔ ان کے چہرے پہ تھکن تھی۔ شاید دن بھر کی مصروفیت کا نتیجہ تھا۔ صبح انہیں اپنے کام کے سلسلے میں دوسرے شہر جانا تھا اور قیام ہوٹل میں تھا۔

ارسلان ادبی ذوق کے مالک تھے وقتاً" فوقتاً" وہ شہر میں ہونے والی ادبی سرگرمیوں میں شرکت کرتے رہتے تھے۔ تقاریب کے دعوت نامے آئے دن ملتے۔ ان دونوں یعنی ملک ارسلان اور عنیزہ نے کچھ روز کے لیے گاؤں سے باہر جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ عنیزہ ویسے بھی ادبی سرگرمیوں اور دلچسپیوں میں ان کے ساتھ ہی ہوتی تھیں۔

ملک ایبک کو ان دونوں کے ہوٹل میں قیام پہ اعتراض تھا کیوں کہ شہر میں ان کا عالیشان گھر موجود تھا۔ پر ہوٹل میں قیام کرنا ان کی مجبوری تھی۔ کیوں کہ وہ جس ادبی تقریب میں شرکت کرنے جا رہے تھے وہ اسی ہوٹل میں منعقد ہونی تھی اسی لیے ملک ارسلان نے وہاں قیام کو اولیت دی تھی کیوں کہ تقریب میں ان

کے پسندیدہ شعرا بھی مدعو تھے۔ ایبک سے انہوں نے معذرت کرلی تھی۔

اولاد سے محرومی کے دکھ کو ان دونوں میاں بیوی نے اپنی اپنی مصروفیات میں بھلانے کی کوشش کی تھی اور اس میں کافی کامیاب بھی تھے۔ اس بار شہر آنے کا فیصلہ انہوں نے عنیزہ کی ذہنی صحت کے پیش نظر کیا تھا کیوں کہ انہیں بار بار ڈپریشن کے دورے پڑنے لگے تھے۔

وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں گم ہو رہی تھیں۔ ماضی جو ہمیشہ سے ان دونوں کے لیے اذیت ناک رہا تھا۔ ملک ایبک اسے ماضی کے عمیق غاروں سے نکالنا چاہ رہے تھے اور اس میں کافی کامیاب بھی رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عنیزہ کل شہر جانے کے تصور سے خوش تھیں۔

☼ ☼ ☼
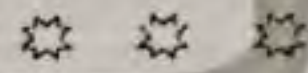
احمد سیال پاگلوں کی طرح رنم کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

رات گئے انہوں نے باری باری رنم کے سب دوستوں کو کال کرکے اس کے بارے میں پوچھا۔ فراز نے سچائی سے سب حالات ان کے گوش گزار کردیے تھے۔ وہ خود چل کر فراز کے پاس آئے تھے۔ کومل کی زبانی رنم کی بابت سن کر وہ ڈھے سے گئے۔

فراز کو ساتھ لے کر انہوں نے رنم کی سب سہیلیوں' دوستوں سے اس کے بارے میں پوچھا۔ بدنامی کے ڈر سے وہ اس بات کو پھیلانے سے ڈر رہے تھے ان کے دوست احباب رنم کی گمشدگی سے واقف ہوجاتے تو کتنی باتیں بنتیں انہیں اپنی عزت اور خودداری عزیز تھی۔ اس لیے خاموشی سے انہوں نے رنم کی تلاش کے لیے ممکنہ جگہیں دیکھ ڈالیں۔ وہ کہیں بھی نہیں تھی اور کوئی ایسا ثبوت بھی نہیں تھا جس کی بنا پر وہ اسے اغوا شدہ گردانتے۔ وہ خود اپنی مرضی سے گھر چھوڑ کر گئی تھی جو گم ہوجاتے ہیں انہیں تلاش کیا جاسکتا ہے پر' وہ جو اپنی مرضی سے گئی تھی احمد سیال

اسے کہاں تلاش کرتے اس نے کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا۔ فراز کے مشورے پہ انہوں نے احتیاطاً" رنم کی گم شدگی کی رپورٹ پولیس میں درج کروادی تھی۔

فراز نے ان کی بہت مدد کی تھی ہر جگہ رنم کو تلاش کرنے کی مہم میں وہ احمد سیال کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ رنم کی پراسرار گمشدگی احمد سیال کے ساتھ ساتھ باقی ان سب دوستوں کے لیے بھی معمہ بنی ہوئی تھی۔

طویل سیاہ رات گزر چکی تھی۔ سپیدہ سحر اندھیری رات کا سینہ چیرتے ہوئے نمودار ہونے کی فکر میں تھا۔ احمد سیال پوری رات میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوپائے تھے۔ انہیں ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ شدید کرب کے حصار میں ہیں ان کی یہ جان کنی کی کیفیت ختم ہونے والی نہیں تھی۔ ان کی رنم گھر پہ نہیں تھی۔ وہ اپنے گھر تھے پر ان کی لاڈلی بیٹی نے کہاں اور کیسے رات گزاری تھی وہ اس سے لاعلم تھے۔

محض ایک رات میں ہی وہ برسوں کے بیمار نظر آرہے تھے۔ چوڑے کندھے جھک گئے تھے چہرے پہ زردی کھنڈی تھی۔ انہوں نے پولیس میں رپورٹ درج کروادی تھی۔ ان کا دوست ایس پی کوندل خود رنم کی گم شدگی سے متعلق معاملات کو دیکھ رہا تھا پر ابھی تک اس کی طرف سے بھی کوئی حوصلہ کن خبر نہیں ملی تھی۔

رنم کو اگر خبر ہوجاتی کہ احمد سیال کس کرب اور اذیت سے گزر رہے ہیں تو ایسے گھر چھوڑ کر جانے سے پہلے یقیناً" وہ بہت بار سوچتی۔ رات سے انہوں نے کھانے کے نام پہ پانی کے چند گھونٹ ہی پیے تھے۔

☼ ☼ ☼

رنم کو ہوٹل میں کمرا لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ہوٹل بہت اچھا تھا۔ کمرا بھی اس کی پسند کے مطابق تھا پر اندر اندر ہی کوئی چیز رہ کر پریشان کررہی تھی۔ ہوٹل میں رنم کا تیسرا دن تھا۔ اس دوران وہ ایک بار بھی اپنے کمرے سے باہر نہیں

نکلی۔ تینوں وقت ناشتا چائے پانی کھانا کمرے میں ہی منگواتی۔ ہوٹل کے کچھ ملازم اور بیرے اس کی طرف سے نامعلوم تجسس کا شکار ہو رہے تھے۔ نہ وہ کہیں گئی تھی نہ اسے کوئی ملنے آیا تھا۔ اس شاندار سہولیات سے مزین ہوٹل میں اس نے پورے ایک ماہ کے لیے کمرا بک کروایا تھا۔

سامان کے نام پہ اس کے پاس صرف چھوٹا سا ایک سوٹ کیس اور ہینڈ بیگ تھا اور سب سے حیرت انگیز بات اس کے پاس سیل فون بھی نہیں تھا۔ صفائی کرنے والے لڑکے نے نظر بچا کر اس کے سامان اور کمرے کی سرسری سی تلاشی لی تھی۔

ہوٹل میں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں کسی کا قیام مختصر اور کسی کا طویل ہوتا ہے پر رنم کی طرف سے ہوٹل اسٹاف کے کچھ لوگ تجسس کا شکار ہو رہے تھے۔ لڑکی خوب صورت اور اونچے گھرانے کی لگ رہی تھی صاحب حیثیت بھی تھی تب ہی تو اس مہنگے ہوٹل میں آکر ٹھہری تھی۔ ورنہ عام انسان تو یہاں کی ایک چائے کی پیالی بھی افورڈ نہ کر سکتا تھا۔

رنم کے پاس پیسے تیزی سے کم ہو رہے تھے۔ وہ ہینڈ بیگ میں موجود سب چیزیں باہر نکال نکال کے دیکھ رہی تھی۔ بظاہر سب چیزیں پوری تھیں پھر بھی کہیں نہ کہیں کسی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ رنم ہینڈ بیگ میں موجود چیزیں اندر ڈال کر نقد پیسے گن رہی تھی جب دروازے پہ ہلکی آواز میں دستک ہوئی۔

"ویس کم ان۔" اس نے مصروف انداز میں کہا خود وہ اپنے کام میں لگی رہی۔ اسے کھانا پہنچانے والا بیرا دبے قدموں اندر داخل ہوا۔ وہ رنم کی پشت پہ کھڑا تھا۔ آہٹ پہ وہ چونک کر سیدھی ہوئی اور بیرے کو دیکھ کر بڑبڑاتے ہوئے پیسے اور دیگر چیزیں سب تکیے کے نیچے کر دیں۔ پر اس کے چھپانے سے پہلے ہی وہ سب کچھ دیکھ چکا تھا۔

بیرے کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ اس نے اپنے تاثرات سے ذرا بھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ سب دیکھ چکا ہے۔ اس نے کھانے کی ٹرے ٹیبل پہ رکھی اور ادب سے سلام کر کے باہر آگیا۔ بیرے نے اسے پیسے گنتے دیکھا تھا پر ساتھ ہی اس نے ہینڈ بیگ سے باہر رہ جانے والے سونے کی زیورات بھی رنم کی لاپروائی کی وجہ سے دیکھ لیے تھے۔ اسے پوری امید تھی کہ لڑکی کے پاس اور بھی بہت کچھ ہو گا کیوں کہ وہ موٹی آسامی لگ رہی تھی۔

اس کی نیت میں فتور آچکا تھا۔ لڑکی جوان اور خوب صورت تھی سونے پہ سہاگا اکیلی تھی ابھی تک تو اس نے لڑکی کے ساتھ کسی کو بھی نہیں دیکھا تھا نہ اس نے کسی سے رابطہ کیا تھا۔ یعنی دوسرے الفاظ میں وہ اس کے لیے آسان ترین شکار ثابت ہو سکتی تھی۔ اس لیے رنم کو کھانا پہنچا کر واپس جاتے ہوئے اسے اپنے منصوبے کے بارے میں سوچتے ہوئے سرور آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼
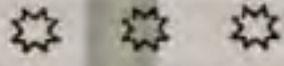
کمرے میں بند رہ رہ کر رنم اکتا گئی تھی۔ ڈرتے ڈرتے اس نے پہلی بار کمرے سے باہر قدم رکھا۔ اس نے بیرے کو پہلے ہی کھانا لانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ آزاد فضا میں تھوڑی دیر بیٹھ کر اپنے مسائل کا حل سوچنا چاہ رہی تھی سب سے بڑا مسئلہ تو تیزی سے ختم ہوتی ہوئی رقم کا تھا۔

اس نے گھر سے نکلنے سے پہلے گنے بغیر پیسے بیگ میں ڈالے تھے اچھی خاصی رقم تھی، لیکن اسے گننے کے بعد کم لگ رہی تھی۔ اس کی فکر اپنی جگہ تھی، لیکن ابھی اس کے پاس اچھی خاصی مالیت کے زیورات بھی تھے جو اس کی ذاتی ملکیت تھی۔ کریڈٹ کارڈ اور اے ٹی ایم کارڈز اس کے علاوہ تھے۔ اس کے باوجود بھی وہ پریشان تھی۔ شاید اسے پیش آنے والی تلخ حقیقتوں کا کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا ایک ثانیے کے لیے اس کے جی میں آئی کہ گھر واپس چلی جائے، لیکن فوراً ہی اس نے اپنے اس خیال کا گلا مضبوطی سے گھونٹ دیا۔ وہ احمد سیال سے بہت شدید ناراض تھی۔

کھانا ویٹر نے سرو کر دیا تھا پر اس نے کھانے کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

اسی ڈائننگ ہال میں اور بہت سے لوگوں کے ساتھ عنیزہ بھی تھیں۔ عنیزہ کی نظر کھانے کے دوران اچانک رنم پہ پڑی۔ سب ہی کھانا کھا رہے تھے پر شکل سے اداس اور پریشان نظر آنے والی لڑکی کھانے کی طرف بالکل بھی متوجہ نہیں تھی۔ کھانے کو سامنے رکھے وہ غیر مرئی نکتے کو دیکھ رہی تھی۔ عنیزہ کو اپنے بائیں پہلو میں شدید چبھن کا احساس ہوا۔ کرب کی ایک لہر پورے وجود میں ایک ثانیے کے لیے بیدار ہوئی۔ دل اس اجنبی لڑکی کی طرف کسی معصوم بچے کی مانند ہمک رہا تھا۔ اپنی اس کیفیت سے وہ خود بھی حیران تھیں۔ لڑکی کے چہرے کی اداسی دیکھ کر اس کا اپنا دل گہری اداسی میں ڈوب گیا تھا۔ بہت ضبط کے باوجود جب عنیزہ سے رہا نہیں گیا تو وہ اٹھ کر اس کی ٹیبل کی طرف آگئیں۔ جواب بھی خوف زدہ ہرنی کی مانند ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کسی خوف کے گہرے سائے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

"کیا میں یہاں آپ کے پاس بیٹھ سکتی ہوں؟"

عنیزہ کی نرم شائستہ آواز پہ وہ چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ اب اس کے چہرے پہ خوف کے سایوں کی جگہ ایک رسمی مسکراہٹ نظر آرہی تھی پر اس میں بھی ہزاروں سوال اور خدشے تھے۔ جانے یہ کون تھیں اور کیوں اس کے پاس آئی تھیں۔

"پلیز بیٹھیے۔" عنیزہ کا لہجہ لباس اور شکل و صورت ہر گز بھی نظر انداز کیے جانے کے قابل نہ تھی تب ہی رنم نے انہیں بیٹھنے کی آفر کی۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ شکریہ ادا کرتے ہوئے بیٹھ گئیں۔

اگلے دس منٹ میں رنم ان کے ساتھ کافی اطمینان سے باتیں کر رہی تھی۔ ملک ارسلان اپنے ایک شاعر دوست کے ساتھ کسی ادیب سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے عنیزہ کو بھی ساتھ چلنے کی آفر کی تھی پر انہوں نے نرمی سے منع کر دیا۔ تب ہی تو وہ یہاں اکیلے کھانا کھا رہی تھیں۔

ملک ارسلان کی ساتھ نہ جانے کی صورت میں ہی تو ان کی ملاقات نمناں نامی اپنی اپنی سی لگنے والی لڑکی سے ہوئی تھی۔ ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا تھا ورنہ وہ اسے کیسے ملتیں۔ دل کی اس بے اختیار کیفیت پہ وہ خود بھی حیران تھیں۔

نمناں اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ عنیزہ نے اسے اپنا کانٹیکٹ نمبر دیا تھا اور ہوٹل کے روم کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ رنم نے انہیں اپنا نام نمناں بتایا تھا۔ عنیزہ نے اسے کافی ساری باتیں کی تھیں۔ سوال پوچھے تھے پر وہ صفائی سے ٹال گئی تھی۔

☼ ☼ ☼
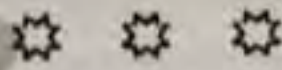
ملک ارسلان رات کو کافی لیٹ ہوٹل واپس آئے۔ عنیزہ بے تابی سے ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ محبوب بیوی کے چہرے پر دبا دبا جوش انہیں ایک نظر ڈالتے ہی محسوس ہو گیا تھا۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔ وہ نمناں کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔ ملک ارسلان ان کی اس قدر دلچسپی محسوس کر کے خود بھی پوری توجہ سے سن رہے تھے۔

"جانے کیا بات ہے پہلی ہی نظر میں وہ مجھے اپنی اپنی سی لگی ہے۔ کچھ پریشان اور کھوئی کھوئی سی تھی میں نے بہت پوچھا پر اس نے بتایا نہیں۔"

"تو کل پوچھ لینا۔" ارسلان نے مسکراتے ہوئے مشورہ دیا۔

"ہاں میں نے اسے اپنا سیل نمبر بھی نوٹ کروایا ہے اور روم نمبر بھی بتایا ہے۔" عنیزہ فوراً بولیں۔

"تو ہماری بیگم کو وہ لڑکی بہت پسند آگئی ہے۔" ملک ارسلان محبت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"اسے دیکھ کر مجھے بہت کچھ یاد آگیا ہے۔ یہاں پہلو میں چبھن ہو رہی ہے۔" عنیزہ اچانک سنجیدہ ہو گئیں۔ ان کا مسکراہٹ سے مزین روشن چہرا اور جوت دیتی نگاہیں بجھ سی گئی ہیں۔ ملک ارسلان اچھی طرح جانتے تھے اب کیا ہوگا کیونکہ عنیزہ ان کی طرف سے کروٹ بدل کر لیٹ گئی تھیں۔ بظاہر آنکھیں بند

کیسے وہ سوری تھیں مگر حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔

آج کی شب ان پہ بہت بھاری تھی۔ انہوں نے خیالوں ہی خیالوں میں ماضی کا تکلیف دہ سفر طے کرنا تھا۔ اس کے اختتام پہ ان کا درد اور بھی بڑھ جاتا تھا۔ یہ برسوں سے ہو رہا تھا لیکن ابھی تک اس اذیت ناک سفر کا پہلا پڑاؤ ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ملک ارسلان ان کی اذیت اور درد سے واقف ہونے کے باوجود انجان بنے ہوئے تھے وہ نہیں چاہتے تھے عنیزہ کا بھرم ٹوٹے۔

☼ ☼ ☼
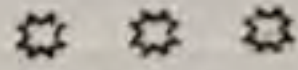
بدحواسی میں رنم نے پورا بیگ چھان مارا تھا۔ ایک ایک چیز باہر نکال کر دیکھی۔ نہ جیولری تھی نہ ہی کریڈٹ کارڈز۔ صرف اے ٹی ایم کارڈز پڑے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ اس نے موہوم سی امید کے سہارے دوسرا بیگ کھولا کہ شاید اس نے سب چیزیں بے دھیانی میں وہاں رکھ دی ہوں پر وہاں تو صرف استعمال کے کپڑے اور دیگر اشیاء تھیں۔

اس کا جی چاہ رہا تھا دھاڑیں مار مار کے روئے۔ اب اس کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ وہ صرف ایک بار رات کو کھانے کھانے دوسرے الفاظ میں اندرونی گھٹن اور خلفشار سے پیچھا چھڑانے کے لیے کمرے سے باہر گئی تھی۔ اس دوران سب کچھ صفائی سے پار کیا گیا تھا۔ اس بات کا اسے سو فی صد یقین تھا۔

یہ حادثہ اس کے ساتھ رات کو ہوا تھا۔ اب دوپہر ہو چلی تھی۔ وہ صدمے کی حالت میں بیٹھی تھی۔ دوپہر سے شام ہو گئی۔ وہ باہر نہیں نکلی۔ روم سروس کی طرف سے کھانا آیا اس نے دروازہ ہی نہیں کھولا۔ اس کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔

رات سر پہ تھی۔ ایک بار پھر دروازے پہ دستک ہوئی۔ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے دروازہ کھولا۔ بیرا کھانا لایا تھا۔ رنم نے پیچھے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ خود وہ دروازے کے پاس کھڑی تھی کہ بیرا جائے تو وہ دروازہ اندر سے لاک کرے۔ پر وہ کھانے کی ٹرے رکھ کر اسی طرح کھڑا رنم کو دیکھ رہا تھا۔

"آپ پریشان لگ رہی ہیں۔ کوئی پرابلم ہے بتائیں۔" ہوٹل کا معمولی سا ملازم بڑے معنی خیز انداز میں پوچھ رہا تھا جیسے رنم کا وہ بڑا ہمدرد رہی ہو۔

"تم سے مطلب جاؤ یہاں سے۔" رنم کا فطری غصہ عود کر آیا۔

"میں آپ کے بہت کام آسکتا ہوں۔ صرف ایک موقع دیں مجھے۔ مجھے سب معلوم ہے آپ اکیلی ہیں، پریشان ہیں۔ آپ کے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں آپ کے سب مسئلے حل کر سکتا ہوں۔ اگر آپ۔۔۔" رنم کے غصے کے باوجود اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ اس کے ادھورے فقرے کا مفہوم وہ اچھی طرح جان گئی تھی۔

"یہاں سے فوراً نکل جاؤ" میں مینجر سے تمہاری شکایت کروں گی۔" وہ اسے کھوکھلے لہجے میں دھمکی دے رہی تھی۔ ہوٹل کے اس ملازم کو اس کی مجبوری اور کمزوری کا احساس تھا' تب ہی تو ڈھٹائی سے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"میں رات کام ختم کر کے آؤں گا۔ میری بات مانو گی تو فائدے میں رہو گی۔ ویسے مجھے تم گھر سے بھاگی ہوئی لگتی ہو۔ تمہارا عاشق عیش کرنے کے بعد تمہیں چھوڑ گیا ہے اور تم اب مشکل میں ہو۔ اکیلی لڑکی ہو سب ہوٹل اسٹاف کی نگاہوں میں آگئی ہو۔ چند دن کی بات ہے' سب نے تمہیں بہتی گنگا سمجھ کر ہاتھ دھونے ہیں۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ مجھ سے سیٹنگ کر لو۔ فائدے میں بھی رہو گی اور سب سے بچ بھی جاؤ گی۔ اچھی طرح سوچ لو۔ ورنہ تم جیسی اکیلی لڑکی کو مار کر غائب کر دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

وہ انسانی نفسیات کا ماہر لگ رہا تھا۔ رنم کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے بہت کچھ بھانپ گیا تھا۔ رنم بالکل سن ہو گئی تھی۔ وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رنم نے دروازہ بند کیا اور بیگ میں ہاتھ مار کر اپنا سیل فون ڈھونڈا۔ وہ ہوتا تو ملتا۔ اسے یاد آیا وہ اپنا سیل فون تو آف کر کے اپنے بیڈ روم میں ہی چھوڑ آئی تھی۔

وہ اس وقت کو پچھتا رہی تھی جب سیل فون گھر چھوڑ کر نکلی تھی۔

اس کے دل میں اچانک ہی خیال آیا تھا کہ وہ اپنے گھر فون کرے۔ پاپا کو سب کچھ بتا دے اور پھر دیکھے کہ وہ کیسے ان ہوٹل والوں کی ایسی کی تیسی کرتے ہیں۔ مگر اس کے پاس فون نہیں تھا پیسے بھی نہیں تھے' پر وہ ہوٹل کے ریسپشن سے تو فون کر سکتی ہے۔ اس خیال نے اس کے قدموں میں تیزی بھر دی۔ اگلے پانچ منٹ میں وہ ہوٹل کے ریسپشن پہ موجود تھی۔ وہاں پہ اس وقت ہوٹل اسٹاف کے تین نوجوان کھڑے تھے۔ تینوں نے اسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

اس نے بے ربط ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں مدعا بیان کیا تو ایک آدمی کی مسکراہٹ گہری ہوگی۔ گویا اس کے کمرے میں کھانا سرو کرنے والے بیرے نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ اس کے سب ساتھیوں کی نظروں میں آگئی ہے۔ ایک نے جیسے اس کی غیر ہوتی حالت پہ ترس کھاتے فون اس کی طرف کھسکایا۔ وہ ریسیور اٹھائے خالی الذہنی کے عالم میں پاپا کا نمبر یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اسے نمبر یاد نہیں آرہا تھا۔ حالانکہ پاپا کا نمبر اسے ازبر تھا۔ اس نے تین چار پاپا کا نمبر یاد کر کے ڈائل کرنے کی کوشش کی' پر اسے ناکامی ہوئی۔ اس ناکامی پہ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اچانک اسے یاد آیا وہ فکسڈ لائن نمبر پہ بھی تو کال کر سکتی ہے۔ اسے نمبر یاد تھا۔ اس نے تیزی سے نمبر پش کیے۔

بیل جا رہی تھی۔ بہت دیر بعد کال ریسیو ہوئی۔ کسی نے زور سے ہیلو کہا۔ پس منظر سے رونے' پیٹنے' آہ و بکا کی دلدوز آوازیں آرہی تھیں۔ اس کے دل نے ایک بیٹ مس کر دی۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ اس کے پاپا کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس کی زبان جیسے جلنے سے انکاری تھی۔ اس کی متغیر ہوتی رنگت اور لرزتا کانپتا جسم دیکھ کر ایک نوجوان نے فون کا ریسیور اس سے لے لیا۔

وہ خود بات کر رہا تھا۔ شاید اسے رنم کی حالت پہ ترس آگیا تھا۔ ایک منٹ بعد اس نے فون بند کیا تو اس کی آنکھوں اور لہجہ میں ہمدردی تھی۔ دوسرے دو نوجوانوں کی نسبت اس نے مہذب رویے کا مظاہرہ کیا۔

''آپ نے جس نمبر پہ کال کی ہے' اس گھر کے مالک کا آج انتقال ہو گیا ہے۔'' اس نے پگھلا سیسہ رنم کے کانوں میں انڈیلا۔

وہ بہت مشکل سے خود کو کمرے تک واپس لائی اور بستر پہ گر سی گئی۔ صدمات کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا' اس کا برا وقت آگیا تھا۔ جیولری' نقدی سب کچھ پراسرار طور پہ غائب ہو چکا تھا۔ وہ ہوٹل اسٹاف کی نگاہوں میں تھی۔ سب رال ٹپکانے کو تیار بیٹھے تھے اور اب پاپا بھی اسے چھوڑ کر جا چکے تھے۔ وہ تو گھر واپس آنے کے لیے انہیں کال کرنے گئی تھی۔ واپسی پہ دل پہ بھاری صدمے کا بوجھ اٹھائے لوٹی۔ اب اس کی عزت اور جان خطرے میں تھی۔ اسے اپنے بچاؤ کا راستہ تلاش کرنا تھا۔

اچانک اسے عنیزہ ملک کا خیال آیا۔ انہوں نے اسے اپنا فون نمبر دیا تھا اور روم نمبر بھی بتایا تھا۔ وہ سیکنڈ فلور روم نمبر 26 میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ پاپا تو رہے نہیں تھے۔ اب وہ گھر کس منہ سے جاتی۔ کاش وہ گھر نہ چھوڑتی' کاش وہ ان کی بات مان لیتی۔ منہ پہ پانی کے چھپاکے مارتی وہ زارو قطار روتی جا رہی تھی۔ وہ عنیزہ ملک کے پاس جانے کے لیے تیار تھی۔ اس وقت اس کے پاس اور کوئی بھی راستہ نہیں بچا تھا۔

اپنے اس گھر میں کیسے جاتی' جہاں اب پاپا نہیں رہے تھے۔ سب نے اسے پاپا کا قاتل ٹھہرانا تھا۔ اس کی ضد تھی کہ وہ ان سے کچھ نہیں لے گی' تو یہ دربدری و محرومی کی سزا اس کے لیے بالکل جائز تھی۔ روم نمبر 26 کے سامنے کھڑے دروازہ ناک کرتے وہ اپنے پاپا کے بارے میں ہی سوچے جا رہی تھی۔

تیسری دستک پہ دروازہ کھل گیا۔ اندر عنیزہ کے ساتھ ملک ارسلان بھی تھے۔ وہ بجلی کی تیزی سے اندر آئی۔

''پلیز۔۔۔ ہیلپ می۔۔۔'' وہ عنیزہ ملک کے ہاتھ پکڑ

کر بکھرے ہوئے لہجہ میں بولی۔ آنسوؤں کی برسات اس کی آنکھوں سے جاری تھی۔ وہ دونوں پریشانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ نہ جانے یہ ستم رسیدہ حرماں نصیب کون تھی۔ کون سا دکھ پہنچا تھا اسے جو اس کی آنکھیں ساون بھادوں کا منظر پیش کر رہی تھی۔ روتے روتے وہ بول رہی تھی اور بار بار اس کی آواز ڈوب رہی تھی جیسے بولنے کی طاقت ختم ہو گئی ہو۔

اس کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا لب لباب کچھ یوں تھا کہ ہینڈ بیگ میں سے اس کی سب چیزیں غائب ہو گئی ہیں۔ والدین حیات نہیں ہیں۔ وہ اکیلی ہے۔ وہ اتفاقی طور پہ ایک حادثے کا شکار ہو کر اس ہوٹل میں پہنچی ہے۔ اس کی جمع پونجی پہ کسی نے ہاتھ صاف کر دیا ہے اور اب اسے اپنی جان اور عزت کی طرف سے شدید خطرہ ہے۔

وہ جس طرح رو رہی تھی جس ابتر حالت میں تھی۔ اس پہ کسی طور بھی یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس کی من موہنی معصوم صورت دھوکا دینے والی نہیں لگ رہی تھی۔ ملک ارسلان نے عنیزہ کو اشارہ کیا کہ رنم کو بٹھائے، تسلی دے، خود بخود ہی ان کے دل میں نرم گوشہ پیدا ہو۔ عنیزہ نے گلاس میں پانی ڈال کر زبردستی اسے پلایا۔

"میں مینجر سے خود بات کرتا ہوں۔" ملک ارسلان نے اسے تسلی دی۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سب کچھ گنوا چکی ہوں۔ اب عزت نہیں گنوانا چاہتی۔" اس بار ہچکیوں سے اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ عنیزہ کی اپنی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ اس اجنبی لڑکی کے لیے وہ اپنے دل میں بے پناہ محبت محسوس کر رہی تھیں۔ اس کا دکھ انہیں اپنا دکھ لگ رہا تھا۔ "اب تم کیا کرو گی؟" عنیزہ نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

"میں بے سہارا ہوں، بے آسرا ہوں، اتنی طاقت نہیں ہے کہ کچھ کر سکوں۔" آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے بہے جا رہے تھے۔ عنیزہ نے ارسلان کو اشارہ کیا۔ دونوں رنم کو کمرے میں چھوڑ کر باہر آ گئے۔

جانے کیا بات تھی کہ رنم کا دل چاہ رہا تھا ان پہ اعتبار کر لے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ جب وہ دونوں اسے کمرے میں اکیلا چھوڑ کر باہر نکلے تو اسے ان کی نیت پہ کوئی شک نہ ہوا۔

عنیزہ ملک ارسلان سے رنم کے بارے میں بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ اسی لیے دونوں ہوٹل کے ایک الگ تھلگ گوشے میں آ گئے، جہاں چہل پہل کافی کم تھی۔ "یہ لڑکی بہت دکھی اور ستم رسیدہ لگتی ہے، ہے بھی اکیلی، اب کیا کرنا ہے اس کا، ہم سے کتنی امیدیں لے کر مدد مانگنے آئی ہے۔" عنیزہ نے بات کا آغاز کیا۔

"میں اپنے ایک دوست کو کال کرتا ہوں۔ پولیس ڈپارٹمنٹ میں اعلا عہدے پہ ہے۔ اس لڑکی کو بحفاظت دارالامان پہنچا دے گا یا بے سہارا عورتوں کے محفوظ مرکز میں۔"

"اس کی شکل و صورت دیکھی ہے آپ نے۔ میں نے بے سہارا عورتوں کے مرکز کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ میں اس حق میں نہیں ہوں کہ یہ دکھی لڑکی وہاں جائے۔"

"تو پھر تم ہی بتاؤ کیا، کیا جائے؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

"نہ جانے کیا بات ہے، یہ لڑکی چند گھنٹوں میں ہی مجھے اپنی اپنی محسوس ہونے لگی ہے۔ ایک بات کہوں، اگر آپ برا نہ مانیں تو۔۔۔" وہ ہزاروں امیدیں لیے ملک ارسلان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"ہاں بولو تو سہی۔ پہلے تم نے کبھی ایسے اجازت لینے کا تکلف نہیں کیا بات کرنے کے لیے تو پھر اب یہ غیروں والی باتیں کر رہی ہو۔"

"ملک صاحب بات ایسی ہے کہ کرنے سے پہلے سو مرتبہ سوچنا پڑتا ہے۔"

"ہاں بولو تو اب۔۔۔"

"ملک صاحب اگر ہم اس لڑکی کو ساتھ لے جائیں تو؟" عنیزہ نے ڈرتے ڈرتے کہا تو وہ سوچ میں ڈوب گئے۔

"میں لینے کو تو ساتھ لے جاؤں پر سوچ لو۔" کچھ

توقف کے بعد وہ گویا ہوئے۔ "جوان ہے۔ خوب صورت ہے کسی اچھے خاندان کی لگتی ہے۔ ہماری حویلی میں بہت جگہ ہے رہ لے گی۔ ساتھ اسے حویلی میں ہی کسی کام پہ لگادیں گے۔" عنیزہ نے ملک ارسلان کو اور سوچنے کا موقع نہیں دیا۔

"بھائی جان کو اعتراض نہ ہو اس پہ۔" ملک ارسلان نے اس طرف توجہ دلائی تو چند لمحوں کے لیے وہ بھی سوچ میں پڑ گئیں۔

"میں ان سے خود بات کروں گی۔ ویسے بھی یہ ہماری طرف رہے گی۔ بے چاری سی لڑکی ہی تو ہے کوئی نہیں ہے اس کا۔ ثواب ہوگا ہمیں اگر تحفظ دیا اس کو تو اور اللہ بھی خوش ہوگا۔" عنیزہ نے انہیں خاموش دیکھ کر جذبہ ہمدردی ابھارنے کی کوشش کی۔

"میں صرف اسے اس لیے اپنے ساتھ لے کر جارہا ہوں کہ تم اس عمل سے خوش ہوگی۔" ملک ارسلان محبت سے بولے تو حد درجہ انڈر اسٹینڈنگ کے اس مظاہرے پہ عنیزہ کی آنکھیں بھر سی آئیں۔ وہ تو اپنی طرف سے انہیں کنوینس کرنے کی کوشش کررہی تھیں، جبکہ وہ ان کے دل کی بات جان گئے تھے۔ "بعد میں جو ہوا میں دیکھ لوں گا۔" "تم ابھی سے پریشان مت ہو۔ انہوں نے اسے تسلی دی تو عنیزہ کھل کے مسکرائیں۔ یہ جگہ اظہار ممنونیت کے لیے موزوں نہیں تھی، ورنہ وہ شاید فرط جذبات سے رو ہی تو پڑتیں۔

☼ ☼ ☼
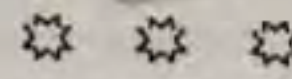
قیامت در قیامت تھی۔ ملک جہانگیر' احمد سیال کے پاس آئے ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ جہانگیر اپنے دوست احمد سیال کو کچھ اپ سیٹ سا دیکھ رہے تھے۔ چائے پینے کے بعد وہ فارغ ہوئے تو ملک جہانگیر نے اپنی آمد کی غرض وغائیت بیان کی۔

"میں نے تم سے اپنے بڑے بیٹے کے رشتے کی بات کی تھی۔ اتنے دن گزر گئے ہیں تم نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ میں نے سوچا تم سے مل بھی لوں اور اس تاخیر کا سبب بھی دریافت کروں۔" ملک جہانگیر ہلکے پھلکے انداز میں بولے۔ احمد سیال معذرت خواہانہ انداز میں مسکرائے۔

"میں کچھ دیر میں خود گاؤں تمہاری طرف آنے والا تھا۔" اتنا بول کر وہ خاموش ہوگئے۔ ملک جہانگیر ان کے مزید بولنے کے منتظر تھے۔

میری بیٹی رنم اعلا تعلیم کے حصول کے لیے کینیڈا چلی گئی ہے۔ وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی' اس لیے میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔" وہ بہت دیر بعد آہستہ آہستہ گویا ہوئے۔ جہانگیر کے سینے سے ایک ٹھنڈی سانس خارج ہوئی۔ تو احمد سیال کی پریشانی کی وجہ یہ تھی' اس لیے وہ شرمندہ نظر آرہا تھا۔

"اس میں معذرت والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ نہ تمہیں اس پہ کوئی شرمندگی ہونی چاہیے۔" جہانگیر نے احمد سیال کے کندھے پہ دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے گویا انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔ لیکن خود اندر سے وہ بددل ہوچکے تھے۔ وہ جلد از جلد ملک ایبک کی شادی کے چکر میں تھے اور احمد سیال سے دوستی کے رشتے داری میں بدلنے کے خواہاں تھے۔ یہ امید تو ختم ہی تھی۔ احمد سیال کی لاڈلی اکلوتی بیٹی اعلا تعلیم کے حصول کی خاطر کینیڈا جاچکی تھی اور بے چارا احمد سیال شرمندہ نادم ان کے سامنے بیٹھا تھا۔

"ہم دوست ہیں اور ہمیشہ رہیں گے کیا ہوا جو ہماری دوستی رشتہ داری میں نہ بدل سکی۔" ملک جہانگیر سے احمد سیال کی مسلسل خاموشی برداشت نہیں ہورہی تھی۔

"ہاں ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن یقین جانو میں بہت شرمندہ ہوں۔ اس لیے اتنے دن گزرنے کے باوجود میری ہمت نہیں ہوئی کہ تم سے بات کروں۔" لیکن میں تمہارا شکر گزار ہوں جو تم نے میری مجبوری کو سمجھا۔

"یار اب بس بھی کرو۔ میں شرمندہ ہورہا ہوں اب۔" جہانگیر نے قصداً "مزاحیہ انداز اختیار کیا اور واقعی کچھ دیر بعد احمد سیال بظاہر نارمل ہوکر ان سے

بات کررہے تھے۔

ملک جہانگیر جاچکے تھے' پر احمد سیال اور بھی پریشان تھے۔ رنم کی پراسرار گمشدگی نے ان کی ذہنی و نفسیاتی کیفیت کو بھی متاثر کیا تھا۔ وہ اپنے مالی معاملات و دفتری امور کسی پہ بھی توجہ نہیں دے پارہے تھے۔ ان کا ذہنی دباؤ بڑھتا جارہا تھا۔ انہیں لاڈلی بیٹی کی ناراضی کا سبب معلوم تھا۔

وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو ایک شخص کی محبت کی خاطر والدین کی محبتوں سے منہ موڑ کر گھر کی دہلیز پار کرجاتی ہیں۔ بلکہ رنم نے ایک احمقانہ ضد کی خاطر غصے میں آکر یہ انتہائی قدم اٹھایا تھا۔ اگر وہ کسی کو پسند کرتی محبت کرتی تو احمد سیال کو اس کی بات ماننے میں تامل نہ ہوتا' وہ تو ان کی ہستی کی بنیادیں تک ہلا گئی تھی۔ اب وہ پچھتا رہے تھے کہ پہلی بار ہی اس کی بات تسلیم کرلی ہوتی تو بہلا دیا ہوتا بیٹی کو۔

وہ رنم کے سب دوستوں خاص طور پہ فراز اور کومل کو روز ہی فون کرتے کہ شاید اس نے ان سے رابطہ کیا ہو یا اس کی کوئی خیر خبر مل جائے۔ فراز نے اپنے طور پہ بہت کوشش کی تھی۔ اس کا سراغ لگانے کی۔ پولیس نے الگ اپنی کارکردگی دکھانے کی کوشش کی تھی۔ یہ سب کام رازداری سے ہوئے تھے' کیونکہ احمد سیال کی شرط ہی یہ ہی تھی کہ رنم کی گمشدگی کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔ غالباً" اسی رازداری والی شرط کے سبب رنم کی گمشدگی معمہ بنی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ملک ارسلان اور عنیزہ ہوٹل سے چیک آؤٹ کررہے تھے۔ رنم سخت خوف زدہ تھی۔ ان حالات میں جب ان دونوں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کی پیش کش کی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ امداد غیبی ہو۔ اس نے ان کی یہ پیش کش فوراً" قبول کرلی۔

عنیزہ اس کے پہنے گئے کپڑوں کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی حویلی کے حساب سے یہ قطعی نامناسب تھے۔ اس لیے ہوٹل چھوڑنے سے پہلے انہوں نے اس کے لیے کچھ ضروری خریداری کی۔ ہوٹل کے پاس ہی شاپنگ مال تھا انہوں نے رنم کو بھی ساتھ چلنے کی پیش کش کی' پر اس نے انکار کردیا۔

عنیزہ اس کے لیے کپڑے' جوتے اور استعمال کی کچھ اور چیزوں کی خریداری مکمل کرکے واپس آئیں تو ملک ارسلان گاؤں روانگی کے لیے تیار تھے۔ عنیزہ نے خریدے گئے کپڑوں میں سے ایک سوٹ رنم کی طرف بڑھایا۔

"نمناں تم یہ پہن کر جلدی سے تیار ہوجاؤ اور بال بھی باندھ لو۔" عنیزہ نے تنقیدی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

رنم خاموشی سے کپڑے لے کر چلی گئی۔ یہ امبرائیڈری والی قمیص ٹراؤزر اور ساتھ ہمرنگ دوپٹا تھا۔ اسٹیپس میں کٹے بالوں کو اس نے بمشکل تمام پنیں لگا کر سمیٹا اور پھر پونی باندھی۔ اب اس کی ظاہری شکل و صورت اور حلیہ کافی تبدیل ہوچکا تھا۔ عنیزہ نے دیکھا تو مطمئن ہوگئیں۔

رات کو انہوں نے رنم سے کافی باتیں کی تھیں۔ اپنے خاندان' گاؤں اور حویلی کے بارے میں معلومات دی تھیں۔ رنم کو انہوں نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ حویلی میں کیسے رہنا ہے اور کسی کے پوچھنے پہ کیا جواب دینا ہے۔ رنم نے ان کو اپنا فرضی نام نمناں بتایا تھا۔ اس لیے جب وہ دونوں اسے نمناں کہہ کر مخاطب کرتے تو وہ ایک ثانیے کے لیے چونک سی جاتی۔ شکر ہے انہوں نے اس پہ توجہ نہیں دی تھی۔

رنم نے دوپٹا اچھی طرح اپنے سر پہ جمایا' وہ دوپٹا سر پہ لینے کی عادی نہیں تھی۔ چونکہ جیسی ڈریسنگ وہ کرتی تھی اس میں دوپٹا لینے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس لیے دوپٹا سر پہ لینے میں اسے ازحد مشکل پیش آرہی تھی۔ عنیزہ نے دوپٹا اس کے سر پہ اوڑھا کر ایک سائیڈ پہ پن لگادی تھی۔ ان کی اس حکمت عملی سے رنم بار بار دوپٹا سنبھالنے کی زحمت سے بچ گئی تھی۔

وہ ملک ارسلان اور عنیزہ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ

گئی تھی۔ ایک نئی منزل کی طرف اس کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ گاڑی شہر سے نکل کر گاؤں والے راستے پہ رواں دواں تھی۔ رنم شیشے کی طرف چہرہ کیے باہر دیکھ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف سرسبز کھیت اور بلند و بالا درخت ایستادہ تھے۔ کہیں کہیں کچے مکانات بھی نظر آرہے تھے۔ تیز دھوپ' سبز چراگاہوں میں مویشی چرتے نظر آرہے تھے۔ عورتیں کھیتوں میں کام کررہی تھیں۔

یہ سب مناظر رنم کے لیے بالکل نئے اور انوکھے تھے۔ شیشے سے باہر کا نظارہ کرتے ہوئے وہ کچھ دیر کے لیے وقتی طور پہ اپنے سب دکھ بھول گئی تھی۔ یہاں کا ماحول اور فضا شہر سے بالکل ہی اچھوتا اور مختلف نظر آرہا تھا۔

☆ ☆ ☆
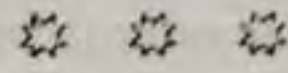
وہاب' روبینہ پہ گرج برس رہا تھا۔ "آپ دونوں مل کر کون کون سے منصوبے تیار کرتی رہی ہیں' سب پتا چل گیا ہے مجھے۔"

"کیا پتا چل گیا ہے تمہیں؟" روبینہ نے پریشانی سے اس کی شکل دیکھی۔

"سنا ہے زرینہ خالہ نے ذیان کا رشتہ طے کردیا ہے؟" ان کے چہرے پہ نظر جمائے وہ لفظ چبا چبا کے بول رہا تھا۔

"ہاں اگر اس نے طے کردیا ہے تو ذیان اس کی بیٹی ہے۔" انہوں نے لہجہ کو سرسری رکھنے کی پوری کوشش کی تھی۔

"امی میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں ذیان سے شادی کرنا چاہتا ہوں' آپ خالہ سے بات کریں۔"

"میں نے اسے ایک بار نہیں' بہت بار بات کی۔ امیر بھائی نہیں مانتے۔" انہوں نے بیٹے سے نظر چرائی۔

"سب جھوٹ ہے' بکواس ہے۔ زرینہ خالہ نے تمام عمر ذیان سے نفرت کی ہے۔ وہ کبھی نہیں چاہیں گی کہ میری شادی اس کے ساتھ ہو۔" روبینہ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ گویا وہ اتنا بھی انجان نہیں تھا جتنا وہ تصور کرتی تھیں۔

"میں نے بہت بار زرینہ سے بات کی ہے' پر وہ نہیں مانتی۔" وہاب کی محبت میں انہوں نے ایک اہم راز سے پردہ اٹھایا تھا۔ اس کا شک وہاب کو پہلے سے ہی تھا' پر اب یہ شک یقین میں بدل چکا تھا کہ خالہ اس کی اور ذیان کی شادی ہونے کے حق میں نہیں ہیں۔

"زرینہ خالہ خود کو بہت ہوشیار سمجھتی ہیں نا۔ ان کی ہوشیاری میں ان ہی کے اوپر آزماؤں گا اب۔" وہاب کے ہونٹوں پہ پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"کیا کرنا چاہتے ہو تم؟" روبینہ متوحش ہوئیں۔

"میں نے نہیں کرنا' آپ نے کرنا ہے۔" وہ اسی مسکراہٹ سمیت بولا۔

"کیا کرنا ہے مجھے بتاؤ تو سہی وہاب کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔"

"امی آپ نے میرے اور ذیان کے رشتے کی بات امیر خالو سے کرنی ہے اور بس۔" وہ دوٹوک لہجہ میں بولا۔

"اور جو کمال کا رشتہ آیا ہے ذیان کے لیے وہ۔"

"اس کی آپ فکر مت کریں۔ میں نے کمال کا حل بھی سوچ لیا ہے۔"

"میں نے زرینہ کو کتنا سمجھایا کہ ذیان کا رشتہ میرے وہاب کے لیے دے دو' پر اس کی ایک ہی ضد تھی۔ سچ پوچھو تو مجھے کبھی کبھی ذیان پہ بہت ترس آتا ہے۔ مجھے تم دونوں کی شادی پہ کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

بیٹے کی محبت میں وہ اس وقت زرینہ کی دی ہوئی سب ہدایات بھول گئی تھیں۔ یہ اولاد کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے کہ باقی سب رشتوں کو پس پشت ڈال دیتی ہے۔

"امی آپ مجھے پہلے بتا دیتیں نا تو اب تک میری شادی ذیان کے ساتھ ہو چکی ہوتی۔ میں زرینہ خالہ کو ان کے

منصوبے میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔" رفتہ رفتہ اس کے چہرے پہ غصہ جگہ لے رہا تھا۔

"تم فکر مت کرو' میں بہت جلد امیر بھائی سے تمہارے رشتے کی بات کرنے جاؤں گی۔ زرینہ کو برا لگتا ہے تو لگے' میں بیٹے کی خوشی کو قربان نہیں کر سکتی۔"

ان حالات میں وہ ایک روایتی ماں نظر آرہی تھیں۔ جو اولاد کی خوشی کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔

☼ ☼ ☼
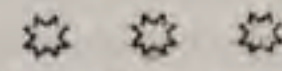
امیر علی کی طبیعت اچانک بگڑی تھی۔ ان کے ناک' منہ سے خون آنا شروع ہو گیا تھا۔ زرینہ کے دل کو خون دیکھ کر کچھ ہوا۔ اس نے پوری قوت سے چیخ ماری اور دروازہ کھول کر اندھا دھند ڈرائیور کے کوارٹر کی طرف بھاگی۔ زیان' بوا' آفاق' مناہل' رابیل تینوں امیر علی کے کمرے میں تھے۔ ان کی حالت لمحہ بہ لمحہ بگڑتی جارہی تھی۔

زیان بے اختیار ان کی طرف بڑھی۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ شروع میں وہ بے چین تھے۔ ہاتھ پیچ رہے تھے۔ گردن کو ہلا رہے تھے۔ پر اب ان کی حرکات سست تھیں۔ ڈرائیور انہیں ہسپتال لے جانے کے لیے تیار تھا۔ زیان ان سے بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی' پر ان کی حالت ایسی نہیں تھی۔

وہ ان کے ساتھ اسپتال جانا چاہ رہی تھی' اس لیے بھاگ کر پہلے گاڑی میں بیٹھی۔ زرینہ اور اس کا دکھ مشترک ہو گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے زیان کے ساتھ اسپتال جانے پہ کوئی اعتراض نہیں کیا۔

☼ ☼ ☼
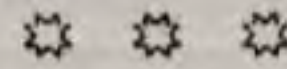
روبینہ نے امیر علی کے پاس جانے کی تمام تر تیاری مکمل کرلی تھی۔ وہاب انواع واقسام کے ڈرائی فروٹس اور پھلوں کے ٹوکرے لایا تھا۔ آخر کو وہ اکلوتے بیٹے کی ماں تھیں۔ وہاب نے کہا تھا کہ کسی بھی قسم کی کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ وہاب کی خوشی پہ وہ زرینہ کی ناراضی بھی قربان کرنے کے لیے تیار تھیں۔ انہیں اندازہ تھا کہ زرینہ ان کے اس اقدام سے بہت ناراض ہو گی۔ ان کی بلا سے ناراض ہوتی ہے تو ہو۔

زیان میں کوئی کمی تو نہیں ہے' خوب صورت ہے' تعلیم یافتہ ہے' آج کل کی لڑکیوں والی چھل بھل اس میں نہیں ہے' کم گو ہے اور سب سے بڑھ کر وہاب کی پسند ہے۔ زرینہ نے برسوں کی نفرت ابھی تک دل میں دبا کر رکھی ہے۔ وہ اسے سمجھانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ زرینہ مان جاتی ہے تو ٹھیک ہے' ورنہ انہیں زیان اور وہاب کی شادی سے مطلب ہے۔ وہ جاتے ہوئے تمام راستہ اسی بارے میں سوچتی رہیں۔

زرینہ کے گھر کے گیٹ سے وہ اندر داخل ہوئیں تو کسی غیر معمولی تبدیلی کا احساس ہوا۔ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ورنہ جب بھی وہ آتیں۔ ایک چہل پہل کا احساس ہوتا تھا مگر ابھی سب پریشان بیٹھے تھے' بوا رحمت تسبیح تھامے مسلسل کچھ پڑھ رہی تھیں منامل' رابیل اور آفاق تینوں اداس اور خاموش تھے۔

زرینہ اور زیان دونوں کہیں نظر نہیں آرہی تھیں۔ انہیں درست طور پہ صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔

"بوا کیا ہوا ہے گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے۔ زرینہ اور زیان کہاں ہیں؟" انہوں نے ایک ہی سانس میں پوچھ ڈالا۔

"امیر میاں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ناک منہ سے مسلسل خون آرہا تھا۔ پہلے گھر پہ ڈاکٹر کو بلوایا اس نے کہا دیر مت کرو ان کو فوراً" اسپتال لے جاؤ۔ زیان اور چھوٹی دلہن ادھر ہی گئی ہیں۔"

بوا نے تسبیح سائیڈ پر رکھتے ہوئے ان کے سوالوں کے جواب دیے تو ان کے خدشات میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ بوا کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ وہ کافی دیر روتی رہی تھیں۔ ان کے اس گھر اور مکینوں کے ساتھ پرانی وابستگی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ ہر دکھ سکھ میں برابر کی شریک ہوتیں۔

روبینہ نے وضو کر کے بوا سے قرآن مانگا۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ روبینہ دوپٹا سر پر جمائے قرآن

پڑھنے میں مصروف ہو گئیں۔ دل کسی انہونی کے خدشے سے لرز رہا تھا۔ آخر کو زرینہ ان کی ماں جائی تھی۔ اور امیر علی اس کے سر کے سائیں۔ "اللہ میری بہن کا سہاگ سلامت رکھنا" قرآن پڑھ کر انہوں نے دل سے دعا کی۔

بوا نے دوبارہ ہاسپٹل زبان کو کال کر کے امیر علی کی خیر خبر لی تھی۔ زبان کے لہجہ میں مایوسی تھی آواز بھی روئی روئی لگ رہی تھی۔

روبینہ قرآن پڑھنے کے بعد وہیں اس جگہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ بوا بھی ان کے پاس تھیں وہ امیر علی کی طبیعت اور موجودہ حالت کے بارے میں ہی بات کر رہی تھیں جب گیٹ پر باہر ایمبولینس سائرن بجاتی رکی تھی۔ روبینہ کو ایسے محسوس ہوا جیسے وقت رک گیا ہو۔ زرینہ کے اونچی آواز میں رونے بین کرنے کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔ باہر بہت سے اور لوگوں کی بھی آوازیں تھیں لیکن ان سب پہ زرینہ کی آواز حاوی تھی۔ روتی کرلاتی' بین کرتی صدمے سے چور چور آواز۔ جیسے اس کا سب کچھ لٹ گیا ہو۔ واقعی اس کا تو سب کچھ لٹ گیا تھا۔ وہ امیر علی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گنوا بیٹھی تھیں۔ بیوی سے بیوہ بن کر ہسپتال سے گھر لوٹی تھیں۔

روبینہ نے سینے پہ دوہتھڑ مارے اور باہر صحن کی طرف بھاگی۔ امیر علی کو ایمبولینس سے اتار کر گھر کے اندر لایا جا رہا تھا۔

زرینہ کے رونے پیٹنے بین کرنے نے سب کو اس کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ پر زبان کی ناگفتہ بہ حالت کی طرف کسی کی بھی توجہ نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے خالی الذہنی کے عالم میں سب کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ جیسے اسے کچھ سمجھ ہی نہ آ رہا ہو۔ اس کے سب آنسو دل پہ اندر ہی اندر گر رہے تھے اور ان آنسوؤں نے بہت دور تک آگ لگا دی تھی۔

امیر علی سفید کفن اوڑھے اس سے بہت دور جا چکے تھے۔ وہ ان سے اپنے دل کی بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ جو وہ اسے پہلے اپنی ناراضی میں ان سے کر نہیں پائی تھی۔ وہ انہیں زرینہ آنٹی کی زیادتیوں کے متعلق آگاہ کرنا چاہتی تھی وہ انہیں رابیل منال اور آفاق کی بیگانگی سے مطلع کرنا چاہتی تھی وہ انہیں یہ سب کھول کھول کے بتانا چاہ رہی تھی کہ زرینہ آنٹی ان کی چہیتی بیوی نے بچپن سے ہی اس کے ساتھ زیادتیاں روا رکھی ہیں وہ اسے ذہنی طور پر بے پناہ اذیت سے دوچار کرتی رہی ہیں۔ انہوں نے اس کے بچپن کو مسخ کر دیا ہے۔ وہ اس کی ماں کے حوالے سے گندی و گری ہوئی گھٹیا باتیں کرتی رہی ہیں۔ حالانکہ اس نے اپنی ماں کو نہیں دیکھا تھا نہ وہ ان کے لمس سے واقف تھی۔

زرینہ آنٹی نے اس کے اور ابو کے درمیان دوری پیدا کر دی ہے۔ حالانکہ اس کا دل چاہتا ہے وہ ان کے پاس بیٹھے ان سے لاڈ کرے ان سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرے۔ اس کے سینے میں دبی چھوٹی چھوٹی سی خواہشیں حسرت بن گئی ہے۔ وہ چاہ کر بھی ان کے قریب نہ آ سکی۔ اور وہ ان کے سینے سے لگ کر ان کے ہاتھوں کو پکڑ کر یہ شکایت کرنا چاہتی ہے کہ آپ بھی تو مجھ سے دور ہو گئے آپ بھی تو مجھ سے لاپروا ہو گئے آپ کو پتا ہی نہیں کہ یہاں اس گھر میں آپ کی بیٹی زبان بھی رہتی ہے۔ اسے بھی آپ کی محبت کی شفقت پدری کی ضرورت ہے۔ وہ آپ کی لاپروائی کی وجہ سے آپ سے دور ہوئی ہے۔ حالانکہ وہ آپ کے پاس آنے کے لیے ترستی ہے۔ اس کی سب ناراضی آپ سے ختم ہو گئی ہے۔ وہ اب دل سے آپ سے راضی ہے۔ آپ ایک بار آنکھیں کھول کر اسے دیکھیں تو سہی۔ آپ دیکھیں ناں آپ کی بیماری کی وجہ سے وہ کتنی خوفزدہ رہتی ہے وہ تحفظ چاہتی ہے کیونکہ وہاب کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ وہاں یہاں گھر آتا ہے تو اسے ڈر لگتا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ آپ اس کا ماتھا چومیں اور کہیں کہ میں تمہارے ساتھ ہوں کسی گندی نگاہ کو تمہاری طرف اٹھنے سے پہلے ہی پھوڑ ڈالوں گا۔

پر امیر علی تو اس کی کوئی خاموش فریاد نہیں سن رہے تھے۔ وہ ان کی زندگی میں بھی ان سے کچھ نہیں کہہ پائی اور کٹی کٹی رہی اور اب موت جیسی اٹل حقیقت نے

رشتوں کی ڈوری ہی کاٹ دی تھی۔

✿ ✿ ✿
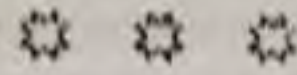
سفید حویلی جس میں نہناں یعنی رنم ملک ارسلان اور عنیزہ کے ہمراہ آئی تھی بہت شاندار تھی۔ اپنی پریشانی کے باوجود وہ حویلی کی خوب صورتی' سجاوٹ اور وقار دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ حویلی کے ساتھ خوب صورت باغ بھی تھا۔ جس میں نایاب اقسام کے پودے اور درخت اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

عنیزہ نے رنم کو نوکرانیوں والے حصے میں نہیں ٹھہرایا تھا بلکہ حویلی کے رہائشی حصے میں بنے کمروں میں سے ایک اس کے لیے مخصوص کردیا تھا۔ یہ فرق صاف ظاہر کررہا تھا کہ رنم کو اس نے خاص اہمیت اور حیثیت دی ہے۔ رنم کی رہائش کا انتظام ہوگیا تھا اس کے بعد عنیزہ نے حویلی کے تمام ملازمین سے متعارف کروایا اور سب سے آخر میں وہ اسے افشاں بیگم سے ملوانے لائیں۔

افشاں بیگم کو نہناں یعنی رنم کی بے چارگی و درد ماندگی کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ وہ اس کے لیے دل میں ہمدردی محسوس کررہی تھیں۔

عنیزہ اسے پوری حویلی دکھا کر سب کا تعارف کرواچکی تھیں۔ شروع میں رنم بہت خوفزدہ اور سہمی ہوئی تھی اب اس کا خوف آہستہ آہستہ تحلیل ہورہا تھا۔ حویلی میں ملک ارسلان اور عنیزہ بیگم ہی تھے اور باقی ڈھیر سارے ملازمین۔

ملک ارسلان صبح ناشتے کے بعد ڈیرے کی طرف نکل جاتے گھر میں عنیزہ ہوتیں ملازموں کے ہمراہ۔ رنم کے ذمے کوئی خاص کام نہیں تھا اور فارغ بیٹھ بیٹھ کر وہ حقیقی معنوں میں اکتا گئی تھی اس کی اسی اکتاہٹ کے سبب عنیزہ نے حویلی کے ملازمین کی سپرویژن کا کام اسے سونپ دیا۔ یعنی ایک لحاظ سے وہ سب کی انچارج تھی۔ رنم نے یہ کام یا اس نوعیت کے دیگر امور کبھی بھی سرانجام نہیں دیئے تھے اس لیے یہ مصروفیت اس کے لیے غنیمت تھی۔

عنیزہ فارغ اوقات میں حویلی کے دوسرے حصے میں مقیم ملک جہانگیر اور افشاں بیگم کی طرف چلی جاتیں رنم فارغ ہوتی تو وہ اسے بھی ساتھ لے لیتیں۔ لیکن اکثر اوقات وہ ان کے ساتھ جانے سے معذرت کرلیتی۔ عنیزہ اس سے بہت خوش تھیں۔ انہیں ایسے محسوس ہوتا تھا نہناں نے آکر ان کی ایک عرصے کی تنہائی کا مداوا کردیا ہے۔ وہ نہناں سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتیں شام کی چائے اکثر اس کے ساتھ پیتیں۔ یعنی وہ ان کے لیے خاص تھی۔

حویلی کے دیگر ملازمین بھی عنیزہ کی اس کے لیے خصوصی توجہ محسوس کررہے تھے اس لیے سب اس سے ادب سے پیش آتے۔ ملک ارسلان نہناں کو حویلی لانے کے فیصلے سے مطمئن تھے کیونکہ اس کی آمد کے بعد عنیزہ خوش رہنے لگی تھیں۔ ایک مخصوص اداسی اور یاسیت جو عرصہ دراز سے ملک ارسلان کی تمام تر توجہ اور محبت کے باوجود عنیزہ کی شخصیت کا حصہ بنی ہوئی تھی وہ اب کم ہونے لگی تھی۔ وہ زندگی کے معاملات میں پھر سے سرگرم ہوگئی تھیں۔ یہ تبدیلی خوش آئند تھی۔ نہناں بہت مختصر عرصے میں حویلی کا حصہ بن گئی تھی۔

✿ ✿ ✿

زیان پہلے سے زیادہ گم صم رہنے لگی تھی۔ اپنی تنہائی' بے چارگی اور کسمپرسی کا احساس کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ پہلے امیر علی کی زندگی میں کسی اپنے کے ہونے کا فرحت بخش اطمینان ہمراہ تھا۔ ان کے بعد یہ مان اور اطمینان بھی چھین چکا تھا۔

امیر علی کے انتقال کو ایک ماہ سے زائد ہوچکا تھا۔ روبینہ مستقل طور پر زرینہ کے پاس ہی تھیں وہاب صبح و شام چکر لگاتا۔ امیر علی زندہ تھے تو اس کی آمدورفت کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے وہ بھی وقفے وقفے سے آتا پر اب کوئی آڑ کوئی دیوار نہیں رہی تھی۔

زرینہ عدت میں تھیں۔ عفت خانم نے دبے دبے الفاظ میں کمال اور زیان کی شادی کی بات چھیڑی۔

زرینہ نے انہیں اطمینان دلایا کہ عدت ختم ہوتے ہی وہ یہ معاملہ بھی نمٹالیں گی۔ ادھر روبینہ نے امیر علی کی ناگہانی موت اور اس کے بعد بہن کی بیوگی وعدت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک بار بھی وہاب کے رشتے کی بات نہیں چھیڑی تھی۔ پر عفت خانم کی آمد اور شادی کے تقاضے نے ان کے کان کھڑے کردیے۔ پھر وہاب کے صبح وشام کے چکر اس بات کو کہاں تک چھپا سکتے تھے۔ وہ غصے سے آگ بگولہ ہورہا تھا۔ امیر علی کی موت نے اسے نڈر کردیا تھا۔ پھر زرینہ خالہ کا دم خم ختم ہوچکا تھا وہ اب شوہر سے محروم عام سی عورت تھیں۔ وہاب نے عفت خانم کو ذلیل کرکے وہاں سے چلتا کیا۔ اچھا خاصا تماشا بن رہا تھا۔ اب وہاب جیسے منہ زور کو قابو کرنا مشکل تھا۔

زرینہ کو اب اور خوف ستانے لگے تھے۔ وہ اکیلی اور بے سہارا تھیں۔ میکے میں رشتے داروں کے نام پہ روبینہ اور وہاب کے سوا ان کا کوئی بھی نہیں تھا ادھر امیر علی بھی اکیلے تھے ان کے چند دور پار کے ہی رشتے دار تھے۔ وہ مشکل میں آجاتیں تو کوئی بھی ایسا نہیں تھا وہ جس پہ بھروسا کرتیں۔ خود تو وہ عدت میں تھیں۔

وہاب اور روبینہ آپا ہی گھر کے کرتا دھرتا بنے ہوئے تھے۔ ہر چیز پہ ان کا کنٹرول تھا۔ ان دونوں کی بدلی بدلی کیفیت زرینہ محسوس کررہی تھیں۔ سب سے پہلے تو وہاب نے عفت خانم کو بدتمیزی کرکے گھر سے نکالا پھر روبینہ آپا نے انہیں طویل لیکچر دیا کہ عفت خانم کو اب یہاں کسی صورت بھی قدم نہ رکھنے دیا جائے۔ ویسے بھی وہاب نے جس طرح عفت خانم کو ذلیل اور رسوا کرکے گھر سے نکالا تھا۔ اس کے بعد ان کا یہاں آنا محال ہی تھی۔ ذیان' زرینہ کے گلے کی ہڈی بن گئی تھی نہ نگل سکتی تھیں نہ اگل سکتی تھیں۔

ذیان' بوا کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ عفت خانم اور وہاب کا ہنگامہ شروع ہوتے ہی ذیان وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ اس کے خوف اور بے چارگی کو محسوس کرکے بوا بھی اس کے پیچھے آگئیں۔

"بوا یہ سب کیا ہورہا ہے کیوں ہورہا ہے۔ ہم اپنے ہی گھر میں اجنبی بن گئے ہیں۔ میرے دن رات خوف میں بسر ہورہے ہیں۔ میں کالج سے آتے ہی اپنے کمرے میں گھس جاتی ہوں۔ ایسے لگتا ہے اس گھر کے درودیوار میرے لیے پرائے ہوگئے ہیں۔" وہ بے حد شاکی اور ہراساں تھی۔

بوا اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ وہ خود امیر علی کے بعد ذیان کو دیکھ دیکھ کر جی میں کڑھتی۔ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھیں۔ آنے والے حالات کا اندازہ انہیں کچھ کچھ ابھی سے ہورہا تھا۔

"اللہ پہ بھروسا رکھو فکر مت کرو سب اچھا ہوجائے گا۔" انہوں نے بھیگے انداز میں اسے تسلی دی۔ یہ الگ بات کہ یہ تسلی یقین سے خالی تھی۔

✡ ✡ ✡

رنم کام کرتی نوکرانیوں کو ہدایات دے رہی تھی۔ عنیزہ دور بیٹھی ادھر ہی دیکھ رہی تھیں۔ اس کی نظر رنم پہ ہی تھی۔ رات سے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ جانے کیا بات تھی رہ رہ کر دل ودماغ میں عجیب سے خیال آرہے تھے۔ اب رنم کو دیکھتے ہوئے یہ خیال اور بھی طاقتور ہوتے جارہے تھے۔ وہ پیچھے بہت پیچھے ماضی میں جارہی تھیں۔ ماضی میں جانے کا یہ سفر اتنا آسان نہیں تھا انہیں کرب واذیت کی کئی منزلوں سے گزرنا پڑتا تھا۔

وہ سب کے سامنے سے اٹھ آئیں۔ اس وقت صرف تنہائی اور اندھیرا درکار تھا۔ اندھیرا ہی تو ان کی ٹوٹی پھوٹی روح کو اپنی پناہ میں تحفظ دے سکتا تھا۔ اتنے برس گزر چکے تھے وہ بے خبر تھیں انہیں کچھ خبر نہ تھی جو وہ پیچھے چھوڑ آئی ہیں "وہ متاع جان" کس حال میں ہے۔ کوئی مددگار کوئی سہارا نہ تھا۔

ملک ارسلان ان کی کیفیت دیکھتے ہوئے انہیں صرف تسلی دے سکتے تھے۔ اور اتنے برس سے وہ یہی کررہے تھے۔ لیکن تسلی دلاسوں سے عنیزہ کے زخم کہاں بھرنے والے تھے۔

✡ ✡ ✡

رات لمحہ بہ لمحہ تاریکی کا سفر طے کرتی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ بوا بہت دیر سے اپنے بستر پہ لیٹی کروٹ بدل رہی تھیں۔ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد وہ معمول کے ذکرو اذکار میں کافی دیر مشغول رہیں۔ اصولاً" اب انہیں نیند آجانی چاہیے تھی۔ نیند نہ آنے کی وجہ سے ان کی ذہنی چبھن تھی۔ اس چبھن کو عفت خانم کے ساتھ وہاب کی منہ ماری نے اور بھی بڑھادیا تھا۔

وہ برسوں سے اس گھر کے مکینوں کی خدمت کرتی چلی آرہی تھیں امیر علی انہیں گھر کا فرد کا درجہ دیتے تھے ان کی ادب واحترام میں امیر علی نے کبھی کوتاہی یا کمی نہیں کی تھی اول دن سے زرینہ بیگم بھی بوا کی اہمیت کو سمجھ گئی تھیں اس لیے ان کے تعلقات بوا کے ساتھ خوشگوار ہی رہے۔ اس میں بوا کی مصلحت آمیز فطرت اور سمجھداری کا بھی دخل تھا۔ وہ سب کی مزاج آشنا تھیں اور اس کے مطابق ہی برتاؤ کرتیں۔ زرینہ کا ذیان کے ساتھ جو رویہ تھا وہ انہیں پسند نہیں تھا ڈھکے چھپے لفظوں میں انہوں نے زرینہ کو اس کا احساس دلانا چاہا پر وہاں سے مطلوبہ ردعمل ظاہر نہ ہونے پر انہوں نے اپنے ہونٹ سی لیے۔

امیر علی کی بیماری سے پہلے سب ٹھیک چل رہا تھا۔ وہ گھر کے سربراہ اور تمام اختیارات کے مالک تھے۔ اختیارات میں طاقت میں تبدیلی آئی تو بہت کچھ بدل گیا۔ زرینہ شوہر پرست عورت تھیں اس کے ساتھ ساتھ وہ ذیان سے سخت عناد بھی رکھتی تھیں۔

وہاب کی ذیان کے ساتھ پسندیدگی اور ذیان کے حصول کی خواہش انہیں ذرہ بھر نہیں بھائی تب ہی تو انہوں نے کمال کے رشتے کے لیے راہ ہموار کی۔ جو وہاب کے غیض وغضب کو اور بھی ہوا دینے کا باعث بنی۔ بوا نے بہت قریب سے وہاب کی فطرت اور عادات کا مشاہدہ کیا تھا۔ وہ کینہ پرور ضدی اور اپنی مقصد کے حصول کے لیے حد سے گزر جانے والوں میں سے تھا۔

وہاب جنونی تھا اور ذیان کو حاصل کرنے کے لیے

کچھ بھی کر سکتا تھا اب امیر علی نہیں رہے تھے وہ کرتا دھرتا بنا ہوا تھا۔ بلکہ روبینہ نے وہاب کو اور بھی آگے کی راہ دکھائی دی تھی۔ زیان سے وہاب نے ہر حال میں شادی کرنی ہی تھی لیکن زیان کے ساتھ ساتھ اب وہ اس کی جائیداد کا بھی حقدار بننا چاہ رہا تھا۔ روبینہ اور وہ دونوں مل کر اس مقصد پہ کام کر رہے تھے۔

بوا اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتی تھیں۔ زرینہ بھی کچھ کچھ بھانپ گئی تھیں کیونکہ "روبینہ آپا اور وہاب نے امیر علی کی وراثت کے بارے میں انہیں ہر طرح سے کریدا تھا کہ امیر علی کی کتنی دولت ہے کتنی جائیداد ہے اور ان کے بینک اکاؤنٹس میں اس وقت کتنا پیسہ موجود ہے۔ زیان کو شادی کے موقعے پر کیا کچھ دیا جائے گا۔

روبینہ پہلے وہاب کی پسند کی وجہ سے زیان کو بہو بنانا چاہ رہی تھی لیکن اب اس میں لالچ کا عنصر بھی شامل ہو گیا تھا۔ روبینہ نے بوا سے بھی بہانے بہانے سے امیر علی کی وراثت کے بارے میں سوال کیے تھے۔ اور اس میں وہاب کی پوری پلاننگ تھی۔ آنے والا وقت انہونیوں کی نوید دے رہا تھا اس لیے بوا بے حد پریشان تھیں۔

رات گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ گزرتی جا رہی تھی۔ بوا اپنے بستر سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ دروازے کے قریب اپنی تسلی کرنے کے لیے گئیں حالانکہ دروازہ اندر سے لاک تھا پھر بھی انہوں نے اپنی تسلی ضروری سمجھی تھی۔

کمرے میں زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا۔ انہوں نے دوسری لائٹ جلائی۔ اب کمرے میں بھرپور روشنی تھی سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ بوا کونے میں رکھے اپنے جستی ٹرنک کی طرف بڑھیں۔ جستی ٹرنک کے ساتھ ہی ایک طرف کپڑوں کی الماری تھی انہوں نے الماری کھول کر چابیوں کا گچھا برآمد کیا۔ جستی ٹرنک پہ موٹا تالا جھول رہا تھا۔ چابیوں کے گچھے میں سے ایک چابی منتخب کر کے انہوں نے تالے پہ آزمائی تو وہ فوراً" کھل گیا۔ انہوں نے آگے جا کر ٹرنک میں رکھی اشیاء باہر نکالنی شروع کر دیں۔

ٹرنک میں رکھی سب چیزیں اب باہر بچھے بستر پر پڑی تھیں۔ ٹرنک کے سب سے نچلے حصے میں ایک پوٹلی پڑی تھی۔ بوا نے کپکپاتے ہاتھوں سے وہ پوٹلی باہر نکالی اور اس کی گرہیں کھولنی شروع کیں۔ ان کا انداز چوکنا اور رازدارانہ تھا۔ رات کے سناٹے میں اس طرح ٹرنک کھول کر کچھ ڈھونڈنا ظاہر کر رہا تھا کہ پوٹلی کے ساتھ یقیناً" کوئی اہم راز وابستہ ہے۔ ورنہ وہ دن کے کسی بھی حصے میں آ کر ٹرنک کھول کر کچھ بھی نکال اور رکھ سکتی تھیں۔

بوا پوٹلی کھول چکی تھیں۔ اس میں رکھی چیزیں بوا کے ہاتھوں میں تھیں۔ اس میں دو سونے کی انگوٹھیاں اور کانوں کی بھاری بالیاں پڑی تھیں۔ بوا نے ان پہ مطلق توجہ نہ دی بلکہ انہوں نے وہ چیزیں ایک طرف رکھ کر پوٹلی میں پڑے ایک شاپر کو باہر نکالا۔ شاپر مضبوط اور گہرے رنگ کا تھا۔ بوا نے شاپر کھول کر اندر موجود لفافے کو باہر نکالا۔ لفافہ مٹیالے رنگ کا تھا۔ اس کے اندر پڑا کاغذ گردش زمانہ سے پیلا اور بوسیدہ ہو رہا تھا۔ بوا نے کانپتے ہاتھوں سے کاغذ کی تہیں کھولنا شروع کیں۔ یہ ایک خط تھا جو برسوں پہلے انہیں تحریر کیا گیا تھا۔ برسوں پہلے جب یہ خط بوا کو بھیجا گیا تھا تب وہ اس کا جواب چاہنے کے باوجود بھی نہ دے پائی تھیں۔ اس ناکامی نے انہیں عجیب سے احساس جرم کا شکار بنا دیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ زیان کا بہت خیال رکھتی تھیں، اسے ایک لمحہ کے لیے بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتیں۔

زیان ان کے ہاتھوں میں پلی بڑھی تھی انہوں نے ایک ماں کی طرح اس کی ذمہ داریاں نبھائی تھیں۔ راتوں کو اس کے لیے جاگی تھیں اس کے کھانے پینے سے لے کر صفائی ستھرائی و تربیت ہر چیز کا خیال رکھا تھا۔ زرینہ سے امیر علی کی شادی کا ایک سبب زیان بھی تھی۔ پر بوا نے زرینہ بیگم کو زیان کی طرف سے بالکل

بے فکر اور پر سکون کر دیا تھا۔ وہ امیر علی کے باقی تینوں بچوں کی ماں اور محض بیوی تھیں۔ بوا نے بس زیان کو پیدا کرنے کا کرب برداشت نہیں کیا تھا باقی ہر لحاظ سے وہ اس کے لیے ماں جیسی تھیں۔

بوا خط کھول چکی تھیں۔ خط کے مندرجات پہ ان کی نگاہ تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ کب اور کیسے ان کی آنکھیں بھیگنا شروع ہوئیں۔

اس خط کے جواب دینے کا ٹائم آگیا تھا۔ بوا نے خط پہلے کی طرح پوٹلی میں رکھا اور ٹرنک کی سب چیزیں پھر سے اس میں رکھیں۔ اب سب کچھ پہلے کی طرح تھا۔ رات کا آخری پہر شروع تھا۔ بوا کی تہجد کی نماز کا ٹائم ہو گیا تھا۔ وہ وضو کر کے اپنے اللہ کے حضور جھک گئیں۔

☆ ☆ ☆
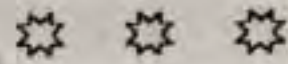
وہاب اپنے گھر کا چکر لگا کر دوپہر میں ادھر زرینہ بیگم کی طرف آگیا تھا۔ زیان کھانا کھا رہی تھی۔ اس کی آواز سنتے ہی کھانا چھوڑ کر کمرے میں چلی گئی۔ ابو کی موت کے بعد سے وہاب اور روبینہ ادھر ہی تھے۔ زیان کو وہاب کی معنی خیز نگاہوں سے عجیب سے گھبراہٹ اور الجھن ہوتی اس لیے اس کی پوری کوشش ہوتی کہ وہ منظر سے غائب رہے۔ اب تو زرینہ کو بھی وہاب کے وجود سے بے زاری ہونے لگی تھی۔ پر وہ عدت میں تھیں اس لیے خون کے گھونٹ پینے پہ مجبور تھیں۔

بوا نے دروازہ بجا کر اسے رات کے کھانے کے لیے باہر بلایا پر اس نے باہر آنے سے انکار کر دیا۔ تب وہ اس کے لیے کھانے کی ٹرے لائیں۔ زیان نے کمرے میں ہی کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے بلاوجہ ہی کمرے کے چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ اس مشغلے سے دل اکتایا تو اس نے ایک کتاب اٹھالی۔ کتاب کا موضوع اتنا دلچسپ تھا کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ باہر اب مکمل طور پر سناٹا اور خاموشی طاری تھی۔

اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ کافی وقت گزر چکا تھا۔ سناٹا بتا رہا تھا کہ سب خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ وہ کتاب رکھ کر سونے کے لیے جونہی بستر پر لیٹی اور بیڈ لیمپ آف کرنے کے لیے بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا اچانک لائٹ چلی گئی۔ کمرا تاریکی میں ڈوب گیا۔ اسے یکدم ہی اندھیرے سے ڈر لگنے لگا۔ کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اے سی اور پنکھا بند ہوا تو تھوڑی دیر میں ہی بند کمرے کی وجہ سے گھٹن بڑھنے لگی۔ اس کی قمیص بھیگ کر جسم سے چپک گئی تھی۔

زیان سے مزید گرمی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر آہستگی سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور ادھر ادھر دیکھا۔ باہر ہنوز خاموشی اور سناٹا طاری تھا۔ اس نے کمرے سے باہر قدم رکھا۔

اندھیرا ہونے کے باوجود وہ بہت تیزی تیزی سے سیڑھیاں طے کر کے اوپر چھت پر آئی تھی۔ چھت پر آتے ہی اسے احساس ہوا کہ یہاں اس کے علاوہ کوئی اور ذی نفس پہلے سے موجود ہے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا۔ اور اس کی چھٹی حس کبھی غلط نہیں کہتی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☆ ☆

نبیلہ ابر راجہ

میں گمان نہیں یقین ہوں

پانچویں قسط

وہ جہاں کی تہاں اپنی جگہ کھڑی رہی۔ چھت پہ چاند کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس ہلکی روشنی میں اس نے ایک سائے کو اپنی طرف بڑھتے محسوس کیا۔ زیان قدم پیچھے کی طرف موڑتی بالکل دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ آنے والا وہاب کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ گویا اس کی چھٹی حس نے اسے بالکل درست سمت میں اشارہ دے کر خبردار کیا تھا۔

"زیان تم اس وقت یہاں۔۔۔ لگتا ہے میری طرح تمہیں بھی نیند نہیں آرہی ہے۔"

زیان جس طرف کھڑی تھی وہاب نے اس طرف دیوار پہ ایک بازو پھیلا دیا اب وہ اس کے سامنے دیوار بن کر خود بھی حائل تھا۔ وہ بہت دوستانہ انداز میں بات کر رہا تھا۔ زیان کی طرف سے جواب میں خاموشی طاری رہی۔

کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟" اس نے ایک قدم آگے کی بڑھایا تو زیان کو کوفت نے آن گھیرا۔

"میری کسی کے ساتھ کوئی ناراضی نہیں ہے" وہ رکھائی سے بولی۔

"پھر سارا دن تم اپنے کمرے سے کیوں نہیں نکلتی ہو میں جب بھی آتا ہوں تم غائب ہو جاتی ہو۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے" اس کی سرد مہری برقرار تھی۔ وہ چاہ رہی تھی وہاب آگے سے ہٹے تو وہ نیچے جائے۔ اگر اسے علم ہوتا کہ وہاب پہلے سے چھت پہ موجود ہے وہ اوپر کبھی نہ آتی۔

"مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی ہے میں جب بھی آتا ہوں تم جھٹ خود کو کمرے میں بند کر لیتی ہو جیسے میں کوئی آدم خور بلا ہوں۔"

"یہ میرا گھر ہے میں کمرے میں رہوں یا باہر بیٹھوں میری مرضی" وہ وہاب کو کوئی بھی رعایت دینے کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہاب کے ساتھ اس وقت ٹکراؤ اسے ازحد کوفت میں مبتلا کر رہا تھا۔

"زیان لائف ایسے تو نہیں گزرے گی تم میری ہونے والی بیوی ہو۔ خود کو بدلو۔"

"کیا کہا تم نے۔۔۔ تمہاری اتنی جرات کہ تم مجھ سے یہ بات کہو۔" وہ شاکڈ تھی۔ حالانکہ اس نے عفت خانم اور وہاب کے مابین ہونے والی باتیں خود سنی تھیں پر وہاب نے آج تک کھل کر اسے کچھ نہیں کہا تھا۔ صرف نظروں سے اسے جلاتا اور اس کی یہ معنی خیز پراسرار نگاہیں زیان کو سخت بری لگتیں۔ ابھی اس نے ایک دم اتنی بڑی بات کر دی تھی۔ رات کے اس سناٹے میں زیان کی آواز اچھی خاصی محسوس ہو رہی تھی۔ کیونکہ اس کی آواز میں غصہ اور تیزی تھی۔

"زیان مجھے غصہ مت دلاؤ ویسے ہی زرینہ خالا نے حد کر دی ہے۔" وہاب منہ اس کے قریب لا کر جیسے پھنکارا تھا۔

"آئی سے گیٹ آؤٹ ورنہ میں حشر کر دوں گی تمہارا۔"

زیان میں اس وقت اچانک جانے کہاں سے جرات آگئی تھی ورنہ ابو کی وفات کے بعد اسے وہاب سے عجیب سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

"میں نے بہت برداشت کیا ہے صبر کے ساتھ" وہاب نے جھپٹ کر اس کا بازو اپنی مضبوط گرفت میں جکڑا۔

"میرا بازو چھوڑو" وہ نیچی آواز میں غصے سے غرائی۔

"نہیں چھوڑتا۔ انسان ہوں محبت کرتا ہوں تم سے۔ پیار کا اظہار کرنے کے لیے ترس رہا ہوں اور تم مجھے لفٹ ہی نہیں کرواتیں۔"

وہاب نے اس کا دوسرا بازو بھی پکڑ لیا جیسے اسے پورا یقین ہو کہ وہ کہیں نہیں جائے گی۔ زیان گھبراہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ وہاب سے اس درجہ قربت اعصاب پہ اثر انداز ہو رہی تھی۔ پر یہ اثر خوشگوار معنوں میں ہرگز نہیں تھا، منفی تھا۔

"میں جوان ہوں سینے میں دل رکھتا ہوں۔ میری عمر کے نوجوان بہت کچھ کرتے ہیں۔ مجھے بھی تمہارے ساتھ محبت کی وہ سب منزلیں طے کرنی ہیں۔" وہاب کی دست درازی بڑھ رہی تھی۔ زیان پیچھے ہوئی۔

"مجھے چھوڑ دو اور شرافت سے نیچے چلے جاؤ۔ ورنہ میں شور مچا دوں گی"

مکمل ناول

"تم کیا سمجھتی ہو شور مچا کر مجھ سے بچ جاؤ گی۔" وہاب عجیب سے لہجے میں بولتا اپنا چہرا اس کے قریب لایا تو زیان نے سوچے سمجھے بغیر اس کے چہرے پہ تھوک دیا۔ صورت حال کو سمجھنے میں وہاب کو صرف چند لمحے ہی لگے اس کے بعد شیطان پوری طرح اس پہ حاوی ہو گیا۔ اس نے زیان کے منہ پہ اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا۔

"میں تو صلح و صفائی سے تمام معاملات طے کرنا چاہتا ہوں مگر اب تم نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ شادی سے پہلے ہی تمہیں دلہن بنا دوں۔" وہ خون رنگ لہجے میں اس کے کان میں بولا۔

زیان کے دونوں ہاتھوں کو اس نے اپنے ایک ہاتھ میں جکڑ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے زیان کے منہ کو دبا رکھا تھا تاکہ وہ شور مچا کر کسی کو متوجہ نہ کر سکے اس لیے وہ اپنی من مانی نہیں کر پا رہا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پہ اس کا ہاتھ زیان کے منہ سے ہٹا تو اس نے زوردار چیخ ماری اور وہاب کے ہاتھ پہ اپنے دانت گاڑ دیے۔ وقتی طور پہ وہاب کی توجہ اس کی طرف سے ہٹی تو اس نے اونچی آواز میں پہلے بوا اور پھر زرینہ آنٹی کو پکارا۔

اس کی خوش قسمتی تھی کہ پہلی چیخ پہ ہی بوا متوجہ ہو گئیں۔ وہ تہجد کی نماز سے فارغ ہو کر تسبیح پڑھ رہی تھیں جب زیان کی جگر پاش آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ "بوا مجھے بچاؤ۔ زرینہ آنٹی پلیز بچاؤ۔"

بوا نے دل پہ ہاتھ رکھا۔ لائیٹ آ چکی تھی انہوں نے جوتے پہنے بغیر آواز کی سمت رخ کیا۔ زرینہ کا دروازہ اوپر جانے سے پہلے انہوں نے زوردار آواز میں دھڑ دھڑایا۔ وہ اس اچانک افتاد پہ ہڑبڑا کے بے دار ہوئیں۔

سب سے پہلے بوا اور ان کے پیچھے پیچھے زرینہ بیگم سیڑھیاں چڑھتی اوپر آئیں۔ زیان نے جونہی چیخیں ماریں وہاب اسے چھوڑ کر بجلی کی تیزی سے غائب ہوا۔ بوا اور زرینہ کو زیان اکیلی چھت پہ روتی ہوئی ملی۔ وہ غصے اور خوف کی زیادتی سے کانپ رہی تھی بوا نے اسے فوراً" ساتھ لپٹا لیا "کیا ہوا میری بچی سب ٹھیک ہے ناں؟"

"بوا۔۔۔ بوا وہ وہاب۔۔۔!" غصے اور شرم کی وجہ سے زیان اپنی بات مکمل نہ کر سکی۔ اس کی ادھوری بات میں جو معنی پنہاں تھے اس کو سمجھنے کے لیے کسی خاص عقل یا دلیل کی ضرورت نہیں تھی۔

زرینہ بیگم کو وہاب کی طرف سے پہلے ہی کسی گڑبڑ کی توقع تھی۔ اس کے تیور جارحانہ تھے وہ بپھرے ہوئے دریا کی مانند تھا جس پہ صبر اور جبر کا مزید کوئی بند باندھنا تقریباً" ناممکن ہو گیا تھا۔ زیان جس کی ایک جھلک کی خاطر وہ چار سال سے خالا کے گھر کے چکر کاٹ رہا تھا آج اسے اکیلا پا کر وہ چھوڑنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا۔ اسے پتا تھا زیان کو اس سے سخت نفرت ہے۔ زیان کے نسوانی پندار کو روند کر وہ ہمیشہ کے لیے اسے سرنگوں کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ پھر اس سے شادی سے انکار کی جرات ہی نہ کر سکے۔ قسمت نے یہ موقعہ فراہم کیا تھا پر وہ اس موقعے سے زیان کے شور مچانے کی وجہ سے استفادہ نہ کر پایا۔ اور تیزی سے منظر سے غائب ہو گیا۔

"کیا ضرورت تھی اس وقت چھت پہ آنے کی۔ میں کہاں تک رکھوالی کروں تمہاری۔" زرینہ زیان پہ غصے ہو رہی تھیں۔

"امیر علی خود تو مر گئے اپنی مصیبت میرے سر ڈال گئے۔ اچھا خاصا رشتہ طے کیا تھا تمہارا لیکن تم نے مان کے نہیں دیا۔ اب بھگتو۔۔۔ بچاؤ اپنی عزت۔۔۔ بناؤ میرا تماشا۔ میرے پاس ایک عزت ہی تو ہے لگ رہا ہے اس کی بھی نیلامی ہونے والی ہے۔"

بوا اور زرینہ کی مدد سے زیان چھت سے نیچے آ گئی تھی اب وہ تینوں بوا کے کمرے میں تھے۔ حیرت انگیز طور پہ روبینہ باہر نہیں نکلی تھیں شاید ان تک زیان کے شور مچانے کی آواز پہنچی ہی نہیں تھی اس لیے وہ مزے سے سو رہی تھیں۔

زیان رو رہی تھی۔ زرینہ گرج برس کے خاموش ہو گئی تھیں۔ کچھ بھی سہی بات پریشانی والی تھی۔ وہاب

کی یہ گھٹیا حرکت نظرانداز کرنے والی نہیں تھی۔ اس نے ان کے گھر میں بیٹھ کر زیان کی عزت کی دھجیاں اڑانے کی ناکام کوشش کی تھی اس نے زرینہ کی تازہ تازہ بیوگی کا بھی خیال نہیں کیا تھا۔

"بوا مجھے بتاؤ کیا کروں میں؟" زرینہ سخت پریشان تھیں لے دے کے بوا ہی تھیں جن سے وہ حال دل کہہ سکتی تھیں۔

"چھوٹی دلہن میں کیا بتاؤں میرا تو اپنا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ گھر میں عجیب عجیب باتیں ہو رہی ہیں۔ چھوٹا منہ بڑی بات وہاب میاں نے کوئی اچھا کام نہیں کیا ہے۔ انہیں لگام ڈالنے کی ضرورت ہے۔" بوا نے ڈرتے ڈرتے مشورہ دیا۔

"بوا مجھ اکیلی عورت کو وہاب تو وہاب' روبینہ آپا بھی آنکھیں دکھانے لگی ہیں۔ ان کی نظر امیر علی کی جائیداد پہ ہے اور ظاہر ہے زیان بھی ان کی بیٹی ہے۔ دونوں ماں بیٹا لالچ میں آ گئے ہیں۔" زرینہ بیگم نے آج پہلی بار ان دونوں کے بارے میں ان کے تازہ عزائم کے بارے میں زبان کھولی تھی۔

"ہاں چھوٹی دلہن وہاب میاں نے مجھ سے بھی کرید کرید کر کچھ باتیں معلوم کرنے کی کوشش کی تھی میں نے آپ کے خاندان کا نمک کھایا ہے نمک حرامی نہیں کر سکتی۔"

"بوا' عفت خانم کو وہاب نے ذلیل کر کے نکال دیا ہے اور میں پہلے شاید زیان کی شادی وہاب سے کر دیتی بشرطیکہ اس کا جذبہ سچا ہوتا مگر اب میں خود نہیں چاہتی کہ وہاب اپنے ارادوں میں کامیاب ہو۔ میں امیر علی کو کیا منہ دکھاؤں گی مرنے کے بعد" زرینہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

بوا حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ ساری عمر زرینہ نے زیان سے نفرت کی تھی مگر شوہر کے گزرنے کے بعد ان کی شوہر پرستی ہنوز زندہ تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ امیر علی زندگی کے آخری ایام میں وہاب سے برگشتہ ہو گئے تھے انہوں نے زرینہ سے کہا تھا کہ وہ یہاں ان کے گھر میں وہاب کو مت آنے دیں۔ شاید وہ اپنی بیٹی کی خاموشی اور بے بسی سے بہت سی ان کہی باتیں ازخود جان گئے تھے۔ اس لیے زرینہ نہیں چاہتی تھیں کہ امیر علی کی روح کو کوئی تکلیف ہو۔

زیان نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ آج زندگی میں پہلی بار زرینہ آنٹی نے اس کی سائیڈ لی تھی اس کے حق میں بات کی تھی۔ روتے روتے اس کے ہونٹوں پہ تلخ مسکراہٹ آ گئی۔ بہت دیر بعد جب زرینہ کچھ سنبھلیں تو وہاں سے آنے سے پہلے انہوں نے بوا کو زیان کے بارے میں بہت سی ہدایات دیں۔

"بوا فی الحال آپ زیان کو اپنے ساتھ ہی سلائیں۔ میں وہاب کو صبح دیکھوں گی اس وقت رات ہے سب سو رہے ہیں میں خوامخواہ ہنگامہ نہیں چاہتی۔" بوا نے سر ہلایا۔ زیان بیٹھی رو رہی تھی۔ بوا نے اس کے سر کو تسلی دینے والے انداز میں تھپکا "چلو بیٹا اب سو جاؤ تھوڑا۔"

"بوا میں آپ کے پاس سوؤں گی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ ڈری ہوئی تھی۔

"ہاں زیان بیٹا میں تمہارے ساتھ ہی سوؤں گی۔ لیکن کب تک میں تمہیں بچا پاؤں گی۔ وہاب میاں کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ اب ان کی نظر تمہارے ساتھ ساتھ امیر میاں کی دولت پہ بھی ہے۔ لیکن تم انہیں پسند نہیں کرتیں۔ ناکامی کی صورت میں وہاب میاں کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ یا تو ان سے شادی کر لو یا پھر یہاں سے چلی جاؤ۔" زیان رحمت بوا کی گرد بازو لپٹائے رو رہی تھی ان کے مشورے پہ ایک دم اس کے آنسو بہنا رک گئے۔

"میں وہاب مردود سے کسی صورت بھی شادی نہیں کر سکتی۔" اس نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر تم یہاں کیسے رہو گی۔ چھوٹی دلہن خود مشکل میں ہیں انہیں نے مجھے خود اپنے منہ سے کوئی بات نہیں بتائی ہے لیکن میں سب جان گئی ہوں۔ وہاب میاں مرد ذات ہیں موقعہ پا کر پھر سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔" بوا متفکر تھیں۔

"میں کہاں جاؤں بوا میرا کون ہے اس دنیا میں" وہ اب سسک رہی تھی۔

"ایسا مت کہو میرا رب تمہارے ساتھ ہے۔ تم کوئی لاوارث یا بے سہارا نہیں ہو خود کو اتنا کمزور مت سمجھو۔" بوا کا دل اس کے دلگیر لہجے پہ کٹ سا گیا۔

"بوا اس اتنی بڑی دنیا میں کون ہے میرا۔ نہ ماں' نہ باپ' نہ کوئی بہن بھائی۔ زرینہ آنٹی میری شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں ہیں۔ رابیل' منال' آفاق سے میں نے کبھی قریب ہونے کی کوشش کی بھی تو انہیں مجھ سے زبردستی دور کیا گیا۔ انہوں نے آج تک مجھے بہن نہیں سمجھا۔" اس کے آنسو زور و شور سے بہہ رہے تھے۔ بوا ساتھ لگائے اسے تھپک رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

زیان کے شور مچانے پہ وہاب فوراً" نیچے اتر کر اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ اسے ڈر تھا ابھی پورا گھر بیدار ہو جائے گا' اسی لیے سب سے پہلے اس نے اپنے کمرے کا دروازہ لاک کیا' پھر عجلت میں شب خوابی کا لباس پہنا اور چادر تان کر لیٹ گیا۔ لیٹنے سے پہلے وہ اپنے زخمی ہاتھ پہ کس کے رومال باندھنا نہیں بھولا تھا 'جہاں زیان نے اپنے دانت پوری قوت سے گاڑھے تھے۔ اس کا ہاتھ اچھا خاصا زخمی تھا' ابھی تک ہلکا ہلکا خون نکل رہا تھا اور تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔

اسے نیچے آئے آدھا گھنٹہ ہو چلا تھا' ابھی تک کسی نے ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ شاید خطرہ ٹل گیا تھا۔ ویسے اس نے سب کچھ پہلے سے سوچ لیا تھا' اگر کسی نے زیان کے چیخنے کا سبب معلوم کیا اور اسے ذمہ دار ٹھہرانے کی کوشش کی تو وہ صاف مکر جائے گا۔ اس کے پاس اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے بہت سے دلائل تھے۔ سناٹے میں اسے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی تو وہ چوکنا ہو گیا کہ ابھی کوئی دروازے پہ دستک دے گا' پر وہ جو کوئی بھی تھا آگے نکل گیا تھا۔ یعنی اب وہ آرام کے ساتھ آئندہ کا لائحہ عمل تیار کر سکتا تھا۔ اب اسے چھت پہ ہونے والی بدمزگی اور چھوٹی سے چھوٹی بات کے ساتھ اپنی ذلت بھی یاد آرہی تھی۔ زیان نے اس کے منہ پہ پوری نفرت کے ساتھ تھوکا تھا۔ پھر سے یاد آنے پہ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

"زیان میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تم کسی کو منہ دکھانے کے بھی قابل نہیں رہو گی۔ تم نے جرات دکھا کر اچھا نہیں کیا ہے۔" خود کلامی کرتے ہوئے اس کی مٹھیاں سختی سے بھنچی ہوئی تھیں۔ مٹھی بند کرنے سے ہاتھ میں تکلیف ہونا شروع ہو گئی تھی۔ وہاب نے زیر لب زیان کو موٹی موٹی گالیاں دیں۔

☼ ☼ ☼
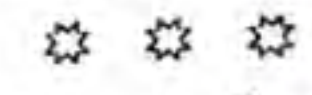
زرینہ خالہ اس کے ہاتھ پہ بندھی پٹی کو معاندانہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ روبینہ بھی وہاں موجود تھیں۔ زرینہ نے رات والا واقعہ من و عن دہرایا تو وہاب غصے سے بھڑک اٹھا۔ حسب توقع اس نے تردید کی۔

"زرینہ تم تو میری ماں جائی ہو۔ وہاب پہ ایسا شرمناک الزام لگاتے ہوئے تمہارا دل نہیں کانپا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی تم اتنا بدل سکتی ہو۔ آخر ہمارا قصور کیا ہے۔ اپنی سوتیلی بیٹی کی خاطر تم نے وہاب کا بھی لحاظ نہیں کیا حالانکہ یہی زیان تمہاری نظروں میں کانٹے کی طرح چبھتی ہے اب تم اس کی حمائتی بن کے آگئی ہو۔ وہاب ایسا نہیں ہے۔" روبینہ نے بہن کو بری طرح لتاڑا تو وہاب بھی شیر ہو گیا۔

"ہاں خالہ آپ خود سوچیں مجھے ایسا کام کرنے کی 'بے صبری دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں بھلا زیان کے ساتھ ایسا کر سکتا ہوں۔ محبت کرتا ہوں میں اس سے اور اب تو ہماری شادی بھی ہونے والی ہے۔ میں اپنی ہونے والی بیوی کی عزت کیسے خراب کر سکتا ہوں۔" اس کی اداکاری اور ڈھٹائی قابل دید تھی۔ ایک ثانیے کے لیے تو زرینہ بھی چکرا گئیں۔ مگر جب نظر اس کے ہاتھ پہ باندھی گئی پٹی پہ پڑی تو زیان کی باتیں پھر سے یاد آنے لگیں۔ وہاب نے صبح اٹھتے

ساتھ ہی سب سے پہلے ڈاکٹر کے کلینک کا رخ کیا تھا۔

"یہ تمہارے ہاتھ کو کیا ہوا ہے۔ رات تک تو بالکل ٹھیک تھا۔" انہوں نے نظریں جما کر غور سے اسے دیکھا تو وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"صبح جب میں جاگنگ کے لیے نکلا تو بھاگتے بھاگتے لڑکھڑا گیا راستے میں پتھر پڑا تھا نیچے گرا تو ہاتھ پہ چوٹ لگی آتے ہوئے ڈاکٹر سے بینڈیج کروائی ہے۔" وہ ایسے فرفر بول رہا تھا جیسے ہر سوال کا جواب پہلے سے سوچ رکھا ہو۔

"تم زیان سے پوچھو۔ وہاب کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو ایسے ہی خوامخواہ الزام لگا رہی ہے میرے بچے پہ۔ میں خود پوچھوں گی اس سے۔" روبینہ کو یہ پوچھ کچھ پسند نہیں آرہی تھی ادھر انہوں نے زیان سے پوچھنے کا قصد کیا ادھر وہاب کے چہرے پہ بے چینی پھیل گئی۔

"اماں چھوڑیں ناں بس اب۔ زیان نہ جانے کیوں چڑتی ہے مجھ سے۔ خیر شادی کے بعد خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔" اس نے روبینہ سے زیادہ جیسے خود کو تسلی دی۔

"ہاں زرینہ میں تو کہتی ہوں کہ اب تم زیان کی شادی کر ہی ڈالو۔ میں شادی سادگی سے کرنے کے حق میں ہوں۔ میں تمہاری تنہائی کے خیال سے اتنے دن سے اپنا گھر چھوڑ کے بیٹھی ہوں۔ وہاب بھی تمہارے لیے فکر مند ہے۔ اس لیے آفس سے سیدھا ادھر چلا آتا ہے۔ لیکن ہم ماں بیٹا کب تک گھر سے دور رہ سکتے ہیں۔ تم میری مانو تو زیان کو وہاب سے بیاہنے کے بعد خود بھی میرے گھر آجاؤ۔ اتنا بڑا گھر ہے میرا یہاں تم اکیلی کیسے رہو گی" روبینہ کے لہجے میں بہن کے لیے مصنوعی فکر مندی تھی۔ زرینہ امیر علی کی موت کے بعد ان کے بدلتے رویے اور دل میں آنے والی لالچ سے باخبر نہ ہو چکی ہوتیں تو ان کی اس آفر پہ خوشی سے پھولے نہ سماتیں۔ اب یعنی روبینہ آپا اور وہاب یہ گھر ہتھیانے کے چکر میں تھے۔ یہ راہ ماں کو وہاب نے ہی دکھائی تھی۔

"میں عدت میں ہوں بعد میں اس پہ سوچوں گی"

زرینہ نے بات ٹالی۔ وہاب نے روبینہ کو آنکھ سے اشارہ کیا۔

"ہاں زرینہ پھر کب میں وہاب کی بارات لاؤں؟" وہ پھر سے اصل موضوع پہ آگئیں۔

آپا میں ابھی دکھ اور صدمے میں ہوں۔ عدت بھی پوری نہیں ہوئی ہے اور آپ کو شادی سوجھ رہی ہے۔" وہ رکھائی سے بولیں تو روبینہ قدرے شرمندہ ہو گئیں۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ عدت سکون سے گزار لو پھر شادی بھی ہوتی رہے گی۔ کون سا وہاب یا زیان بھاگے جا رہے ہیں۔" روبینہ نے جیسے سکون کی سانس لی۔

"خالہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ امی کو یہاں آپ کے پاس چھوڑ کر خود گھر چلا جاؤں۔ اتنے دن سے ہمارا گھر بند پڑا ہے اور پھر میں نہیں چاہتا کہ رات پیدا ہونے والی غلط فہمی کی وجہ سے کسی کو باتیں کرنے کا موقعہ ملے۔ میں بیچ بیچ میں چکر لگاتا رہوں گا۔" وہاب نے بہت چالاکی سے خود کو عارضی طور پہ منظر سے ہٹانے کا پروگرام بنایا تھا۔ زرینہ دل میں بہت خوش ہوئیں۔ وہاب کی موجودگی سے انہیں ہمہ وقت خوف اور عدم تحفظ کا احساس ہوتا۔ اچھا تھا وہ کچھ عرصے کے لیے یہاں سے دفعان ہو جاتا۔ اس عرصے میں وہ اطمینان سے سوچ بچار کر سکتی تھیں۔

☼ ☼ ☼
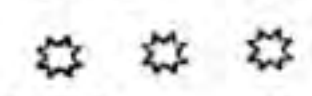
روبینہ کھانے کے بعد لیٹ گئی تھیں۔ وہیں لیٹے لیٹے آنکھ لگ گئی تو زرینہ جو ان کے پاس بیٹھی تھیں انہوں نے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا اس طرح سوتا رہنے دیا۔ خود وہ آہستگی سے باہر آگئیں کیونکہ بوا نے ان سے اکیلے میں کوئی ضروری بات کرنی تھی۔ زرینہ انہیں ڈھونڈتی باہر نکلی ہی تھیں کہ وہ اسے اپنی طرف بڑھتی دکھائی دیں۔

"چھوٹی دلہن آپ میرے کمرے میں آجائیں" بوا کا انداز چوکنا اور رازدارانہ تھا۔ زرینہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ان کے ساتھ آگئیں۔ بوا نے کمرے کا

دروازہ بند کر کے جستی ٹرنک کھولا اور اس میں رکھا بوسیدہ برسوں پرانا خط نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔ زرینہ نے سوالی نگاہوں سے پہلے خط اور پھر بوا کی طرف دیکھا بوا نے جواباً "انہیں خط پڑھنے کا اشارہ کیا۔ زرینہ خط پڑھ چکی تھیں۔ خط بھیجنے والے نے آخر میں اپنا نام نہیں لکھا تھا، پر پھر بھی زرینہ بیگم جان گئی تھیں کہ یہ خط بھیجنے والی ہستی کون ہے۔

"بوا آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہیں" زرینہ بیگم کی نگاہیں ہاتھ میں تھامے ہوئے خط پہ تھیں۔ ان کے چہرے پہ شدید ہیجانی کیفیت تھی۔

"چھوٹی دلہن خدا گواہ ہے میں نے خود کو اس گھرانے کا فرد سمجھا ہے اور کبھی نمک حرامی نہیں کی اس لیے جاننے کے باوجود میں نے اس خط کا جواب نہیں دیا کیونکہ یہ نمک حرامی ہوتی پھر امیر میاں بھی پسند نہ کرتے۔ لیکن اب میں سمجھتی ہوں کہ اس خط کے جواب دینے کا ٹائم آگیا ہے۔"

"بوا آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"چھوٹی دلہن اس خط کے آخر میں ایڈریس بھی لکھا ہوا ہے۔ یہ آپ کے مسئلے کا حل ہے۔ کیونکہ زیان' وہاب میاں سے کسی صورت کسی قیمت پہ بھی شادی کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔"

"میں خود بھی زیان کی شادی وہاب سے کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ اس کی نظر میرے گھر پہ ہے میرے بچوں کے حق پہ ہے۔ زیان سے شادی کی صورت میں وہاب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ میں اور میرے بچے در در کی خاک چھانیں گے وہ زیان سے بھی سب کچھ ہتھیا لے گا۔ میں امیر علی کی روح کو کوئی تکلیف پہنچتے نہیں دیکھ سکتی۔" زرینہ کی آواز بھرا گئی۔ "اور یہ ایڈریس کا کیا چکر ہے۔" "انہیں یاد آگیا کہ بوا نے خط کے آخر میں لکھے کسی ایڈریس کا ذکر کیا تھا۔

"چھوٹی دلہن آپ زیان کو اس کی ماں کے پاس بھیج دیں۔" بوا نے نہایت سکون سے جواب دیا "خط کے آخر میں پتا لکھا ہوا ہے میں اسی کی بات کر رہی تھی۔"

"بوا اتنے برس گزر چکے ہیں کیا پتا اب حالات کیسے ہیں۔" وہ تذبذب میں تھیں۔

"حالات بالکل ٹھیک ہیں۔" بوا پہلی بار سکون سے مسکرائیں۔

"آپ کو کیسے پتا بوا؟"

میری رشتے کی بھانجی صغریٰ اسی ساتھ والے گاؤں میں رہتی ہے جس کا پتا خط میں لکھا ہے۔ میں نے اسے ڈھکے چھپے الفاظ میں کچھ معلومات کروانے کو کہا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو اس گاؤں میں بھیجا۔ وہ سب کچھ دیکھ بھال آیا ہے۔ بس میں اس بات پہ اس جرات پہ شرمندہ ہوں کہ میں نے آپ کو اطلاع دیے بغیر یہ سب کیا؟" بوا کی نگاہوں میں شرمندگی تھی۔

"ارے بوا ایسی بات تو نہ کریں۔ آپ نے تو بیٹھے بیٹھے میرا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ میں جس کام کو مشکل سمجھ رہی تھی وہ اتنا ہی آسان ہو گیا ہے کیونکہ زیان کی طرف سے میں ازحد پریشان ہوں۔" زرینہ کا چہرا خوشی سے چمک اٹھا۔ وہ سچ میں خوش تھیں۔

"چھوٹی دلہن میں صغریٰ کو وہاں جانے کے لیے بولتی ہوں وہ سب حالات بتا دے گی ان شاء اللہ وہاں سے اچھی خبر ہی ملے گی۔" وہ پر امید تھیں "بوا کیا وہ زیان کو اپنے پاس رکھنے کے لیے تیار ہو گی؟ مطلب وہ لوگ اسے قبول کر لیں گے؟" زرینہ کا انداز خدشات سے بھرا تھا۔

"چھوٹی دلہن صغریٰ بہت تعریف کر رہی تھی کہ نیک اور خدا ترس لوگ ہیں بہت امیر بھی ہیں۔ باقی اللہ خوب جانتا اور سمجھتا ہے۔"

"بوا ہمیں جلدی جلدی زیان کو یہاں سے بھیجنا ہو گا۔ میں وہاب کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔"

"صغریٰ وہاں سے سب معلومات لے آئے پھر میں آپ کو بتاؤں گی۔"

"بوا آپ اس کام میں دیر مت کرنا" زرینہ لجاجت سے بولیں۔

"چھوٹی دلہن آپ اللہ سے دعا کریں بس" بوا نے انہیں تسلی دی۔

☼ ☼ ☼

بوا کی بھانجی صغریٰ بوا کے کہنے پر خود اپنے بیٹے کے ساتھ "ملک محل" میں موجود تھیں۔ صغریٰ نے من و عن جو کچھ بوا رحمت نے انہیں بتایا تھا سب کچھ ملک ارسلان اور عنیزہ بیگم کے گوش گزار کر دیا تھا۔ عنیزہ نے بمشکل اپنے جذبات کو قابو میں رکھا۔ صغریٰ نے انہیں بوا کا نمبر بھی دیا۔

صغریٰ اور نواز ان کی بھرپور مہمان نوازی کا لطف اٹھانے کے بعد جا چکے تھے۔ عنیزہ جس نے مشکل سے اپنے اعصاب کو کنٹرول کر رکھا تھا ان کے جاتے ہی بکھر گئیں اور ملک ارسلان کے سینے سے لگ کر رو پڑیں۔

"ملک صاحب! میرے جگر کا ٹکڑا کن حالوں میں ہے۔ مجھے خبر ہی نہیں۔ ہائے میرے جیسی بے خبر ماں دنیا میں نہ ہو گی۔" وہ روتے روتے یہی تکرار کر رہی تھیں۔

"مجھے اپنی بچی کو وہاں سے نکالنا ہے مجھے اس سے اور دور نہیں رہنا اب۔ مجھے میری بچی لا دیں ملک صاحب۔ مجھ پہ اور ظلم نہ کریں اپنی بچی سے دور رہ کر میں نے جو سزا کاٹی ہے وہ بہت کڑی ہے۔ ملک صاحب میری سزا ختم کر دیں۔ مجھے میری بچی چاہیے" عنیزہ پہ ہذیانی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔

"وہ صرف تمہاری نہیں میری بھی بیٹی ہے میں خود اسے جا کر لاؤں گا۔ تم خود کو سنبھالو ورنہ میں بھی پریشان رہوں گا۔" ارسلان نے ان آنکھوں سے بھل بھل بہتے آنسو صاف کیے۔

"سچ آپ اسے لے آئیں گے؟" وہ انہیں بے یقینی سے دیکھ رہی تھیں۔ ارسلان کا دل کٹ سا گیا۔ اس عورت اس چہرے سے انہوں نے دنیا میں موجود ہر رشتے' ہر شے سے بڑھ کر محبت کی تھی وہ اس کے دکھ اس کے کرب سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس نے ان کے ساتھ شادی شدہ زندگی کا جتنا بھی عرصہ گزارا تھا جلتے تڑپتے سسکتے گزارا تھا۔ وہ ننگے پاؤں کانٹوں پہ چلی تھی۔ اس کے راستے کے خار چنتے چنتے' ملک ارسلان کے اپنے ہاتھ زخمی ہو گئے تھے پر وہ شکوہ زباں پہ نہ لائے۔ ان کی محبت شکوے شکایتوں سے ماورا تھی۔ ساری عمر اس کی صدا۔ وہ آنکھ بند کر کے چلے تھے اور وہ اب بھی بے یقینی کا شکار تھی۔

"ہاں میں اسے۔۔۔ خود جا کر لاؤں گا اپنی بیٹی کو" وہ ان کے راستے کے خار ایک بار پھر سے چن رہے تھے۔

"کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا جہانگیر بھائی اور افشاں بھابھی کو!" ساری عمر بے یقینی کے عالم میں گزارنے کے بعد اب بھی اندیشوں کے ناگ انہیں اپنی طرف بڑھتے محسوس ہو رہے تھے۔

جہانگیر بھائی اور افشاں بھابھی کیوں اعتراض کریں گے۔ تم اتنے سال یہاں رہنے کے باوجود بھی ابھی تک ان کے مزاج کو سمجھ نہیں پائیں۔ انہوں نے نہنال آنے پہ بھی کچھ نہیں کہا نہ کوئی سوال کیا ایک بار بھی ٹوہ لینے ہماری طرف نہیں آئے۔ ان کا دل بہت بڑا ہے۔ جہانگیر بھائی ہمدرد فطرت کے ہیں افشاں بھابھی بھی ان کا پرتو ہیں۔" ملک ارسلان نرم لہجے میں بولتے جیسے ان کے کانوں میں رس ٹپکا رہے تھے۔

"لیکن پھر بھی ہمیں ان کو بتانا چاہیے۔" عنیزہ نے رخ موڑتے ہوئے ان سے اپنے تاثرات چھپانے چاہے۔

"اچھا بابا آؤ ابھی بھائی جان کی طرف چلتے ہیں۔" ارسلان نے عنیزہ کو کندھے سے تھامتے ہوئے ان کا رخ اپنی موڑ کر اپنے مقابل کھڑا کیا۔

"تمہیں یاد ہے شادی کی پہلی رات میں نے تم سے ایک بات کہی تھی کہ "تم۔۔۔ تمہاری خوشی' تم سے وابستہ ہر رشتہ مجھے بہت عزیز ہے میں اس کی اتنی قدر کرتا ہوں جتنی تم کرتی ہو۔ کیونکہ میں نے محبت نہیں عشق کیا ہے تم سے۔"

"ملک صاحب مجھے سب یاد ہے۔"

"میں آج پھر وہی بات دہرا رہا ہوں کہ میں نے محبت نہیں عشق کیا ہے تم سے۔۔۔ وہ صرف تمہاری بیٹی نہیں بلکہ اب ہماری بیٹی ہے۔ میں کل بھی تمہارے

ساتھ تھا' آج بھی ہوں اور ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا۔ پتا ہے میں جب اللہ سے دعا مانگتا ہوں تو کہتا ہوں کہ اے اللہ تو نے عنیزہ کو جس طرح اس دنیا میں میرے ساتھ رکھا ہے۔ مرنے کے بعد اس دنیا میں بھی میری محبوب بیوی' میری محبت کو میرا ہم سفر بنانا۔"

ملک ارسلان ان کی نم آنکھوں کی گہرائیوں میں بغور دیکھتے ہوئے انہیں اپنی محبت کا یقین دلا رہے تھے۔ عنیزہ ان کا دائیں ہاتھ تھام کر عقیدت سے لبوں تک لے گئیں۔ یہ ان کے اظہار محبت کا خاص طریقہ تھا۔ ان کی آنکھوں میں محبت و یقین کے ہزاروں دیے جگمگا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

عنیزہ صبح یونیورسٹی کے لیے تیار ہو کر نکلی تو ہلکی بوندا باندی کا سلسلہ جاری تھا۔ سورج کا آسمان پہ کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ گھنگھور گھٹاؤں نے پورے ماحول کو گویا اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دن چڑھنے سے پہلے شام ڈھل آئی ہو۔

عنیزہ نے یونیورسٹی میں قدم رکھا تو رکے رکے بادل پوری قوت اور شدت کے ساتھ برس پڑے۔ اس کا یونیورسٹی میں پہلا دن تھا۔ وہ پریشانی سے ادھر ادھر اپنی ان دو کالج فیلوز کو ڈھونڈ رہی تھی جنہوں نے یونیورسٹی میں اس کے ساتھ ہی ایم اے اکنامکس میں داخلہ لیا تھا۔ وہ کیفے ٹیریا سے ابھی کافی فاصلے پہ تھی جب بادل شدت کے ساتھ گرجے اس نے اپنی جگہ پہ کھڑے کھڑے زور دار چیخ ماری۔ وہ درختوں کے سائے میں تھی اس لیے بھیگنے سے کافی حد تک محفوظ تھی۔ لیکن بادل گرجتے ساتھ ہی اس نے درختوں کے جھنڈ سے باہر کی طرف دوڑ لگائی۔ کیونکہ اس نے سن رکھا تھا کہ درختوں پہ آسمانی بجلی گرتی ہے اور جس خوفناک آواز میں ابھی بادل گرجے تھے اسے ڈر لگ رہا تھا کہ بجلی بھی لازمی گرے گی۔ بھاگتے ہوئے اپنی دھن اور پاؤں کیچڑ میں پھسلنے کی وجہ سے وہ خود بھی گرنے والی تھی جب کسی نے پاؤں اپنی ٹانگ سمیت آگے کرتے ہوئے اسے کیچڑ بوس ہونے سے بچا لیا وہ فوراً اپنے قدموں پہ سنبھلی۔

"یا وحشت آپ کے پیچھے ملک الموت تھا جو اندھا دھند بھاگ رہی ہیں آپ۔" وہ جو کوئی بھی تھا اسے ڈانٹ رہا تھا۔ عنیزہ نے خفت سے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ لمبے چوڑے سراپے پہ پرکشش چہرا اور شرارتی آنکھیں بجی تھیں۔ یہ ملک ارسلان کے ساتھ اس کا پہلا تعارف تھا۔

وہ اسی یونیورسٹی میں ایم بی اے کا اسٹوڈنٹ تھا۔ ان کے درمیان تعارف کے ابتدائی مراحل بہت جلد طے ہوئے۔ ملک ارسلان پنجاب کے زمین دار خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس سے بڑا ایک بھائی اور تھا۔ حال ہی میں اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ ملک ارسلان کا بڑا بھائی شادی شدہ اور دو چھوٹے چھوٹے بچوں کا باپ تھا۔ ملک ارسلان یہاں شہر میں پڑھائی کی غرض سے مقیم تھا اور ایک شاندار گھر میں اس کی رہائش تھی۔ وہ دو ماہ میں ایک بار گاؤں جاتا اور سب سے مل کر آجاتا۔

تھوڑے عرصے میں ہی وہ عنیزہ کے ساتھ بے تکلف ہو گیا۔

عنیزہ کی والدہ حیات نہیں تھیں صرف والد تھے جنہوں نے اسے ماں بن کر پالا تھا۔ وہ اکلوتی اولاد تھی بہت ساری محبت اور توجہ سمیٹنے کے باوجود بھی خود کو اکیلا محسوس کرتی۔ اس اکیلے پن کے احساس کو کم کرنے کے لیے اس نے بہت ساری سہیلیاں بھی بنا رکھی تھیں۔ لیکن سارا دن ان کے ساتھ گزارنے کے باوجود بھی وہ خود میں تشنگی محسوس کرتی۔

ملک ارسلان کا یونیورسٹی میں ملنا تھا تعارف بے تکلفی اس کے لیے زندگی کا دلچسپ ترین تجربہ تھا۔ ملک ارسلان اس کے ساتھ اپنے گاؤں بھائی بھابھی اپنے بھتیجوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور شرارتوں تک کو بھی شیئر کرتا۔ اسے ارسلان کا بولنا بہت اچھا لگتا تھا۔

☼ ☼ ☼

عنیزہ دھڑکتے دل کے ساتھ فون کان سے لگائے

ہوئے تھیں۔ وہ برسوں بعد بوا رحمت کی آواز سننے والی تھیں۔ بالآخر ان کا انتظار تمام ہوا۔ اب بوا سے ان کی بات ہو رہی تھی۔

"بوا آپ نے بہت دیر کر دی۔ میں تو سمجھتی تھی کہ آپ میرے دکھے دل کی پکار کو سن لیں گی۔ میں اپنی بچی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ترستی رہی۔ میں اس کے لیے کتنا روئی' کتنا تڑپی آپ کبھی نہیں جان پائیں گی۔ وہ صرف خط نہیں تھا ایک ماں کی حسرتوں کا نوحہ تھا' الفاظ کی صورت میں نے اپنا دل چیر کر رکھا تھا۔ پر آپ کو کیا اندازہ ممتا کا کیونکہ آپ کا دامن اس جذبے سے خالی جو رہا" بوا کے دل پہ گھونسا سا لگا کچھ بھی تھا انہوں نے زیان کو ماں بن کر ہی پالا تھا۔

"ایسا مت کہیں۔ میری اپنی مجبوریاں تھیں جن کے بوجھ تلے میں سسکتی رہی ورنہ آپ کے اس خط نے میرے ضمیر پہ بہت کوڑے برسائے ہیں۔ لیکن میں بھی تو ایک ملازمہ۔ میرے اختیارات محدود تھے۔" بوا کی آواز میں نمی در آئی تو عنیزہ کو اپنے الفاظ کی کڑواہٹ کا اندازہ ہوا۔ انہوں نے فوراً" بات کا رخ بدل دیا۔

"میری بچی کیسی ہے؟ خوش ہے ناں؟"

"ہاں بہت خوش ہے۔" بوا کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ انہوں نے عنیزہ کے ساتھ بات چیت ختم کی تو زیان کو انتظار میں پایا۔ ابھی انہیں زیان کے ضروری سامان کو پیک کرنا تھا۔ جب سے بوا اور زرینہ آنٹی نے اسے اس کی ماں کے پاس روانہ کرنے کی بات کی تھی وہ پہلے سے بھی زیادہ خاموش ہو گئی تھی۔ ابھی بھی وہ رو رہی تھی۔

"بوا میرا کوئی نہیں ہے ناں ابو کے بعد۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے ناں؟" وہ بچوں کی طرح استفسار کر رہی تھی۔

"زیان بیٹا اب تم نہ اکیلی ہو نہ بے گھر ہو تمہاری ماں ہے اور تمہارے حصے کی محبت' خوشیاں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ وہ دونوں میاں بیوی اکیلے ہیں اس میں بھی قدرت کی مصلحت ہے کہ رب کو ان کی ممتا کی پیاس تم سے ہی بجھانی منظور ہے۔"

"مجھے نفرت ہے ان سے۔ اتنے برس وہ کہاں تھیں پہلے۔ میں قطرہ قطرہ مری ہوں۔"

زیان پہ ہذیانی کیفیت یکایک طاری ہوئی۔ یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلے جانے کا فیصلہ اتنا آسان نہیں تھا۔ یہاں سے جانا اسے کانٹوں پہ چلنے کے مترادف محسوس ہو رہا تھا۔ پر بوا نے زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتے ہوئے جو تلخ حقیقت بیان کی تھیں وہ بھی اپنی جگہ کم سنگین نہیں تھی۔ وہ یہاں رہتی تو اسے ہر حال میں وہاب سے شادی کرنی پڑتی جو کہ اسے منظور نہیں تھا۔ اب امیر علی بھی نہیں تھے جن کی وجہ سے طوہا" کرہا" وہ یہاں رہنے پہ مجبور تھی۔

زندگی گرداب میں گھری ہوئی تھی آگے کنواں پیچھے کھائی تھی۔ زرینہ بیگم نے اس کے یہاں سے جانے کے عمل کی حمایت کی تھی۔ کچھ بھی تھا انہیں وہاب کی دست درازی پسند نہیں آئی تھی کم سے کم وہ اپنی ماں کے پاس ایسی صورت حال سے محفوظ رہتی۔ مگر کوئی زیان سے پوچھتا وہ کس دل سے یہاں سے جا رہی تھی۔ بوا کے لاکھ نرمی سے سمجھانے کے باوجود اس کی نفرت اور دل کا زہر جوں کا توں تھا۔ بوا کو امید تھی کہ آنے والے وقت میں اپنی ماں کے ساتھ اس کے تعلقات معمول پہ آجائیں گے۔ ماں کے ساتھ رہنے سے اس کی ممتائی نرمی محسوس کرنے سے جلد یا بدیر اس کی نفرت کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔

"بس اب تمہیں رونے دھونے کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" بوا نے اسے چمکارا۔

"بوا میں آپ کے بغیر کیسے رہوں گی؟" بے بسی سی بے بسی تھی اس کے لہجہ میں۔

"میں آؤں گی تم سے ملنے" انہوں نے آنکھوں میں در آنے والے آنسو پلکوں کی باڑھ پہ ہی روک لیے۔

"بوا سچ' آپ آیا کریں گی وہاں؟" اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

"ہاں زندگی نے مہلت دی تو ضرور آؤں گی۔"

"ممّوا آپ میرے ساتھ ہی چلیں ناں۔ یہاں کیا کریں گی؟" وہ بچوں کی طرح ٹھنکی۔

"میں نے ساری عمر یہاں گزار دی ہے۔ اب اس گھر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ اب میری میت ہی یہاں سے جائے گی۔ یہاں چھوٹی دلہن ہے۔ آفاق' رابیل' منال ہیں۔ میں ان کو اکیلا چھوڑ کر کیسے جاؤں۔"

ان کا چہرہ محبت کی روشنی سے جگمگ کر رہا تھا' اس محبت سے جو انہوں نے اس گھر کے مکینوں سے 'بے غرض ہو کر بغیر کسی صلے کی تمنا کے کی تھی۔ زیان محبت سے بے تاب ہو کر ان کے سینے سے لگ گئی۔

تھوڑی دیر بعد بوا زیان کے کپڑے اور دیگر چیزیں سوٹ کیس میں رکھ رہی تھیں۔ وہ ان کے پاس بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھی۔ کل اسے یہاں سے چلے جانا تھا۔ دہاب کی طبیعت خراب تھی اس لیے شام کو روبینہ اپنے گھر چلی گئی تھیں۔ بوا اور زرینہ دعا کر رہی تھیں کہ زیان آرام و سکون سے چلی جائے۔ بعد میں جو ہوتا دیکھا جاتا۔ فی الحال دہاب کا لاعلم رہنا ضروری تھا۔

✲ ✲ ✲

مرے دل میرے مسافر
ہوا حکم پھر سے صادر
کہ وطن بدر رہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یار نامہ بر کا
ہر ایک اجنبی سے پوچھیں
جو پتا تھا اپنے گھر کا
سر کوئے ناشناسیاں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی ان سے بات کرنا
تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شب غم بری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا برا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا۔

زیان جانے کے لیے تیار تھی۔ آفاق' رابیل' منال اسے حیرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ زرینہ نے انہیں ابھی کچھ دیر پہلے ہی زیان کی یہاں سے روانگی کا بتایا تھا۔ وہ تینوں ابھی اتنے سمجھ دار نہیں تھے کہ انہیں کھل کر کچھ بتایا جاتا۔ زیان نے ان کے ساتھ اب تک کی تمام عمر گزاری تھی لیکن ان میں بہن بھائی والی مخصوص محبت یا چاہت پیدا نہیں ہو پائی تھی پر ابھی جب وہ زیان کو روانگی کی تیاری کرتے دیکھ رہے تھے اس کا دل کر رہا تھا تینوں کو گلے لگا کر روئے۔

ملک ارسلان اپنے ڈرائیور اور ایک گارڈ کے ساتھ زیان کو لینے پہنچ چکے تھے۔ بوا ان کو یہاں کے حالات اور دہاب کے بارے میں "مختصرا" بتا چکی تھیں اس لیے وہ احتیاطا" کسی بھی بدمزگی سے نمٹنے کے لیے گارڈ کو ساتھ لائے تھے جو مسلح تھا۔ وہ جس شاندار گاڑی میں زیان کو لینے آئے تھے اس نے بوا سمیت زرینہ بیگم کو بھی مرعوب کیا تھا۔

زیان نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ انتہائی باوقار اور شاندار شخصیت کا مالک درمیانی عمر کا یہ مرد اس کے لیے اجنبی تھا اس نے کسی خاص جذبے کا اظہار نہیں کیا۔ ملک ارسلان نے تب خود ہی آگے بڑھ کر تعارف کروایا اور اس کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا۔ زیان نے موہوم سی گرم جوشی سے ان کے سلام کا جواب دیا تو وہ مسکرائے وہ اس کے غیرت بھرے رد عمل کے پس منظر سے آگاہ تھے اس کا یہ رد عمل عین فطرت تھا۔ اس کا مختصر سا سامان گاڑی میں منتقل ہو چکا تھا۔ وہ سب سے ملی۔ ایک نئی منزل اڑان بھرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

✲ ✲ ✲
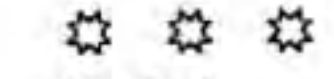
عنیزہ صبح سویرے جاگ گئی تھیں۔ بے چینی اور

خوشی حد سے سوا تھی۔ عنیزہ نے سب سے پہلے نیناں کو بتایا کہ میری بیٹی آرہی ہے پورے گھر کی صفائی کروانی ہے اور نئے پردے بھی لگانے ہیں۔ اس نے فورا" یہ کام اپنے ذمہ لیا۔ کوئی دیکھتا تو پہچان نہ پاتا کہ لان کے عام سے سوٹ میں ملبوس خوب صورت اسٹائل میں تراشیدہ بالوں کو باندھے سر پہ دوپٹا اوڑھے نوکرانیوں کے کام کو چیک کرنے والی یہ لڑکی رِمشہ ہے۔

وہ پہلے سی اب رہی بھی کہاں تھی۔ وہ اب عام سی مڈل کلاس لڑکی لگتی تھی۔ نہ وہ اسٹائلش ڈریسنگ نہ سب سے ممتاز کرتا رکھ رکھاؤ' نہ نزاکت اور نخرا۔ یہ تو نیناں تھی۔ حالات اور زمانے کی ستائی بے آسرا بے سہارا لڑکی جس کا دنیا میں آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ ملک ارسلان اور عنیزہ ترس کھا کر جسے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ عنیزہ نے یہاں اس پہ کمال مہربانی کرتے ہوئے اس کے سپرد چھوٹے موٹے کام کیے تھے۔ مثلا" نوکرانیوں کے کام کو چیک کرنا۔ باغ کے پودوں کو دیکھنا کہ آیا ان کی درست دیکھ بھال ہو رہی ہے کہ نہیں۔ اسی نوعیت کے اور چھوٹے موٹے کام تھے۔ جو ہر لحاظ سے حویلی میں کام کرنے والوں کے نزدیک باعزت تھے۔ اس کے باوجود بھی وہ اپنی حیثیت سے واقف تھی۔ اس نے سب کے اچھے برتاؤ دیکھ کر دل میں کسی خوش فہمی کو جگہ نہیں دی تھی۔

فارغ ہو کر عنیزہ کے پاس بیٹھ جاتی۔ وہ سارا دن "ملک محل" میں آنے والی عورتوں کے دکھڑے اور مسائل سنتیں ان کا حل نکالتیں۔ نیناں کو یہ کام بہت دلچسپ لگتا۔ ہر عورت کے پاس الگ ہی موضوع ہوتا۔ جو دوسری عورت کے مسئلے سے بالکل ہی جدا ہوتا۔ اس نے شہر میں ناز و نعم میں زندگی گزاری تھی۔ مسائل' مشکلات' غربت' بیماری' دکھ' تکلیف اور آفت کیا ہوتی ہے اسے ان باتوں کا ہرگز اندازہ نہ تھا۔ یہ سب اس کے لیے ایلس کی "ونڈر لینڈ" جیسا تھا۔

عنیزہ آج بے پناہ خوش تھیں۔ صبح صبح ہی انہوں نے اسے اپنی بیٹی کی آمد کی نوید دی تھی۔ اسے یہاں آئے ایک ماہ سے اوپر ہو چلا تھا اس دوران اس نے ان کی بیٹی کی ایک جھلک تک نہ دیکھی تھی نہ ذکر سنا تھا۔ وہ جاننے کے باوجود بھی ان سے پوچھ نہ پائی۔ پوری حویلی لشکارے مار رہی تھی۔ عنیزہ نے گھوم پھر کر پورے گھر کا خود جائزہ لیا۔ حویلی کی اوپری منزل پہ انہوں نے اپنی بیٹی کے لیے بطور خاص کمرا تیار کروایا تھا۔ جس کی سجاوٹ اور فرنیچر دیکھنے کے لائق تھا۔

جا بہ جا کمرے میں تازہ پھول بہار دکھا رہے تھے اور خود عنیزہ آج بہت اہتمام سے تیار ہوئی تھیں۔ دونوں کلائیوں میں موتیے کے گجرے سجائے ارسلان کی پسند کا سوٹ زیب تن کیے خود کو خوشبو میں بسائے عنیزہ کسی نو عمر دوشیزہ کی مانند پر جوش اور تر و تازہ لگ رہی تھیں۔

نیناں باغ میں تھی۔ دور دور تک ہریالی کی چادر بچھی تھی۔ وہ پھول توڑتے ہوئے عنیزہ ملک کی بیٹی کے بارے میں سوچ رہی تھی جس کے استقبال کی تیاریاں ایسے ہو رہی تھیں جیسے کسی ریاست کی شہزادی آرہی ہو۔ کچھ دیر کے لیے اسے عنیزہ ملک کی بیٹی سے حسد سا محسوس ہوا۔ اسے پاپا یاد آگئے تھے۔ ان کے یاد آتے ہی دل پہ جیسے بھاری بوجھ آن گرا۔

ویسے نیناں یعنی رِمشہ نے بہت جلد حویلی کے رنگ ڈھنگ اپنا لیے تھے۔ یہاں کا ماحول شہر سے یکسر مختلف تھا۔ لیکن اس فرق میں اسے ایڈونچر اور کشش محسوس ہوتی۔ گھٹی بندھی زندگی سے یکسر مختلف۔ وہ یہاں ایک عام سی لڑکی تھی بے سہارا۔ بے آسرا' عنیزہ ملک نے اپنے تئیں اسے ہر ممکن سہولت دینے کی پوری کوشش کی تھی۔

وہ نوکرانیوں کو ہدایت دیتی ان کی نگرانی کرتی تو اس میں بھی اسے لطف آتا کیونکہ اس کے اندر کی رِمشہ سیال زندہ تھی جو احمد سیال کی لاڈلی نازوں پلی بیٹی تھی۔ اسے رات کی تنہائیوں میں ان کی یاد آتی تو دل میں ہوک سی اٹھتی انہوں نے اس کی ذرا سی بات تک نہ مانی تھی۔ مان لیتے تو آج یہاں نہ پڑی ہوتی شادی کر کے اپنے شوہر کے ساتھ ہوتی۔ سب کچھ ہونے کے باوجود وہ لاوارثوں کی طرح یہاں پڑی تھی۔ اور وہ خود

منوں مٹی تلے جا سوئے تھے۔ پھول توڑتے ہوئے کوئی کانٹا اس کے ہاتھ میں چبھا تھا جس نے تکلیف کے احساس سے دوچار کرنے کے ساتھ ساتھ پاپا کی یادوں کے حصار سے بھی نکالا۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا آنسو اس کی آنکھوں میں نہ آتے۔

☼ ☼ ☼

سنگ مرمر کی سفید عمارت ان کی منزل ثابت ہوئی۔ یہ عمارت دور ہی سے مکینوں کی امارت اور خوشحالی کا اعلان کر رہی تھی۔ اس میں قدم رکھتے ہی زیان کو بہت سی باتوں کا اندازہ ہو گیا۔ لینڈ کروزر جس میں بیٹھ کر وہ یہاں پہنچی تھی 'رہائشی حصے سے باہر کھڑی تھی زیان کا مختصر سا سامان اس میں سے نکال کر اندر پہنچایا جا چکا تھا۔

عنیزہ اس کے استقبال کے لیے منقش دروازے کے پاس ہی کھڑی تھیں۔ سفید سنگ مرمر کی اس عمارت کی طرح ان کی شخصیت بھی بے انتہا شاندار تھی۔ ان کے ساتھ باوقار سی ایک اور خاتون بھی تھیں یہ افشاں بیگم تھیں۔ عنیزہ کو دیکھتے ہی زیان کے دل نے خاص گواہی دی کیونکہ ان کے چہرے پہ محبت ہی محبت تھی ممتا کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ انھوں نے دونوں بازو کھولتے ہوئے بڑھ کر زیان کو سینے سے لگا لیا۔ وہ اس کے چہرے' ہاتھوں' بالوں اور ماتھے پہ دیوانہ وار بوسے دے رہی تھیں۔

"میری بچی میری زیان مجھے امید نہیں تھی کہ جیتے جی میں تمہیں دیکھ پاؤں گی۔" وہ اسے سینے سے چمٹائے بولتے ہوئے روتی جا رہی تھیں۔ افشاں بیگم اور ساتھ کھڑی نوکرانیوں کی آنکھیں اس جذباتی منظر پہ خود بہ خود ہی بھیگ گئی۔

عنیزہ نے طویل عرصے بعد اپنے جگر کے ٹکڑے کو دیکھا تھا برسوں تڑپی تھیں اور آج وہ حقیقت بن کر ان کے سامنے کھڑی تھی۔ ان کی ممتا امنڈی پڑ رہی تھی۔ لیکن زیان بالکل نارمل انداز میں ملی۔ عنیزہ کی جذباتی دل گرفتہ کیفیت نے اس کے اندر وہ خاص جذبہ پیدا نہیں کیا' جو برسوں بعد ماں سے ملنے والی بیٹی کے دل میں ہونا چاہیے تھا۔ عنیزہ کے بعد افشاں بیگم نے بھی اسے سینے سے لگایا اور اس کے ماتھے پہ بوسہ ثبت کیا۔ زیان نے اچھے طریقے سے ان سے خیر خیریت دریافت کی' افشاں بیگم کے چہرے پہ زیان کو دیکھتے ہی متاثر ہونے والی خاص کیفیت پیدا ہوئی تھی جسے مرعوبیت کا نام دیا جا سکتا تھا۔

سب نوکرانیوں نے فردا" فردا" اسے سلام کیا۔ عنیزہ ساتھ ساتھ تعارف بھی کرواتی جا رہی تھیں۔ نیناں سب سے الگ آخر میں کھڑی تھی۔ اس نے بھی زیان کو خوش آمدید کہا۔ زیان نے سفید شیفون کی لانگ شرٹ اور چوڑی دار پائجامہ زیب تن کر رکھا تھا ساتھ ہمرنگ جھاگ جھاگ دوپٹا جس کے کنارے میرون اور سلور لیس کے ساتھ ننھے منے گھنگھرو لگے ہوئے تھے۔ پاؤں میں سلور نگوں والی ہائی ہیل جوتی' ریشمی لمبے بال جو دونوں شانوں کے گرد بکھرے تھے۔ ستواں ناک' مغرور جاذب نظر ناک نقشہ۔ وہ پہلی نظر میں ہی اوروں کے ساتھ ساتھ نیناں کو بھی متوجہ کر گئی تھی۔ قدرت نے اسے جی بھر کر دل کشی اور جاذبیت سے نوازا تھا۔ نیناں نے ایک گہری نظر اسے دیکھنے کے بعد خود کو دیکھا۔ کتنے عام سے کپڑے اور عام سے حلیے میں تھی وہ۔

یونیورسٹی میں اسے فیشن آئیکون کہا جاتا تھا اس کے اسٹائل کو کاپی کیا جاتا۔ اور اب یہ لڑکی جو کروفر سے ملک محل میں تازہ تازہ وارد ہوئی تھی اسے خوامخواہ ہی پریشانی سے دوچار کر گئی تھی۔ اتنے دن کے بعد نیناں عرف رنم کو اپنی پرانی زندگی یاد آئی تھی۔ کبھی وہ بھی اپنے پاپا کے ساتھ اپنے گھر میں اسی کروفر اور آن بان کے ساتھ رہتی تھی۔ بالکل کسی شہزادی کی مانند۔ جو پروٹوکول عنیزہ ملک کی بیٹی کو یہاں مل رہا تھا اپنے گھر میں اسے بھی ملتا تھا۔ مگر اب سب بدل گیا تھا۔ وہ شہر سے گاؤں پہنچ چکی تھی۔ مالکن سے نوکرانی بن گئی تھی۔

عنیزہ محبت سے زیان کو دیکھ رہی تھیں۔ یہ پیاسی ممتا کی آنکھیں تھیں۔ انہوں نے زیان کو کچھ دیر بعد

نوکرانی کے ساتھ اوپر بھیج دیا تاکہ وہ فریش ہو جائے اور اپنا کمرہ بھی دیکھ لے۔

افشاں بیگم اور عنیزہ اب دونوں شاندار سٹنگ روم میں بیٹھیں باتیں کر رہی تھیں۔ موضوع گفتگو زیان ہی تھی۔

"ماشاء اللہ زیان بہت خوب صورت ہے اپنے نام کی طرح۔ چاند کا ٹکڑا ہے" افشاں بیگم نے جو تھی بار یہ جملہ کہا تو عنیزہ مسکرا دیں یہ خوشی کی مسکراہٹ تھی کیونکہ ان کی زیان کو حویلی میں قبول کر لیا گیا تھا۔

"جہانگیر بھائی کی طبیعت اب کیسی ہے؟" انہوں نے گفتگو کے دوران پوچھا۔

"پہلے سے تو بہتر ہے لیکن آپریشن کروانے کے بعد بھی ملک صاحب کو آرام نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے بہت احتیاط بتائی ہے پر سنتے ہی نہیں کسی کی" افشاں بیگم کا لہجہ شکایتی تھا۔

"کل جب میں ان کی طبیعت کا پوچھنے گئی تو کہہ رہے تھے کہ لیٹے لیٹے تنگ آ گیا ہوں کچھ پڑھ بھی نہیں سکتا۔"

"ابھی تازہ تازہ موتیے کا آپریشن ہوا ہے اتنی جلدی کہاں کچھ پڑھ سکیں گے۔"

"بھابھی جہانگیر بھائی بھی کیا کریں مجلسی' یار باش انسان ہیں۔ ایک کمرے میں رہ رہ کر گھبرا گئے ہیں۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو یہ بڑھاپا اور بیماری انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ میں نے زیان کا بتایا تھا پر وہ ٹھیک نہیں ہیں اس لیے نہیں آئے ہیں ملک صاحب۔"

"بھابھی شرمندہ تو نہ کریں مجھے۔ زیان خود جا کر مل آئے گی ان سے بزرگ ہیں وہ ہمارے۔"

"اور یہ نیناں کہاں ہے کافی دیر سے نظر نہیں آ رہی ہے۔" افشاں بیگم نے بات کا رخ بدلا۔

"صبح سے نوکرانیوں کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ میں نے اوپر والا سب حصہ صاف کروایا ہے اور نئے پردے بھی لگوائے ہیں۔ نیناں بہت محنتی ہے۔ کہتی ہے بیٹھ بیٹھ کے تھک جاتی ہوں مصروف رہنا اچھا لگتا ہے۔ ادھر ادھر کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی ہے۔" عنیزہ نے افشاں بیگم کو تفصیلی جواب دیا تو انہوں نے تاسف سے سر ہلایا۔ "بے چاری۔"

"ہاں بھابھی یہ ایک انڈسٹریل ہوم کی تعمیر کب شروع کروائے گا؟" عنیزہ نے اچانک پوچھا۔

"کہہ رہا تھا جلدی کام شروع کرواؤں گا میٹریل تو منگوا لیا ہے۔ اسی سلسلے میں شہر گیا ہوا ہے۔" افشاں بیگم نے سادہ انداز میں بتایا۔

"بھابھی میں سوچ رہی ہوں جب ایک اپنا انڈسٹریل ہوم بنا لے تو میں نیناں کے بارے میں اس سے بات کروں۔"

"کون سی بات؟" وہ متنفر ہوئیں۔

"یہی کہ نیناں کو بھی انڈسٹریل ہوم میں کوئی کام بتائے۔ پڑھی لکھی لڑکی ہے اسی حساب سے کام کرتی اچھی لگے گی ناں۔"

"ہاں بے چاری اچھے گھر کی لگتی ہے پر قسمت رول دیتی ہے انسان کو" افشاں بیگم نے گہرے فلسفیانہ لہجہ میں کہا۔

"ہاں بھابھی ٹھیک کہتی ہیں آپ۔ مجھے تو بہت ترس آتا ہے نیناں پہ" عنیزہ نے بھی ہمدردی کے جذبات کا اظہار کیا۔

☼ ☼ ☼
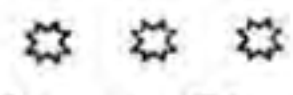
وسیع و عریض ڈائننگ ہال میں کھانے کی میز پہ صرف تین نفوس تھے۔ عنیزہ' ملک ارسلان اور خود زیان۔ ٹیبل انواع و اقسام کی ڈشز سے بھری ہوئی تھی۔ ملک ارسلان اور عنیزہ ایک ایک چیز خود اٹھا کر اس کی پلیٹ میں ڈال رہے تھے۔ چکھنے کے دوران ہی اس کا پیٹ بھر گیا تھا۔ یہ بات اس نے دل میں تسلیم کی تھی کہ کھانا بے حد لذیذ ہے۔ عنیزہ نے زیان کی آمد سے کئی گھنٹے پہلے ہی کھانا پکانے والی تینوں نوکرانیوں کو باورچی خانے میں مصروف کر دیا تھا۔

ملک ارسلان کا رویہ بے حد دوستانہ اور اپنائیت بھرا تھا۔ کھانے کے بعد وہ اس کی اجنبیت دور کرنے

کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔

عنیزہ محبت بھری نگاہوں سے زیان کو دیکھے جارہی تھیں۔ زیان بہت کم بول رہی تھی یا مختصر ترین جواب دے رہی تھی۔ ان کے لہجے اور انداز میں زیان کے لیے شفقت تھی۔ اسے بہت سوچنے کے بعد بھی ایسا کوئی لمحہ یاد نہیں آیا 'جب امیر علی نے پاس بیٹھ کر اس سے اتنی محبت اور توجہ سے کوئی بات کی ہو یا پوچھا ہو۔ یہ اجنبی مرد کیوں اس پہ حد درجہ مہربان ہے؟ کیوں اتنی شفقت کا برتاؤ کر رہا ہے؟ جبکہ اپنے سگے باپ تک نے اسے کبھی اتنی اہمیت نہیں دی جتنی یہاں مل رہی تھی۔ اس کے دماغ میں کش مکش ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ملک محل میں اس کی آمد کی پہلی رات تھی۔ عنیزہ خود زیان کو کمرے میں چھوڑنے آئی تھیں۔ اس کا بیڈ روم اوپری منزل پہ تھا۔

"چلو تم آرام کرو تھک گئی ہو گی لمبے سفر سے" عنیزہ کو اس کے پاس بیٹھے پندرہ منٹ سے اوپر ہو گئے تھے۔ ان کی باتوں کے جواب میں زیان ہوں ہاں کر رہی تھی یا پھر سرہلانے پہ اکتفا کر رہی تھی۔ عنیزہ اسے نیند یا تھکن کا اثر سمجھی تھیں۔

"میں چلتی ہوں بیٹا تم ریسٹ کرو" عنیزہ نے جانے سے پہلے اسے سینے سے لگا کر ایک بار پھر اس کا ماتھا چوما۔ وہ رسمی سے انداز میں مسکرائی۔ عنیزہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھتی نیچے جارہی تھیں۔ زیان کی نظریں جیسے ان کے آگے بڑھتے قدموں کا حساب کر رہی تھی۔ وہ نگاہوں سے اوجھل ہوئی تو اس نے دروازہ بند کیا۔

اس نے دروازہ لاک کرنے کے بعد آگے پردے بھی کھینچ دیے پھر کھڑکیوں کے ساتھ بھی اس نے یہی سلوک کیا تو بعد میں اسے اپنی اس احتیاط پہ خود ہی ہنسی آگئی۔ یہ زرینہ آنٹی کا گھر نہیں تھا بلکہ وہاں سے وہ آج یہاں آگئی تھی اور وہاب جیسا عفریت بھی نہیں تھا جو وہ اس طرح سب دروازے اور کھڑکیاں بند کر رہی تھی۔ جبکہ یہاں تو ملک ارسلان تھے شاندار پرسنالٹی کے مالک۔ اس کی ماں تھی 'عنیزہ۔ بالکل ملک ارسلان کی طرح باوقار۔ یہ بے پناہ سہولیات والا شاندار گھر اس کا تھا۔ پر اس کے دل میں بے پناہ نفرت بھی تو تھی۔ دل میں اگنے والے نفرت و بیگانگی کے تناور درخت کو تازہ پانی مل گیا تھا۔ وہ کچھ مثبت سوچنے پہ آمادہ نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے کھڑکیوں پہ پڑے پردے سرکائے۔ داخلی دروازے کے ساتھ کی پوری دیوار شیشے کی تھی جس پہ پردے تھے اس نے وہ سب پردے بھی ہٹا دیے۔ شیشے کی دیوار کے آگے طویل برآمدہ تھا جس کے کونے کے ساتھ پودوں کے پینٹ کیے ہوئے گملے تھے۔ برآمدے کو سہارا دینے والے ستونوں کے گرد سرسبز بیلیں لپٹی اوپر تک جارہی تھی۔ زیان کو شیشے کی دیوار سے پرے نظارا بڑا دلچسپ لگا۔ وہ بیڈ روم کا دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں آگئی۔ سامنے کنارے پہ چار فٹ اونچی دیوار تھی۔ سامنے آگے کچھ فاصلے پہ بالکل اسی بناوٹ کی ایک اور عمارت تھی۔ شام کو عنیزہ نے اسے بتایا تھا کہ سامنے والا رہائشی حصہ افشاں بھابھی کا ہے۔

دونوں عمارتیں ایک جیسی تھیں۔ دوسری عمارت کی اوپری منزل پہ زیان کے کمرے کے عین سامنے بالکل اسی جیسا کمرا تھا۔ وہ دیوار پہ کہنیاں ٹکا کر کھڑی ہو گی اور سامنے موجود کمرے کو دیکھنے لگی جس کی کھڑکی اور دروازہ 'دونوں کھلے ہوئے تھے۔ کمرے کی برآمدے کی سب لائیٹیں بھی آن تھیں۔ وسیع ٹیرس پھولوں کے بڑے بڑے گملوں سے سجا ہوا تھا۔ کھلے دروازے سے اندر کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پردے سمٹے ہونے کی وجہ سے وہ اندر موجود ایک ایک چیز کو دیکھ سکتی تھی۔ مشرقی دیوار کے ساتھ جہازی سائز بیڈ پڑا تھا۔ سیلنگ فین کے چلنے کی وجہ سے سمٹے پردے دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔

وہ بڑی دلچسپی سے جائزہ لے رہی تھی جب اچانک ایک نوجوان تولیے سے سر رگڑتا جانے کہاں سے برآمد ہوا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ زیان کی طرف اس کی پشت تھی۔ چوڑے کندھے اور بازوؤں کے مسلز واضح تھے۔ وہ بالوں میں برش کر رہا تھا۔ اسے پہلے کہ وہ پلٹتا زیان برآمدے سے ہٹ کر کمرے میں آگئی۔ افشاں آنٹی کے گھر سے ہی کوئی ہو گا اس نے اندازہ لگایا۔ اسے یہاں آئے ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے اس لیے یہاں کی مکینوں کے بارے میں لاعلم ہی تھی۔

شکر ہے کہ وہ اس اجنبی نوجوان کے رخ موڑنے سے قبل ہی کمرے میں آگئی تھی وہ برآمدے کی دیوار کے ساتھ کھڑی بے دھیانی میں جائزہ لینے میں مگن تھی وہ جو کوئی بھی تھا اسے اس انداز میں دیکھتا تو جانے کیا سوچتا۔ دونوں کمرے اوپری منزل پہ بالکل آمنے سامنے اور طرز تعمیر 'نقشے' بناوٹ 'رنگ میں ایک جیسے تھے۔ ملک محل کے دو حصے تھے۔ ایک میں ملک جہانگیر اور دوسرے میں ملک ارسلان رہائش پذیر تھے۔ دونوں حصوں کو الگ اور جدا کرنے کے لیے ڈم ڈم کی باڑ اور اس کے بعد سرسبز میدان تھا۔

زیان صوفے پہ بیٹھ گئی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ اپنی بے معنی 'لایعنی سوچوں کے بھنور میں ڈوبتے ابھرتے جانے کتنی دیر گزر چکی تھی۔ اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہونے لگی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیڈ کی طرف آئی تو نہ چاہتے ہوئے نگاہ شیشے کی دیوار سے بڑے کمرے کی طرف اٹھ گئی۔ دوسری طرف بھی شیشے کی دیوار پہ سے پردے سرکا دیے گئے تھے۔ اندر زیرو پاور کی سبز لائٹ جل رہی تھی اور وہ جو کوئی بھی تھا بیڈ پہ لیٹا ایک تکیہ سیدھے بازو تلے دبائے سو رہا تھا۔ زیان کے کمرے کی لائٹس آف تھیں۔ پھر بھی احتیاطاً" اس نے شیشے کے دیوار پہ پردے برابر کر دیے۔ البتہ کھڑکی ہنوز کھلی تھی اور پردے بھی ہٹے ہوئے تھے۔ وہ صوفے سے اٹھ کر مسہری پہ آئی اور نیم دراز ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

زیان 'عنیزہ اور ملک ارسلان تینوں ناشتا کر رہے تھے۔ بیچ بیچ میں باتیں بھی جاری تھی۔

"ملک صاحب مجھے مارکیٹ جانا ہے۔ زیان کو شاپنگ کروانی ہے۔" عنیزہ نے ملک ارسلان کو مطلع کیا۔ زیان نے ایک نگاہ اٹھا کر دونوں کے چہرے پہ ڈالی اور پھر سے ناشتا کرنے میں مصروف ہو گئی۔

"ہاں تو تم ڈرائیور اور گارڈ کے ساتھ چلی جاؤ۔" انہوں نے باخوشی عنیزہ کو اجازت دی۔

"آپ ساتھ نہیں جائیں گے؟" عنیزہ کو جیسے تھوڑی مایوسی ہوئی۔ "مجھے آج کورٹ جانا ہے چودھری ریاض والے کیس کے سلسلے میں۔ رات ایبک بھی واپس آگیا ہے۔ میرا جانا ضروری نہ ہوتا تو تمہارے ساتھ ضرور جاتا۔ ایبک بھی اسی وجہ سے آیا ہے۔"

"اچھا ایبک آگیا ہے۔" عنیزہ نے خوشی کا اظہار کیا۔

"ہاں رات کو آیا ہے۔ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد میں اس سے ملا ہوں" ملک ارسلان نے تفصیل بتائی۔

"اچھا میں زیان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔" عنیزہ انہیں بتانے لگیں۔

"تم ناشتا کرنے کے بعد جانے کی تیاری کرو اچھا خاصا ٹائم لگ جائے گا۔" ملک ارسلان نے مشورہ دیا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"زیان بیٹا 'ناشتا کر چکی تو چینج کرو ہمیں جلدی جانا ہو گا۔" عنیزہ نے روئے سخن اس کی طرف موڑا تو اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔

خریداری کرتے ہوئے زیان نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ بس عنیزہ جو لیتی گئیں وہ بغیر کسی تاثر کے دیکھتی رہی نہ پسندیدگی کا اظہار کیا نہ ناپسندیدگی کا۔ ایسے لگ رہا تھا وہ روبوٹ ہے سوئچ آن آف کرنے کی محتاج۔

عنیزہ نے اس کے لیے بے شمار کپڑے 'جوتے' جیولری کاسمیٹکس پروڈکٹس خریدیں سب اشیاء برانڈڈ اور بیش قیمت تھیں۔ پر زیان کے چہرے پہ ایک بار بھی کسی تاثر نے جگہ نہیں بنائی۔ اس کی یہ خاموشی

'سرد مہری اور بیگانگی عنیزہ کے لیے تکلیف دہ تھی۔ گزرتے اٹھارہ برسوں نے زیان کو ان سے صدیوں کے فاصلے پہ لا کھڑا کیا تھا۔ وہ اجنبی کی مانند برتاؤ کر رہی تھی۔ وہ خود سے مخاطب کرتیں تو زیان بولتی ورنہ اس کے لبوں پہ چپ کا قفل تھا۔

" واپسی پہ بہت دیر ہو جائے گی ورنہ آج میں تمہیں جہانگیر بھائی سے ملواتی۔ تم ان سے مل کر بہت خوشی محسوس کرو گی کیونکہ جہانگیر بھائی بہت محبت کرنے والے انسان ہیں۔" شاپنگ ختم کرنے کے بعد وہ اب واپس جا رہی تھیں جب عنیزہ نے گفتگو کا آغاز کیا۔ جواب میں زیان نے سر ہلایا۔

"پتا ہے افشاں بھابھی تمہاری اتنی تعریف کر رہی تھیں کہتی ہیں زیان چاند کا ٹکڑا ہے بہت خوب صورت ہے۔" عنیزہ کا چہرہ یہ بتاتے ہوئے خوشی سے چمک رہا تھا۔ زیان کے چہرے پہ مسکراہٹ ابھری۔

"افشاں بھابھی کے دو بیٹے ہیں۔ چھوٹا معاذ پڑھنے کے لیے باہر گیا ہوا ہے جبکہ ایبک یہیں ہے۔ زیادہ تر شہر میں رہتا ہے۔ بہت مصروف ہوتا ہے۔ کہتا ہے گاؤں میں انڈسٹریل ہوم بنواؤں گا بلکہ اس نے کام بھی شروع کروا دیا ہے۔ اس کا ارادہ گاؤں میں بہت اچھا اسکول بنانے کا بھی ہے۔ اس کے دل میں اوروں کے لیے کام کرنے کا جذبہ ہے۔ شہر کے ساتھ ساتھ وہ گاؤں میں بھی بہت مصروف رہتا ہے۔ ہم آج شاپنگ کے لیے آگئے ورنہ تمہاری اسے ملاقات ہو جاتی۔ ایبک بہت احترام کرتا ہے میرا۔"

عنیزہ ایبک نامی شخص کے بارے میں بہت تفصیل سے بتا رہی تھیں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی بس غائب دماغی سے سر ہلائے جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایبک، ملک ارسلان کے ساتھ کورٹ سے واپس آ چکا تھا۔ دونوں ایک ساتھ ایک ہی گاڑی میں گئے تھے۔ واپسی پہ ملک ارسلان نے اسے کھانے کے لیے روک لیا۔ کھانا تیار تھا صرف ٹیبل پہ لگانا تھا۔ نینال نے ملک ارسلان کی واپسی کا سنتے ہی کھانا اپنی نگرانی میں لگوایا۔ وہ کھانے کی ڈشز اور ڈائننگ ہال کا جائزہ لے رہی تھی جب ملک ارسلان ، ایبک کے ساتھ ڈائننگ ہال میں پہنچے۔

اب یہ اتفاق کی بات تھی کہ نینال کا آج پہلی بار ملک ایبک کے ساتھ سامنا ہوا تھا۔ حالانکہ اسے "ملک محل" میں آئے کافی دن ہو چلے تھے۔ ایک اجنبی صورت ملک ارسلان کے گھر ایبک نے پہلی بار دیکھی تھی لہٰذا اس نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"یہ نینال ہے اور ہم اسے ـــ" وہ نینال کی موجودگی کے خیال سے بہت آہستہ آواز میں بات کر رہے تھے۔ ایبک نے کھوجتی نگاہوں سے نینال کا جائزہ لیا تو اس نے ایبک کو سلام کیا۔ پڑھا لکھا مہذب لہجہ تھا' کپڑے بھی اس نے طریقے سلیقے کے پہن رکھے تھے' اس لیے اس نے نینال کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ اس کے دیکھنے سے اپنے آپ میں بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ لیکن اس کے بعد ایبک نے دوبارہ نینال کی طرف نہیں دیکھا۔ بلکہ ارسلان کے ساتھ باتوں میں مگن ہو گیا۔ نینال وہاں سے جا چکی تھی۔ ملک ارسلان اب کھل کر نینال کے بارے میں بتا رہے تھے۔

"بس اس بے چاری کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ عنیزہ بہت نازک اور خدا ترس دل کی مالک ہے۔ جھٹ اسے اپنے ساتھ لے آئی۔ ہمیں اس کی موجودگی سے کوئی تکلیف یا پریشانی نہیں ہے۔ سارا دن حویلی میں لگی رہتی ہے۔ عنیزہ اس کے بارے میں تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔ مجھے کہہ رہی تھی کہ ایبک سے کہوں گی انڈسٹریل ہوم اور اسکول بنوانے کے بعد اسے بھی وہیں رکھ لو۔ پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ بہت کام آئے گی محنتی بھی ہے۔" ملک ارسلان نے نینال کے ہوٹل میں ٹکراؤ اور اس کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ گول کر دیا تھا۔

پر ایبک کو رہ رہ کر ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔

نینال کی پوری شخصیت سے کسی بھی قسم کی بے چارگی اور درماندگی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا جس کا تذکرہ ابھی ابھی ارسلان چچا نے کیا تھا۔ اس نے چچا کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے ان کی بات پورے غور سے سنی اور کسی بھی قسم کے تبصرے سے گریز کیا۔

"تمہاری چچی تو شاپنگ کر کے ابھی تک نہیں لوٹی ہیں۔" ارسلان کلائی میں پہنی گھڑی پہ ٹائم دیکھ رہے تھے۔

"چچا میں رات کو آؤں گا۔"

"ہاں تب میری بیٹی سے بھی مل لینا" ملک ارسلان کے لہجے کا یہ رنگ، بہت انوکھا سا تھا۔ وہ یک ٹک انہیں دیکھنے لگا۔

"عنیزہ بہت خوش ہے۔ جب سے میں اسے بیاہ کر یہاں لایا ہوں تب سے اب اسے پہلی بار اتنا خوش اور مسرور دیکھا ہے۔ وہ زیان کو دیکھ دیکھ کر جی رہی ہے۔"

عنیزہ کا نام لیتے ہی ملک ارسلان کے لہجے میں محبت اتر آئی تھی۔ ابھی ابھی ایبک نے بھی یہ مظاہرہ دیکھا تھا۔ ملک ارسلان چچا اور عنیزہ چچی کی محبت کی کہانی سے وہ بہت اچھی طرح واقف تھا۔ دل سے وہ ان کی عزت کرتا تھا کیونکہ ایبک ان کی اعلا ظرفی اور وسعت قلبی کا شاہد تھا۔ عنیزہ چچی کی بیٹی کا علم اسے کچھ برس پہلے ہوا تھا جب عنیزہ چچی پہ ڈپریشن کا شدید حملہ ہوا تھا انہوں نے کمرے میں رکھی گئی ہر چیز توڑ دی تھی اور خود کو بھی زخمی کر لیا تھا تب ہسپتال میں ایبک نے ارسلان چچا کو طویل کوریڈور میں ٹہلتے اور اپنے آنسو چھپاتے دیکھا تھا۔ اس نے جرات کر کے چچا سے پوچھا تھا۔ تب انہوں نے اسے سب بتا دیا کہ عنیزہ چچی کی اس شدید بگڑتی حالت کا سبب کیا ہے۔ ایبک کے بس میں ہوتا تو ان کی بیٹی کہیں سے لا کر ان کے سامنے کھڑی کر دیتا۔ کیونکہ ارسلان چچا اور عنیزہ چچی اسے ماورائی اساطیری داستانوں کے کردار لگتے۔ جو زندہ ہو کر ملک محل میں آگئے تھے۔

"چچا جان یہ تو اچھی بات ہے اللہ کرے چچی اب ایسے ہی خوش رہیں" ایبک نے دل کی گہرائی سے دعائیہ جملہ بولا تھا جس پہ ارسلان کا آمین کہنا بے ساختہ تھا۔

تمہاری چچی کل سے اتنی خوش ہیں کہ مجھے بھی نظر انداز کر دیا ہے۔" ملک ارسلان نے ہنستے ہوئے لطیف سا شکوہ کیا۔

"چچی ایسی نہیں ہیں کہ آپ کو نظر انداز کریں۔" اس نے پورے وثوق سے کہا۔

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو میں تو بس ایسے ہی آج ذرا اسے تنگ کرنے کا موڈ بنا رہا تھا" ارسلان چچا کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ اس بار ایبک کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

☼ ☼ ☼

زیان اور عنیزہ کافی لیٹ واپس آئیں۔ مغرب تو ہو ہی چکی تھی۔ اس تاخیر کا سبب شہر سے گاؤں کا طویل فاصلہ تھا۔ پھر جیولر کے پاس انہیں کافی ٹائم لگ گیا تھا۔ عنیزہ نے زیان کے لیے گولڈ کی اور دیگر جیولری خریدی تھی ڈائمنڈ کے ایئر رنگز اور خوب صورت سی رنگ تو انہوں نے جیولر کی شاپ پہ ہی زیان کو زبردستی پہنائی تھی۔

زیان اس آنے جانے میں آج بہت تھک گئی تھی۔ اس کی تھکن دیکھتے ہوئے عنیزہ نے نوکرانی کو کوئی اشارہ کیا تو کچھ دیر بعد وہ ایک ٹب میں نیم گرم پانی لیے چلی آئی۔ پانی میں گلاب کے پھولوں کی پتیاں تیر رہی تھیں۔ عنیزہ کے حکم پہ اس نے پانی والا ٹب صوفے پہ بیٹھی زیان کے پاؤں کے پاس رکھ کر اس کے سوچنے سمجھنے سے بیشتر ہی اس کے پاؤں نرمی سے اٹھا کر ٹب میں ڈال دیے۔ وہ احتجاج کرنا چاہتی تھی پر نہ جانے کیوں عنیزہ کا چہرہ دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ نوکرانی نمک ملے پانی سے اس کے پاؤں دھو رہی تھی پانی میں گلاب کی پتیوں اور نمک کے ساتھ اور جانے کیا کیا کچھ ڈالا گیا تھا۔ کیونکہ پانی میں سے بڑی اچھی خوشبو آ رہی

تھی۔ نوکرانی نے اس کے پاؤں دھو کر صاف کر دیے تھے۔ اب وہ تولیے سے اس کے پاؤں خشک کر رہی تھی۔ زیان کو بے پناہ سکون کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ آنکھیں موندے صوفے پہ نیم دراز تھی جب نہناں بہت سے شاپرز لیے وہاں آگئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ملک ارسلان بھی تھے۔ زیان آنکھیں کھولے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"آ گئے آپ لوگ واپس اور میری بیٹی کیسی ہے؟ لگتا ہے تھک گئی ہو" وہ بیک وقت عنیزہ اور زیان سے مخاطب ہوئے۔ ان کے منہ سے "میری بیٹی" کا لفظ زیان کو بہت عجیب سا لگا کیونکہ ابو نے بھی اسے میری بیٹی کہہ کر بلانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ تو اس کی پروا ہی نہیں کرتے تھے۔

"جی بس تھوڑی سی تھکن ہے" نظریں جھکا کر اس نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

"ذرا دکھایئے تو کیا کیا شاپنگ کی ہے آپ نے" اس بار بھی ان کا مخاطب سوفی صد زیان ہی تھی۔ ناچار وہ نہناں کے لائے گئے شاپر اٹھا کر ان کے پاس بیٹھ کر خریدی گئی چیزیں دکھانے لگی۔ انہوں نے ایک ایک چیز شوق اور دلچسپی سے دیکھی اور تعریف کی۔ عنیزہ ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہی تھیں۔ ملک ارسلان زیان کو حد درجہ توجہ دے رہے تھے۔

نہناں اس رخ پہ کھڑی تھی کہ زیان کا پورا چہرا اور ہاتھ پاؤں اس کے سامنے تھے۔ وہ بڑی توجہ سے ارسلان کو مختلف چیزیں دکھانے میں مصروف تھی۔ برانڈڈ کپڑوں جوتوں پرفیومز' جیولری اور دیگر اشیاء کا ایک چھوٹا سا ڈھیر نہناں کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ زیان کے گلابی آمیزش لیے سفید بے داغ پاؤں اس کے دل کو عجیب بے عنوان سی پریشانی اور جھنجلاہٹ میں جلا کر رہے تھے۔ "یہ سوٹ کل پہننا" ملک ارسلان نے پنک اور وائیٹ کلمبنیشن والا فراک نکال کر الگ سے رکھا۔ نہناں کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں مسلا۔

احمد سیال بھی تو اسے ایسی ہی فرمائش کرتے تھے۔

دونوں مل کر شاپنگ کرتے وہ رنم کو ہر چیز کے بارے میں اپنی رائے دیتے اور اپنی پسند سے اس کے لیے خریداری کرتے۔ اور جب ان دونوں کو مل کر کسی جگہ جانا ہوتا تو وہ خود اس کے لیے پہنے جانے والے کپڑے سلیکٹ کرتے۔ پورے دن میں پہلی مرتبہ زیان کے ہونٹوں پہ بے ریا مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا جیسی کہہ رہی ہو ہاں میں کل یہی کپڑے پہنوں گی۔ رنم سے یہ منظر مزید برداشت نہیں ہو رہا تھا اس لیے وہاں سے ہٹ گئی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے زیان کو دیکھ دیکھ کر وہ احساس کمتری کا شکار ہو رہی ہے۔

کھانا کھا کر زیان اوپری منزل پہ اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ لائٹ جلا کر اس نے سب سے پہلے پردے سرکائے تو نگاہ دوسرے کمرے کی طرف اٹھ گئی۔ برآمدے کی سب لائٹس آن تھیں پر سامنے کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سونے سے پہلے اس نے ٹھنڈے پانی سے شاور لیا تو طبیعت کی سب تھکن اور بوجھل پن دم توڑ گیا۔ تکیہ سر تلے رکھے وہ سونے کے لیے دراز ہوئی تو بہت جلد نیند کی وادیوں میں اتری۔

☼ ☼ ☼

ایبک سونے کے لیے اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا۔ نیچے وہ ملک جہانگیر اور افشاں بیگم کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ملک جہانگیر نے پھر سے اس کی شادی کا موضوع چھیڑ رکھا تھا۔ اس بار افشاں بیگم بھی ان کی ہمنوا تھیں۔

"بابا جان انڈسٹریل ہوم کی تعمیر شروع ہے۔ اسکول کا سنگ بنیاد بھی رکھا جا چکا ہے۔ میں کچھ ماہ بہت مصروف رہوں گا۔" اس نے جیسے اپنی مجبوری بتائی۔

"بیٹا شادی اور دیگر کام سب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔" جہانگیر نے اس کی بات کو چنداں! اہمیت نہ دی۔ بھلا ہوا افشاں بیگم کا جو انہوں نے زیان کی آمد کا قصہ چھیڑ دیا تب کہیں جا کر ان کی توجہ ایبک کی شادی سے ہٹی۔ وہ خیر منا تا ان کے پاس سے اٹھ آیا۔

کمرے کی لائٹس آن تھیں۔ ملازم مغرب سے پہلے اس کے بیڈ روم اور اوپری حصے کی تمام بتیاں جلا دیتے تھے۔ اس نے شرٹ اتار کر بیڈ پہ رکھی اور واش روم میں آ گیا۔ نہانے کے بعد وہ نائٹ شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس باہر آیا۔ شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر گیلے بالوں میں حسب معمول برش پھیرا۔

ملک جہانگیر کی باتوں کو از سر نو سوچتے ہوئے اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔ جہاں دیوار کے ساتھ پھولوں کے گملے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے اور پاس ہی ایک کرسی پڑی تھی وہ اکثر یہاں آ کر بیٹھتا تھا۔ وہ جیسے ہی کرسی پہ دراز ہوا نگاہ اچانک ارسلان چچا کے گھر کی طرف اٹھی۔ اس کی نگاہوں کا مرکز اوپری منزل پہ واقع عین اس کے کمرے کے سامنے والا کمرا تھا۔

اندر زیرو پاور کے بلب کے ساتھ بیڈ لیمپ بھی آن تھا۔ سب پردے سمٹے ہوئے تھے اس لیے منظر واضح تھا۔ سامنے بیڈ پہ اوندھے منہ ایک نسوانی وجود محو خواب تھا کیونکہ کھلے لمبے بال اس سوئے ہوئے وجود کے اردگرد بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی معلومات کے مطابق اوپری حصہ خالی تھا۔ خالی ان معنوں میں کہ سامان تو سب کمروں میں تھا پر کوئی رہتا نہیں تھا۔

عنیزہ چچی اور ارسلان چچا نیچے رہائش پذیر تھے۔ نوکروں کے لیے الگ رہائشی حصہ مخصوص تھا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ حویلی میں عنیزہ چچی کی بیٹی بھی تو آئی ہے۔ سوفی صد وہ یہی ہوگی۔ ملک ایبک نے اندازہ لگایا۔ اسے دوسری بار دیکھنا نامناسب محسوس ہوا اس لیے بیڈ روم میں آ کر لیٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

زیان صبح خاصی دیر بعد بے دار ہوئی۔ ہلکا پھلکا ناشتا کرنے کے بعد فارغ ہوئی تو نوکرانی اطلاع کرنے آئی کہ آپ کے کپڑے استری ہو چکے ہیں آپ تبدیل کر لیں۔ یہی وہ سوٹ تھا جو ملک ارسلان نے الگ نکال کر رکھا تھا۔ زیان تبدیل کر کے آئی تو وہی نوکرانی ہاتھوں میں موتیے کے گجرے لیے کھڑی تھی۔ زیان کی دونوں کلائیوں میں اس نے گجرے پہنائے۔ "چھوٹی بی بی آپ بہت سوہنی ہیں" اس نے زیان کو بغور دیکھتے ہوئے تعریف کی تو وہ جھینپ سی گئی۔ نوکرانی نے اسی بڑی دلچسپی سے دیکھا۔

زیان ٹی وی لاؤنج میں آئی تو عنیزہ بھی وہیں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے اس کے لیے اپنے پاس جگہ بنائی تو وہ ادھر ہی بیٹھ گئی۔ ٹی وی پہ مشہور زمانہ ایک ٹاک شو آن ایئر تھا۔ زیان کی نظریں بظاہر ٹی وی سکرین پہ اور ذہن کسی اور شے کی طرف مرتکز تھا۔ عنیزہ ٹی وی دیکھنے کے ساتھ ساتھ اسے ادھر ادھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں کر رہی تھیں جن کا جواب وہ سر ہلا کر ہوں ہاں میں دے رہی تھی۔

تب ہی ملک ایبک ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوا۔ خوشبوؤں میں بسا ٹک سک سا تیار۔ اسے دیکھ کر جیسے زندگی اور تازگی کا احساس فضا پہ حاوی ہو رہا تھا۔

"السلام علیکم" اس کی آواز سے گرمجوشی اور اپنائیت جھلک رہی تھی۔ زیان نے سلام کا جواب بہت مدہم آواز میں دیا۔ وہ فوراً" پہچان گئی تھی۔ رات اپنے سامنے والے کمرے میں اس نے جس نوجوان کو دیکھا تھا وہ یہی تھا۔

"کب آئے ہو بیٹا تم اور سب ٹھیک ہے ناں؟" عنیزہ نے کھڑے ہو کر جس محبت سے اس کا ماتھا چوم کر حال احوال دریافت کیا تھا وہ زیان کو ایبک کی اہمیت جتانے کے لیے کافی تھا۔

"چچی جان میں کل شام کو آپ کی طرف آیا تھا سوچا مہمانوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی پر آپ لوگ نہیں ملے میں نے سوچا ابھی جا کر خیریت معلوم کر آؤں۔" اس کا اشارہ زیان کی طرف تھا۔ بات کرتے کرتے ملک ایبک نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ زیان کے چہرے کے تاثرات میں کسی بھی قسم کی گرمجوشی اور مروت نہیں تھی۔

"ایبک یہ میری بیٹی زیان ہے اور زیان یہ افشاں بھابھی اور جہانگیر بھائی کا بڑا بیٹا ایبک ہے۔ وہی جہانگیر

بھائی جن کے گھر جانے کا میں نے تمہیں بولا تھا۔" عنیزہ نے تعارف کروایا۔ زیان عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ ایبک نے میزبانی کے اصول نبھاتے ہوئے خود سے بات کا آغاز کیا۔
زیان آپ کی کیا مصروفیات ہیں آج کل کیا کر رہی ہیں؟"

اس نے جھٹ سے جواب دیا "میں کچھ نہیں کرتی۔" عنیزہ شرمندہ سی ہو گئیں۔ زیان کا انداز لٹھ مارنے والا تھا۔ جیسے بول کر احسان کر رہی ہو۔

"ایبک' زیان نے حال ہی میں گریجویشن کیا ہے۔" عنیزہ نے اس کے رویے کی تلخی کو زائل کرنے کے لیے خود جواب دیا۔ "آپ نے کس سبجیکٹ کے ساتھ گریجوشن کیا ہے زیان؟" ایبک کی طرف سے اگلا سوال آیا۔

"میں نے ماس کمیونیکیشن میں گریجوشن کیا ہے۔"

"آگے کیا ارادے ہیں آپ کے؟" ایبک نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں۔" وہ پہلے کی طرح سرد لہجہ میں بولی تو عنیزہ کو بے انتہا شرمندگی ہوئی۔

"میں ذرا فریدہ کو دیکھ آؤں تمہیں اچھی سی چائے پلواتی ہوں۔" زیان کے رویے کی شرمندگی کی وجہ سے پیدا ہونے والی شرمندگی کے تاثر کو زائل کرنے کے لیے عنیزہ دانستہ طور پہ وہاں سی ہٹنا چاہ رہی تھیں۔

"چچی میں آج دیر سے اٹھا ہوں ابھی کچھ دیر پہلے ناشتا کیا ہے۔ فی الحال گنجائش نہیں ہے۔" ایبک نے سلیقے سے انکار کیا۔

"اچھا میں جوس کا بول کر آتی ہوں زیان نے ناشتے میں صرف انڈا اور توسٹ کھایا ہے۔ اسی بہانے یہ بھی پی لے گی" عنیزہ نے اس کی اگلی بات سنے بغیر قدم آگے بڑھا دیے۔

زیان نے عنیزہ کے جاتے ہی ریموٹ کنٹرول سے چینل تبدیل کر دیا۔ اب صرف ٹی وی کی آواز تھی ایبک اور زیان دونوں خاموش تھے۔ ایبک نے ایک نظر خاموش بیٹھی زیان کی طرف دیکھا۔ پنک فراک اور ٹراؤزر میں ملبوس دوپٹا سر پہ لیے (ایبک کے آنے سے پہلے دوپٹا اس کے شانے پہ سمٹا پڑا تھا۔ ایبک کو دیکھتے ہی اس نے پھیلا کر سر پہ اوڑھا تھا۔) ٹانگ پہ ٹانگ رکھی اپنے خفا خفا سے تاثرات سمیت وہ کافی مغرور نظر آرہی تھی۔ ایبک کے مونچھوں تلے دبے عنابی ہونٹوں پہ عجیب بیساختہ سی مسکراہٹ در آئی تھی۔ زیان مار دھاڑ سے بھرپور ایکشن تھرلر فلم دیکھنے میں پوری طرح مگن تھی۔ جیسے اس کے سوا یہاں اور کوئی ذی نفس موجود ہی نہ ہو۔ ایبک کی موجودگی کا اس نے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔

نیناں' فریدہ کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئی۔ فریدہ اور نیناں کے ہاتھ میں دو ٹرے تھیں۔ جن میں جوس سمیت کھانے پینے کے مختلف لوازمات تھے ان کے پیچھے ہی عنیزہ تھیں۔ کھانے پینے کی سب اشیاء ٹیبل پہ سج گئی تھیں۔ "نیناں آپ کیسی ہیں؟"

وہ گلاس میں جوس ڈال رہی تھی۔ زیان نے حیرت بھری نگاہوں سے اس کی سمت دیکھا وہ عام سی نوکرانی سے کتنے طریقے اور سبھاؤ سے بات کر رہا تھا۔ نیناں کے ساتھ اس نے فریدہ سے بھی حال احوال پوچھا۔ نیناں نے بہت ادب سے جوس کا گلاس ایبک کے سامنے ٹیبل پہ رکھا۔ دوسرا گلاس اس نے زیان کے سامنے رکھا۔ وہ کسی مغرور شہزادی کی طرح ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی تھی جیسے ساری دنیا اس کے قدموں تلے ہو۔ رنم کو جانے کیوں پھر اس پہ شدید غصہ آیا۔ ہر بار زیان سے آمنا سامنا ہونے پہ ایسا محسوس ہوتا جیسے اس نے رنم کی جگہ پہ قبضہ کر لیا ہو۔ ملک ارسلان' عنیزہ بیگم سے لے کر نوکرانیاں تک اس نک چڑھی زیان کو اپنی پلکوں پہ بٹھا رہے تھے جیسے۔ اسے اہمیت دے رہے تھے۔ زیان کو اس قدر اہمیت دینا اسے کھل رہا تھا۔

"ایبک' نیناں پڑھی لکھی اور قابل لڑکی ہے۔ سارا دن حویلی میں چھوٹے موٹے کاموں میں لگی رہتی ہے۔ میں چاہتی ہوں جب تم انڈسٹریل ہوم بنالو تو اس

کو بھی وہاں رکھ لو۔ وہاں کے سب معاملات کو سنبھال لے گی" عنیزہ نے ایبک کی توجہ نیناں کے مسئلے کی طرف دلائی۔

"چچی میں اب گاؤں میں ہی ہوں۔ انڈسٹریل ہوم کی عمارت تکمیل کے مراحل میں ہے۔ مزدوروں اور مستریوں نے جلدی بنانے کے لیے دن رات ایک کر دیا ہے۔ ابھی تھوڑا ٹائم باقی ہے جب سلائی مشین اور دیگر سامان آجائے گا تو میں آپ کو بتاؤں گا اور نیناں کے لیے بھی جگہ دیکھوں گا" اس نے عنیزہ چچی کو امید دلائی۔ وہ نیناں کے مسئلے کی طرف متوجہ تھا اسے خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

"ہاں اسے جو بھی کام دو گے کر لے گی۔" عنیزہ نے اس کی تعریف کی۔

"چچی جان آپ کا حکم سر آنکھوں پہ" وہ مسکرایا۔ زیان ایک بار پھر حیران ہو رہی تھی۔ عنیزہ اور ایبک ایک عام سی نوکرانی کے لیے کتنا فکر مند تھے۔

ایبک نے اپنی طرف رکھا جوس کا گلاس اٹھایا۔ عنیزہ چچی کی مغرور بیٹی ایکشن فلم میں بری طرح ڈوبی ہوئی تھی۔ ایبک کو مزید یہاں بیٹھنا عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ واپسی کے لیے اٹھا۔ زیان نے اسے جاتے ہوئے پیچھے سے دیکھا۔ اس کے چوڑے کندھے اور پشت نمایاں تھی۔ وہ سر جھٹک کر پھر سے ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گی۔

☼ ☼ ☼

زیان' عنیزہ کے ساتھ ملک جہانگیر کی طرف پہلی بار آئی تھی۔ اس نے مہین شیفون کا جالی لگے بازوؤں والا کالا فراک اور ساتھ چوڑی دار پائجامہ زیب تن کر رکھا تھا۔ لمبے بال ربربینڈ میں جکڑے پیچھے کمر پہ پڑے تھے۔ مہین شیفون کا دوپٹا بہت سلیقے سے سر پہ جما تھا۔ ایک کلائی میں پرل کا نازک سا بریسلیٹ تھا۔

افشاں بیگم بہت پیار سے اسے گلے لگا کر ملی تھیں۔ پھر وہ اسے ملک جہانگیر کے پاس ان کے کمرے میں لائیں۔ وہ بیڈ پہ نیم دراز تھے۔ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ڈاکٹرز نے انہیں بیڈ ریسٹ کا مشورہ دیا تھا۔ انہیں دیکھتے ہوئے زیان کو امیر علی یاد آ گئے۔ ملک جہانگیر اور امیر علی میں اسے مشابہت محسوس ہو رہی تھی زندگی کے آخری دو برسوں میں وہ بھی تو ملک جہانگیر کی طرح بیڈ کے ہو کے رہ گئے تھے۔ اس نے دل میں ہمدردی کی لہر اٹھتے محسوس کیا۔ افشاں بیگم نے زیان کا تعارف کروایا۔

ان کی نظر آپریشن کے بعد کافی کمزور اور دھندلائی ہوئی تھی مگر پھر بھی زیان انہیں دیکھنے میں بہت اچھی لگی۔ انہوں نے پاس بلا کر اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ ان کے اس عمل سے زیان کو ایک بار پھر امیر علی یاد آ گئے۔ انہوں نے زیان کو بیڈ کے پاس رکھی گی کرسی پہ اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شروع میں تو وہ گم صم رہی پھر آہستہ آہستہ ان کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ اس عمل سے عنیزہ خوشی محسوس کر رہی تھیں۔

وہ افشاں بیگم کے ساتھ باتوں میں مصروف تھیں۔ بیچ بیچ میں وہ دونوں زیان کو بھی مخاطب کرتی۔ جس کی توجہ ملک جہانگیر کی طرف تھی۔ افشاں بیگم جب بھی زیان کی طرف دیکھتیں ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آجاتی۔ ایبک کو ان کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ بھی وہیں آ گیا۔ اس نے سب کو سلام کیا اور پھر بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کی۔ زیان کے ساتھ والی ایک اور کرسی خالی پڑی تھی۔ وہ اسی پہ بیٹھ گیا۔ وہاں بیٹھنے میں اس کی کسی خاص سوچ یا نیت کا دخل نہیں تھا۔

وہ قیمتی مردانہ پرفیوم استعمال کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی پسندیدہ مہک نے زیان کی حس شامہ کو متوجہ کر لیا۔ وہ اب اس کے پاس ہی تو بیٹھا تھا۔ بابا جان کے ساتھ بات کرتے ہوئے ملک ایبک نے ایک نگاہ زیان پہ ڈالی آج اس نے کالے رنگ کی فراک زیب تن کی ہوئی تھی نازک سے پاؤں بھی کالی سینڈل میں مقید تھے۔ وہ خوامخواہ ہی توجہ اپنی طرف مبذول کروا رہی تھی۔ چہرے پہ خفگی والے تاثرات آج کچھ کم تھے۔ ایبک کو جانے کیوں ہنسی آ گئی۔ اس کی موہوم سی مسکراہٹ

افشاں بیگم کی نگاہوں سے مخفی نہ رہپائی۔ ان دونوں کو اکٹھے بیٹھے دیکھ کر ان کے دل میں خود ہی ایک خیال الہام بن کر اترا۔ دونوں ایسے بہت اچھے لگ رہے تھے۔

وہ ملک جہانگیر کی کسی بات کا جواب دیتے ہوئے دوپٹا ٹھیک کر رہی تھی اور ایک عنیزہ کے ساتھ بات کرتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ دونوں اپنی جگہ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک مکمل منظر کا حصہ لگ رہے تھے۔

"اور اگر یہ دونوں ہمیشہ ایک ساتھ رہیں تو اور بھی اچھے لگیں۔" افشاں بیگم کی سوچ نے ذرا مزید آگے کا رخ کیا تو ان کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آگئی وہ مسکراہٹ جس میں ہزار معانی پنہاں تھے۔

☼ ☼ ☼
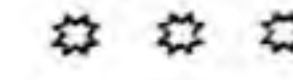
ملک ارسلان دو دن سے یونیورسٹی نہیں آیا تھا۔ عنیزہ ان دو دنوں میں بولائی بولائی پھرتی رہی۔ پوری دنیا اسے ویران اور اداس نظر آرہی تھی۔ پہلے تو اس کے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ ارسلان دو دن کے بعد یونیورسٹی آیا تو وہ اسے لڑ جھگڑ کر ناراض ہو گئی۔ حالانکہ وہ صفائی دیتا رہا پھر وہ نہ جانے کیوں ناراض ہو گئی تھی۔ ارسلان نے دو دن چھٹی کی تھی اس نے پورے ایک ہفتے کی چھٹی کی۔

عنیزہ کو پورے ہفتے شدید بخار رہا۔ جب وہ دوبارہ یونیورسٹی گئی تب بھی بخار سے ہونے والی کمزوری باقی تھی۔ ارسلان کو اس کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ بے تابی سے ڈھونڈتا ہوا لائبریری میں آیا۔ سامنے وہ کتاب رکھے پڑھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ ارسلان اس کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھا تو عنیزہ نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اسے جھٹکا سا لگا کیونکہ ارسلان کی حالت سے لگ رہا تھا وہ بہت پریشان ہے۔

ارسلان نے اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کشاں کشاں اس کے پیچھے چلی آئی۔ پارکنگ ایریا سے ارسلان نے اپنی نئی ٹویوٹا کرولا نکالی اور اگلا دروازہ کھولا۔ عنیزہ کوئی سوال کیے بغیر بیٹھ گئی۔ اس نے نہیں پوچھا کہ تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو نہ ارسلان نے بتایا۔

چند منٹ بعد ارسلان کے ساتھ وہ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھی تھی۔ اس طرح وہ پہلی بار اس کے ساتھ گھر سے بلکہ یونیورسٹی سے باہر آئی تھی۔

"عنیزہ میں پچھلے پورے ہفتے سے بہت پریشان ہوں۔ دیکھ لو میں نے شیو تک نہیں کی۔" ثبوت کے طور پہ ارسلان نے اپنی داڑھی کی طرف اشارہ کیا۔

"تم کیوں پریشان رہے؟"

"عنیزہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔" ارسلان نے اچانک روانی سے یہ جملہ بولا تو اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے وہ جیسے گم صم سی ہو گئی جیسے کسی نے جادو سے پتھر کر دیا ہو۔

"تمہیں بری لگی ہے میری بات ؟" کافی دیر وہ خاموش رہی تو ارسلان نے بے تابی سے پوچھا۔

"مجھے پتا تھا تمہیں یہ بات بری لگے گی۔ لیکن میں اپنے دل سے پورا ہفتہ لڑتا رہا ہوں نہیں رہ پایا تو تم سے آج کہہ دیا۔" وہ اس کی مسلسل خاموشی سے دل گرفتہ ہو رہا تھا۔

"مجھے تمہاری بات بری نہیں لگی ہے۔" بالآخر عنیزہ نے خاموشی کے پردے کو چاک کیا۔

"تو پھر اچھی لگی ہے؟" وہ فرط شوق سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر جیسے اپنے سوال کا جواب ڈھونڈ رہا تھا۔ عنیزہ نے نظر چرالی۔ ملک ارسلان کو اپنے سوال کا جواب مل چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

عنیزہ، ملک ارسلان کے بازو پہ سر رکھے لیٹی اداس تھی۔ وہ انہیں مسلسل تسلیاں دے رہے تھے۔

"دیکھو تمہارے اور ذیان کے درمیان چند برسوں کا فاصلہ نہیں ہے بلکہ یہ فاصلہ صدیوں کا ہے۔ ہمیں ان وجوہات کا سراغ لگانا ہے جس کی وجہ سے اس کے دل میں دوری آئی ہے۔ اس کے شکوے، شکایت اس کا نامناسب سرد رویہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ لیکن وہ

تمہاری مجبوری کو اس وقت نہیں سمجھ سکتی کیونکہ وہ بچپن سے جو دیکھتی سنتی آئی ہے اس کا اعتبار ان باتوں پہ زیادہ ہے۔ تمہیں صبر اور محبت سے کام لینا ہو گا۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ محبت سے پتھر پگھل جاتے ہیں، جانور مطیع ہو جاتے ہیں وہ تو پھر بھی انسان ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ سے ڈسکس کر کے میرا دل و دماغ پر سکون ہو گئے ہیں۔" وہ مسکرا دیے۔

"چلو اب سب پریشانیاں ذہن سے جھٹک کر سو جاؤ۔" انہوں نے عنیزہ کا سر نرمی سے تکیے پہ رکھ کر چادر ان پہ ڈالی۔

ملک ارسلان ان کے ساتھ باتیں کرتے کرتے کب کے سو چکے تھے۔ عنیزہ کو نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ ماضی کا سفر کرتے کرتے بہت پیچھے چلی گئی تھیں۔ اس وقت وہ صرف عنیزہ قاسم تھی۔ الہڑ، کم سن اور زندگی سے بھرپور عنیزہ قاسم۔ جس پہ ملک ارسلان بری طرح دل ہار بیٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

عنیزہ کتابیں سرسبز گھاس پہ رکھے، ملک ارسلان کی باتیں غور سے سن رہی تھی۔

"تمہارے ابو سے بہت جلد اب ملنا پڑے گا۔" ارسلان نے شرارت سے اسے دیکھا۔

"کیوں؟ میرے ابو سے کیا کام ہے؟" اس نے موٹی موٹی آنکھیں پوری کھول کر اس کی طرف دیکھا تو وہ جیسے ان نگاہوں میں ڈوبنے لگا۔ پتا نہیں اسے کب، کیسے کس وقت اور کہاں عنیزہ سے محبت ہوئی تھی۔ لیکن اسے یہ خبر تھی وہ عنیزہ کے بغیر جی نہیں سکتا۔

اسے شرعی طور پہ ہمیشہ کے لیے اپنا بنانے اور اس کے جملہ حقوق کو محفوظ کرنے کے لیے وہ ملک افتخار سے بات کرنے کی سوچ رہا تھا۔ اسے پوری امید تھی معاشرتی تفاوت کے باوجود بھی ملک افتخار مان جائیں گے کیونکہ وہ بہت اچھی تھی، خاندانی تھی اس کے ابو خوددار اور عزت نفس کی دولت سے مالا مال تھے۔ اس نے ملک افتخار کو راضی کر لینا تھا ورنہ ملک جہانگیر سے سفارش کروانی تھی۔

☼ ☼ ☼

شام ڈھل رہی تھی۔ ذیان سو کر اٹھنے کے بعد عجیب سی کسل مندی محسوس کر رہی تھی۔ موسم گرد آلود اور حبس سا بھرا تھا۔ وہ ٹھنڈے پانی سے جی بھر کے نہائی تو سستی قدرے کم ہو گئی۔ وہ کپڑے بدل کر نیچے آئی تو عنیزہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیں۔ نیناں دوسری نوکرانیوں کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ ذیان ایک ثانیے کے لیے اس کے پاس رکی۔

"مما کہاں ہیں؟" اس نے استفسار کیا۔
"وہ اپنے کمرے میں ہیں۔ شاید سو رہی ہیں۔" اس کے بجائے فریدہ نے جواب دیا تو زیان نے غائب دماغی سے سر ہلایا۔ نیناں نے ایک نظر اس کے دھلے نکھرے گلابی چہرے کو دیکھا۔ جس کے گرد کھلے گیلے بالوں کا ہالہ تھا۔ سفید موی راج ہنس جیسے پاؤں کالے رنگ کی نازک سی جوتی میں مقید تھے آج۔ ناپسندیدگی کا تیز و تند ریلا نیناں یعنی رنم کو شرابور کر گیا۔ کیونکہ سب نوکرانیوں کی نگاہوں میں رشک و ستائش کی نمایاں جھلک اس نے محسوس کی تھی۔ "میں جہانگیر انکل کی طرف جا رہی ہوں۔ مما سو کر اٹھیں تو بتا دینا۔" زیان نے انہیں مطلع کیا۔
"چھوٹی بی بی کتنی سوہنی ہیں۔" اس کے جانے کے بعد ایک نوکرانی نے تبصرہ کیا۔
"خوب صورت تو ہیں ساتھ مغرور بھی ہیں۔" دوسری نے گرہ لگائی تو فریدہ بھی پیچھے نہیں رہی ادھر ادھر دیکھ کر آواز دبا کر بولی۔
"چھوٹی بی بی بہت اتھری ہیں توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے۔" اس نے باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگائے۔
"جو بھی ہے مجھے تو چھوٹی بی بی بہت اچھی لگتی ہیں۔ نہ غصہ کرتی ہیں نہ کچھ کہتی ہیں نہ کسی کام کا بولتی ہیں۔" پہلی والی بولی۔
"ہاں ہیں تو بہت اچھی۔ کتنی چپ چپ رہتی ہیں۔" دوسری نے بھی فوراً" تائید کی۔
"مجھے تو نہیں اچھی لگتیں۔" رنم نے دلی تاثرات کے اظہار میں کسی بخل سے کام نہ لیا۔ تینوں اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ گڑبڑا گئی۔
"میرا مطلب ہے مجھے زیان بی بی کا غرور اچھا نہیں لگتا" اس نے عقل سے کام لیا تھا۔ اگر عنیزہ بیگم سے کوئی شکایت کر دیتا تو انہیں بہت برا لگتا تھا۔

☼ ☼ ☼

زیان اونچے ستونوں والے برآمدے کے پاس کھڑی تھی۔ جس کے گرد آتشی گلابی پھولوں والی نازک سی بیل لپٹی ہوئی تھی۔ وہ اس طرح اکیلی پہلی بار آئی تھی، اس سے پہلے ایک بار عنیزہ کے ساتھ یہاں آئی تھی اب جہانگیر انکل سے ملنے آئی تھی تو خود سے اندر کا رخ کرتے ہوئے جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ حویلی کا جائزہ لینے میں مگن تھی جب ایک نوکرانی کی نگاہ اس پہ پڑی وہ بھاگ کر اس کی طرف آئی۔
"بی بی جی آپ ادھر کیوں رک گئی ہیں آئیں اندر میرے ساتھ۔" وہ اس کے یہاں کھڑے ہونے پہ جیسے حیران ہو گئی تھی۔ زیان نے رکے بغیر قدم آگے بڑھائے۔ نوکرانی اسے ملک جہانگیر کے پاس چھوڑ گئی۔
وہ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔ سفید چادر ان کے سینے تک پڑی تھی۔ اے سی فل کولنگ کے ساتھ چلنے کی وجہ سے کمرے میں اچھی خاصی خنکی تھی۔ اس سمے وہ اسے بالکل امیر علی کی مانند محسوس ہوئے۔ انہی کی طرح لاچار اور بے بس۔ یہ صرف اس کی سوچ تھی ورنہ وہ لاچار اور بے بس نہیں تھے یہ تو بیماری نے انہیں کمزور کر دیا تھا۔
زیان نے اپنے دل میں جھانکا اسے بہت حیرت ہوئی کیونکہ جہانگیر انکل کے لیے اس کے دل میں کسی بھی قسم کی نفرت نہیں تھی بلکہ اس کا دل ان کی طرف کھنچتا تب ہی تو اس وقت وہ یہاں تھی۔
"انکل آپ سو رہے ہیں؟" اس نے ان کے پاس جا کر آہستہ آواز میں یہ جملہ کہا تو انہوں نے فوراً" آنکھیں کھول دیں۔
"نہیں میں سو تو نہیں رہا بس آنکھوں میں تھوڑی تکلیف تھی سو ایسے ہی بند کر کے پڑا ہوا ہوں۔" انہوں نے تفصیل بتائی۔
باتیں کرتے کرتے اچانک ان کی حالت بگڑ گئی۔ سینے سے خرخراہٹ سی ملتی جلتی آوازیں آئی۔ انہوں نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا اور ان کا سر تکیے پہ ڈھلک گیا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

جیسے کو تیسا

تمثیلہ زاہد

ایک بڑا سا گھونٹ کافی کا لیتے ہی حلق کڑواہٹ سے بھر گیا۔ برائے نام دودھ اور چینی نے کافی کے ذائقے کو کڑوا اور بدمزا کر دیا تھا۔ منہ میں بھرا گھونٹ بہ مشکل میں نے اندر اتارا تھا۔
"کیسی لگی۔" میری نند نے انتہائی جوش و خروش سے پوچھا اس کی نظریں بدستور میرے اور پھر کافی کے کپ پر مرکوز تھی۔
"واہ۔۔۔۔ زبردست۔" میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے اسے سراہا۔ دل تو چاہا کہہ دوں کہ "بی بی! اب خدا کے لیے رحم کرو اس معدے پر جس کو تم نے پچھلے دو ماہ سے تجربوں کی زد میں خراب کر رکھا تھا۔" بلا کی خوشی میری نند کے چہرے پر نظر آ رہی تھی اور میرا حلق تک کڑوا تھا۔ وہ اپنی دھن میں مگن میرے دلی تاثرات سے بے خبر اپنے ہاتھوں میں تھامی ایک لمبی چوڑی لسٹ پر نظریں گاڑے بیٹھی تھی۔ اپنے بالوں میں پھنسا بال پین نکال کر اس لمبی چوڑی لسٹ میں سے کافی کے نام پر مارک لگایا جا چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہماری نند نے ایک اور ڈش پر اپنی فتح کا جھنڈا گاڑ دیا تھا۔
"اگلی کس ڈش کی شامت آنے والی ہے۔" میرے میاں عرفان شرارت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔
"کل سوچ رہی ہوں کھیر بناؤں سسرال میں پہلی ڈش تو یہی بنائی ہو گی نا۔۔۔۔ ارے ہاں یاد آیا بھابھی! آپ کو یاد ہے آپ نے جب پہلی بار کھیر بنائی تھی چینی کی جگہ نمک۔۔۔۔" حمیرا کی بلند ہوتی ہنسی پھانس کی طرح سینے میں چبھ سی گئی۔ اس کے تضحیک بھرے انداز نے مجھے شرمندہ کر ڈالا تھا۔
وہ میرے چہرے اور چھلکتی آنکھوں سے بے خبر بولے جا رہی تھی۔ میں وہاں مزید رکے بغیر کچن میں آ گئی جہاں کی بے ترتیبی میری منتظر تھی۔ کچن کا حلیہ درست کرتے میرے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے اور دماغ ماضی کی اسکرین پر الجھا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

عرفان اور حمیرا دو ہی بہن بھائی تھے۔ عرفان کے والد کا انتقال ہارٹ اٹیک سے ہو چکا تھا وہ میڈیکل اسٹور چلاتے تھے۔ ان کے بعد یہ ذمہ داری عرفان نے اٹھالی۔ حمیرا عرفان سے پانچ برس چھوٹی اور گھر کی لاڈلی تھی۔ شادی کے ایک ماہ بعد جب میں نے پہلی بار کھیر بنائی تو کچن کی ہر چیز سے نابلد تھی۔ کھانے پکانے میں طاق نہ ہونے کے باعث کھانوں کی تراکیب سے بھی ناواقف تھی۔ پہلی بار بنائی گئی کھیر میں غلطی سے چینی کی جگہ نمک نے کھیر کو بدذائقہ بنا ڈالا تھا۔
ساس نے اس غلطی کو نظر انداز کر ڈالا تھا لیکن نند صاحبہ اپنی فطرت سے مجبور مجھے مذاق کا نشانہ بناتی رہی۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے میری نند مجھے نیچا دکھانے کے لیے ہر لمحہ مذاق کا نشانہ بنائے رکھتی

ہے۔ میں کچھ بھی بنالوں وہ اس میں کوئی نہ کوئی خامی تلاش کرڈالتی تھی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی گھنٹوں روتی رہتی اور میرے شوہر میری دلجوئی کرتے رہتے۔

"چھوڑو اب یہ رونا دھونا بند بھی کرو۔ اس کی باتوں کو دل پر مت لیا کرو۔ اپنی خامیوں کو درست کرنے کی کوشش کرو۔"

"عرفان! میں کتنی بھی کوشش کرلوں وہ میری پکائی ہرچیز میں کوئی نہ کوئی کمی ضرور ڈھونڈ نکالتی ہے پھر سب کے سامنے میری انسلٹ کرنا جیسے اس پر فرض ہے۔ اب دیکھو آج کتنی مزے دار بریانی بنائی تھی میں نے 'بریانی تو چٹ پٹی ہی اچھی لگتی ہے۔ اب محترمہ زیادہ مرچ مسالا پسند نہیں کرتیں تو اس میں میرا کیا قصور مستقل سارا وقت شور مچاتی رہی کہ بریانی تو کھانے کے لائق ہی نہیں اس میں مرچیں بہت زیادہ ہیں۔" میں نے بلند آواز میں روتے ہوئے کہا۔

بریانی کا نوالہ منہ میں لیتے ہی حمیرا کے چہرے کے بگڑتے تاثرات اور اس پر تضحیک آمیز جملوں نے میرا خون کھولا ڈالا تھا۔ اس کا اس قدر شور مچانا مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں کھانا چھوڑ کر کمرے میں آبیٹھی تھی۔ شدید دکھ ہونے کے باوجود میں حمیرا سے کچھ نہ کہتی۔ میری جگہ ساس بول دیتی تھیں۔

"بیٹا رزق میں عیب نکالنا اللہ کو پسند نہیں۔ شکر الحمدللہ کرکے کھایا کرو کھانے میں برکت ہوتی ہے یہ تمہاری بہت بری عادت ہے کھانے میں عیب تلاش نہ کیا کرو بیٹا" وہ رسان لہجے میں بیٹی کو سمجھانے کی کوشش کرتیں۔

لیکن نند صاحبہ کے کانوں میں جوں نہ رینگتی۔ وہ وہی کرتی جو اس کا دل کرتا تھا بھاوج کو بے نقط سنانا جیسے اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اس کی عادت سے سب ہی واقف تھے تو سب کی طرح میں نے بھی نند کی راگنی کو برداشت کرکے سیڑھی پر قدم رکھ کر اپنی منزل تک پہنچنے کا فیصلہ کیا۔

بڑے بوڑھے کہتے ہیں وقت سب سے بڑا استاد ہے۔ وقت دھیرے دھیرے گزر تا گیا۔ بھلا ہو ٹی وی کے کوکنگ شوز کا جس کی بدولت میں اناڑی سے کھلاڑی بن گئی۔ میرے اندر کچھ کر دکھانے کی لگن نے مجھے بالآخر سرخرو کرہی دیا۔ میں شادی کے تین سالوں میں ہر کھانے میں تاک ہو چکی تھی کچھ وقت نے مجھے نند کی باتوں سے لاپروا بنا ڈالا تھا' کچھ میرے بیٹے دانش نے مجھے مصروف کرڈالا تھا۔

ان تین سالوں میں حمیرا کالج سے یونیورسٹی کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ حمیرا کے رویے میں کافی لچک آ گئی تھی اور کیوں نہ آتی۔ رشتے والی خالہ نے حمیرا کے رشتے کی بات چلائی اور "آنا" فانا" منگنی کے بندھن سے جڑنے کے بعد حمیرا میں خوشگوار تبدیلیاں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ وہ نند جسے کچن کا دروازہ دیکھتے ہی گھبراہٹ شروع ہو جاتی تھی اب یونیورسٹی سے آنے کے بعد اس کا رخ سیدھا کچن کی طرف ہی ہوا کرتا۔ شادی کی تاریخ جلد ہی رکھ دی گئی تھی اور جب سے موصوفہ نے سنا کہ ہونے والے شوہر کھانے کے شوقین ہیں وہ نئی نئی تراکیب اخبار و رسائل سے دیکھ کر آزماتی رہتی۔

"چلو دیر آید درست آید" عرفان ایک خوشگوار مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے بیڈ پر دراز ہو گئے تھے۔

میں نے مسکرا کر پلٹ کر عرفان کی جانب دیکھا اور اپنے ہونٹوں پر شہادت کی انگلی رکھ کر انہیں مزید کچھ نہ کہنے کا اشارہ کیا۔ دانش بہ مشکل میری تھپکیوں پر سویا تھا۔ میں شدید خماری آنکھوں میں لیے بے سدھ پڑے دانش کے برابر میں جھکتی چلی گئی کچھ ہی دیر میں نیند کی دیوی مجھ پر مسلط ہو چکی تھی۔ اگلے روز حمیرا کی مایوں تھی پھر ایک تھکا دینے والے مرحلے کے لیے خود کو تیار کرنا تھا۔ عرفان میری روٹین سے واقف تھے۔ وہ سارا دن مجھے تگنی کا ناچ ناچتا دیکھتے رہتے سو مجھے نڈھال سوتا دیکھ کر مسکراتے ہوئے پاس پڑی چادر مجھ پہ اور دانش کو اوڑھا دی۔

☼ ☼

"حمیرا۔۔۔ حمیرا۔۔۔"

"جی امی!" وہ ایسے چونکی جیسے کسی خواب سے بیدار ہوئی ہو۔

"بیٹا دھیان کہاں ہے تمہارا؟ کھانا ٹھیک سے کھاؤ نا۔" وہ اسے پلیٹ میں پڑے چند نوالے پر خالی چمچہ چلاتے ہوئے دیکھ کر تشویش سے بولیں۔

"جی میں کھا رہی ہوں۔" وہ اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

"رائتہ تو لیا نہیں تم نے 'بریانی میں رائتہ ساتھ نہ ہو تو تم کھانا چھوڑ دیتی تھیں اب بغیر رائتہ کے بریانی کیسے کھالی؟" عرفان کے ٹوکنے پر وہ عجیب شرمندہ سی ہو گئی چاہتے ہوئے بھی لب ہل نہ سکے زبان تلے ہونٹ دبا لیے۔

"بس ایسی ہی بھائی! کچھ عادت بدل سی گئی ہے۔" حمیرا نے ایک عجیب نظر اپنے برابر بیٹھے رضوان پر ڈالی جو کھانا کھانے میں ایسے جتا تھا جیسے اس کا مقصد واحد یہاں آکر کھانا ہی کھانا تھا۔

"ارے کولڈ ڈرنک دینا تمہیں بھول ہی گئی" میں نے بجھی بجھی سی حمیرا کے حنائی ہاتھوں میں زبردستی کولڈ ڈرنک کا گلاس پکڑا دیا۔ جسے وہ غٹا غٹ پینے لگی۔ مجھے اس کی حالت پر ترس آرہا تھا۔ شادی کے ایک ماہ بعد میکے آنے والی یہ وہ حمیرا تو نہیں ۔۔۔ خاموش خاموش ۔۔۔ بجھی بجھی سی ہر دم اکڑ کر رہنے والی حمیرا نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ اس کو ایک ہی رنگ میں وہ تین سال سے دیکھتی آرہی تھی۔ یہ اس کی شخصیت کا نیا روپ ٹیبل پر موجود گھر کے ہر فرد کے لیے شاکنگ تھا۔

"بھابھی! واہ مزا آگیا۔ بریانی تو غضب کی بنائی ہے آپ نے ۔۔۔ اور یہ قورمہ قسم سے بہت لاجواب ہے ۔۔۔ ایسے ذائقہ دار کھانے اپنی نند کو بھی سکھا دیتیں۔ قسم سے کل ہی کی بات ہے ہماری اماں نے اپنی بہو سے قورمہ بنانے کی فرمائش کرڈالی۔ معلوم نہیں قورمہ بنایا تھا یا شوربے میں ڈوبا گوشت ۔۔۔ ہاہاہا ۔۔۔ اب ایسے کھانے کی کون تعریف کرے گا اور تنقید محترمہ کو برداشت نہیں ۔۔۔ دیکھیے نہ کیسے غبارے کی طرح منہ پھلائے بیٹھی ہے۔" رضوان کا انداز تمسخرانہ تھا۔

حمیرا کی آنکھ میں پانی بھرنے لگا وہ منہ پھیر کے بیٹھی رہی اور رضوان اس کے بنائے ہوئے کھانوں کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس کے گونجتے قہقہوں کو سب ہی ہونق بنے دیکھ رہے تھے۔ گھر آئے داماد کو کچھ کہنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔

میں نے دیکھا یہ وہی ٹیبل تھی۔ جس کرسی پر آج حمیرا بیٹھی تھی کل تبھی میں بیٹھا کرتی تھی۔ اسی ٹیبل پر میرے بنائے ہوئے کھانوں پر طنزیہ فقرے اور تمکنت بھرے قہقہے اچھلتے کودتے رہتے تھے۔ آج کرسیوں کی ترتیب بدل گئی تھی۔ میرے صبر نے آج مجھے اس مقام تک پہنچا دیا تھا۔ واہ میرے اللہ! تیری مصلحتوں کو ہم نا سمجھ بندے ہرگز نہیں جان سکتے تھے۔

اچانک میں نے حمیرا کی طرف دیکھا وہ میری طرف بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا اس کا پورا وجود معافی کا طلب گار تھا۔ ٹیبل پر رکھے دونوں ہاتھوں کو مٹھی بنا کر وہ مسلے جارہی تھی۔ میں نے دھیرے سے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھوں پر رکھ کر تھپتھپا دیا۔ میرے ڈھارس کے نرم لمس پا کر اس کی آنکھوں کا پانی تشکر کے جذبے سے چھلک پڑا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا وجود کسی بوجھ سے آزاد ہو گیا تھا۔

زندگی کا نام امتحان ہے۔ اس شاہراہ پر تمکنت سے چلنے والے کہیں نہ کہیں ضرور ڈگمگا جاتے ہیں۔ اللہ کو عجز پسند ہے۔ جھکی ڈالی ہی ہمیشہ پھل پاتی ہے۔ بھلا سرو جیسے درخت کو کب پھل لگا کرتا ہے حمیرا سمجھ دار تھی۔ زندگی کی شاہراہ پر تمکنت سے چلتے چلتے اچانک ملنے والی ٹھوکر پر گر گئی تھی۔ وہ جانتی تھی شوہر کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے لیکن اس مرحلے پر اسے گزرنے کے لیے صبر سے کام لینا تھا۔ میں جن "مرحلوں" سے گزر کر "معتبر" کی جس کرسی پر براجمان تھی اس کے لیے حمیرا کو محنت درکار تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اس سفر میں اس کا ساتھ دینے کا مصمم ارادہ کیا۔ میرے دل کو واثق یقین ہے۔ وہ اپنے شوہر کے دل میں جلد ہی مقام پالے گی۔

آپ کا کیا خیال ہے ۔۔۔؟

☼ ☼

مکمل ناول

نبیلہ ابر راجہ

چھٹی قسط

"انکل.... انکل۔ کیا ہوا ہے۔" اس نے ہذیانی انداز میں سینے پہ رکھا گیا ان کا ہاتھ ہٹایا' انہیں جھنجوڑا۔ ان کا سانس جیسے سینے میں اٹک گیا تھا۔

"میں کسی کو بلا کے لاتی ہوں۔" زیان نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے تسلی دی۔ وہ جانا چاہ رہی تھی پر انہوں نے کمزور گرفت سے اسے روکنے کی کوشش کی اور کسی چیز کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے پورے کمرے میں نظر دوڑائی' جانے وہ کس کی طرف اشارہ کررہے تھے۔ انہوں نے اس کی بے چارگی اور پریشانی دیکھتے ہوئے ایک بار پھر اشارہ کیا۔ اس بار وہ سمجھ گئی۔

ان کا اشارہ سائیڈ ٹیبل پہ پڑے انہیلر کی طرف تھا۔ ملک جہانگیر کو دمہ بھی تھا' کافی عرصے سے انہیں یہ مرض چلا آرہا تھا۔ سردیوں میں تو ان کی حالت قابل رحم ہوتی۔ صرف اس سال سردیوں کے موسم میں وہ دوبار ہسپتال ایمرجنسی میں رہ کر آئے تھے۔ زیان نے بھاگ کر پھرتی سے انہیلر اٹھایا اور ان کی ناک سے لگایا۔

اتنے میں افشاں بیگم اور ملک ایبک کمرے میں داخل ہوئے۔ افشاں بیگم نماز پڑھ رہی تھیں۔ نماز ختم کرنے کے بعد نوکرانی نے انہیں زیان کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ اسی کی طرف جارہی تھیں جب ملک ایبک سے سامنا ہوا۔ انہوں نے بیٹے کو بھی زیان کی آمد کا بتایا۔ ان کی خوشی دیکھنے والی تھی۔ ایبک کو خوش گوار سی حیرت ہوئی۔

زیان انہیلر ناک سے لگائے۔ ان کی مدد کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ ملک ایبک پریشانی سے ملک جہانگیر کی طرف بڑھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ باباجان کو دمہ کا اٹیک ہوا ہے۔ اگلا پندرہ منٹ میں زیان کے ساتھ ساتھ اس کی بھی بھرپور کوشش سے ملک جہانگیر کی حالت سنبھل چکی تھی۔ اب وہ پرسکون تھے۔ انہیں دمہ کا اٹیک ہوا تھا۔ ایبک نے فارغ ہوکر سب سے پہلے اے سی بند کیا۔

"بیٹی کیسی ہو' تم کب آئیں۔ میں نماز پڑھ رہی تھی' نوکرانی نے مجھے بتایا کہ تم آئی ہو تو نماز پڑھ کر فوراً" ادھر آئی ہوں۔ تم بھی کہتی ہوگی کہ آتے ہی پریشانی سے واسطہ پڑگیا۔" ان کا اشارہ ملک جہانگیر کی اچانک بگڑ جانے والی طبیعت کی طرف تھا۔ انہوں نے قریب آکر زیان کا ماتھا چوما۔

"ادھر یہاں میرے پاس بیٹھو۔" افشاں بیگم نے اپنے پاس اس کے لیے جگہ بنائی۔ وہ مڑی تو کمر پہ گرے بالوں کے آبشار نے خاص ردھم میں ہلکورے لیے۔

"نہیں آنٹی اس میں پریشانی کیسی' بلکہ میں گھبراگئی تھی۔ آپ کو بلانے کے لیے آنے ہی والی تھی کہ آپ لوگ خود ہی آگئے۔" اس نے مدھم آواز میں وضاحت دی۔ ایبک نے اس کی طرف دیکھا پر ادھر تو لفٹ کا بورڈ آویزاں تھا۔ حالانکہ اس نے زیان کو بڑی گرمجوشی سے سلام کرکے حال احوال دریافت کیا تھا۔

نوکرانی نے کمرے میں داخل ہوکر آہستہ آواز میں افشاں بیگم سے کچھ کہا۔ زیان اس طرف متوجہ نہیں

تھی۔ اس لیے سن نہیں پائی۔

"آؤ زیان بیٹی ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں یہاں ملک صاحب آرام کررہے ہیں۔"

"تو یہاں ادھران کے پاس کون ہوگا؟" اس نے فوراً سوال کیا۔

"اصل میں انکل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے پوچھا ہے۔" افشاں بیگم کی نگاہیں خود پہ مرکوز دیکھ کراس نے وضاحت کی۔

"یہاں ایبک ہے نا' تم فکر مت کرو۔" انھوں نے ہلکی سی مسکراہٹ سمیت اپنائیت بھری نگاہوں سے اس کی سمت دیکھا۔ زیان نے ان کی معیت میں قدم آگے بڑھادیے۔

ڈرائنگ روم میں بڑی ٹیبل اشیاء خوردونوش سے پوری طرح بھری ہوئی تھی۔ افشاں بیگم نے اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود بھی اس کے لیے بڑی پلیٹ خوب بھردی۔

"آج تمہیں کھانا کھائے بغیر جانے نہیں دوں گی۔" انھوں نے اسے اپنے ارادوں سے خبردار کیا۔

"آنٹی میں نے ابھی اتنا کچھ کھالیا ہے۔ رات کے کھانے کی تو ذرا ابھی گنجائش نہیں ہے۔"

"کہاں تم نے اتنا کچھ کھایا ہے' چکھا ہی تو ہے۔ تم کھاؤ پیو' میں باورچی خانے سے ہو کر آتی ہوں۔"

زیان کے لاکھ انکار کے باوجود انہوں نے اس کی ایک نہ مانی۔ اب باورچی خانے میں زیان کے لیے خاص طور پہ اہتمام ہو رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھی۔ افشاں بیگم اس کے پاس پھر سے آکر بیٹھ گئی تھیں۔ انہوں نے اسے اپنی فیملی فوٹو البم دکھائی۔ جس میں ان کی شادی کی لاتعداد تصاویر تھی۔ اس کے ساتھ ایبک کے بچپن اور جوانی کے بھی بہت سے فوٹو گرافس تھے جو اس نے عدم دلچسپی کے ساتھ صرف اور صرف افشاں بیگم کا دل رکھنے کے لیے دیکھے۔ وہ اسے ان فوٹوؤں کے ساتھ جڑی تاریخ بھی بتا رہی تھیں۔ بہت دیر بعد انہوں نے بھاری بھرکم فوٹو البم واپس رکھی۔

"آنٹی میں ذرا انکل کو ایک نظر دیکھ آؤں؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ افشاں بیگم کو ملک جہانگیر کے لیے اس کی پریشانی دیکھ کر خوشی ہوئی۔

"ہاں... ہاں... ضرور جاؤ میں بھی آرہی ہوں۔" انہوں نے بخوشی رضامندی کا اظہار کیا۔

انکل جہانگیر اب پہلے سے کافی بہتر حالت میں تھے اور ایبک کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔

"ادھر میرے پاس آکر بیٹھو پتر۔" زیان بیڈ کے پاس پڑی کرسی پہ بیٹھنے والی تھی' جب ملک جہانگیر نے بیڈ پہ اسے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ان کی زبان سے "پتر" کا لفظ ادا ہونے کے بعد زیان کو بہت اچھا لگا تھا۔ وہ ان کے حکم کی تعمیل میں ان کے پاس بیٹھ گئی۔ ملک جہانگیر نے اپنے کمزور ہاتھوں سے زیان کا موی سفید ہاتھ تھاما۔

"اس بچی نے آج میری بڑی مدد کی ہے۔ ذرا سی دیر ہو جاتی تو میرا سانس ہمیشہ کے لیے رک جاتا تھا۔" ملک جہانگیر کا مخاطب ملک ایبک تھا۔ وہ ایک سانس بولنے کے بعد لمبے لمبے سانس لے رہے تھے۔ افشاں بیگم بھی آچکی تھیں۔ "بہت خدمت گزار اور پیاری بچی ہے یہ۔" انہوں نے پیار بھری نگاہ اس پہ ڈالی تو وہ شرمندہ ہو گئی۔ کیونکہ کمرے میں موجود تینوں نفوس کی توجہ اس کی طرف تھی۔

"نہیں انکل ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے آپ کی چھوٹی سی ہیلپ کی ہے' کیونکہ آپ کی طبیعت بہت خراب ہو رہی تھی نا۔" وہ اس توجہ سے گھبرا رہی تھی۔ افشاں بیگم اور ایبک اس کی گھبراہٹ کو محسوس کر رہے تھے۔ پھر افشاں بیگم نے ہی اسے گھبراہٹ اور نروس پن کے حصار سے باہر نکالا۔ وہ زیان کو خصوصی طور پہ بہت زیادہ توجہ دے رہی تھیں۔ کچھ محسوس کرکے اور سوچ کر ایبک کے لب گھنی مونچھوں تلے مسکرا اٹھے۔

افشاں بیگم نے رات کے کھانے پہ ملک ارسلان اور عنیزہ کو بھی اپنی طرف بلوالیا تھا۔ ان دونوں کے آنے پہ زیان کی گھبراہٹ قدرے کم ہو گئی۔ ان سب کو باتوں میں مصروف چھوڑ کر زیان باہر آگئی۔ اندر کمرے میں بیٹھ کر وہ بور ہو گئی تھی۔ پھر افشاں بیگم کی حد درجہ توجہ اور محبت بھی اسے پریشانی کے ساتھ ساتھ شرمندگی و جھنجلاہٹ سے دوچار کر رہی تھی۔ اس نے منظر سے ہٹ کر سکون محسوس کیا۔

☼ ☼ ☼

ملک افتخار نے ارسلان کو اعلا تعلیم کے حصول کی خاطر بیرون ملک بھجوانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ارسلان نے بجھے دل کے ساتھ عنیزہ کو یہ خبر سنائی۔ کتنی دیر تو وہ اسے بے یقینی کے عالم میں تکتی رہی۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو نا؟"

"کاش کہ یہ جھوٹ ہی ہوتا۔ لیکن حقیقت یہ ہی ہے کہ میں بہت جلد پاکستان سے جا رہا ہوں۔" ارسلان کے لہجے میں گہری اداسی تھی۔

"لیکن تم تو اپنے بابا جان اور بھائی کو رشتہ مانگنے کے لیے' ہمارے گھر بھیجنے والے تھے۔" عنیزہ نے شاکی نگاہوں سے تکتے ہوئے اسے یاد دلایا۔

"بابا جان ضرور آئیں گے تمہارے گھر میرا رشتہ لے کر۔ لیکن جب میں پڑھ کے ڈگری لے کے آؤں گا تب۔" ارسلان نے اسے دلاسا دیا۔

"میری تعلیم مکمل ہونے والی ہے۔ ابو جان کو میری شادی کی بہت زیادہ فکر ہے۔" عنبزہ نے مجبوری بتائی۔

"تم کہتی ہو تو میں جانے سے پہلے ان سے بات کرلوں۔" ارسلان نے اس کی اداسی بھری آنکھوں میں جھانکا۔

"نن نہیں... رہنے دو۔ یہ مناسب نہیں ہوگا کہ تم خود ان سے بات کرو۔"

میں انتظار کرلوں گی۔" وہ آنکھوں کی نمی چھپاتے ہوئے زبردستی مسکرائی۔

"تم آرام سے ہنسی خوشی مجھے الوداع کہوگی تو میں بھی یہ کڑا وقت تب ہی کاٹ پاؤں گا۔"

"نہیں تمہیں الوداع نہیں کہوں گی۔ مجھے الوداع کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے جیسے تم ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاؤ گے۔"

"تم پاگل ہو بس اور کچھ نہیں۔"

"ہاں مجھے پاگل کہہ لو' پھر میں تمہیں گڈ بائے نہیں کہوں گی۔"

"میں تمہیں گڈ بائے بول کے جاؤں گا۔" وہ اسے ستانے کے لیے بولا تو عنبزہ نے فوراً" اس کے لبوں پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

"پلیز ارسلان مجھے کبھی بھی گڈ بائے مت بولنا' میں جی نہیں پاؤں گی۔ مجھے تم سے بچھڑنے سے خوف آتا ہے۔" ارسلان اس پاگل سی لڑکی کو دیکھتا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

افشاں بیگم بڑی دیر سے خاموش بیٹھیں اپنی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ملک جہانگیر ان کا ارتکاز محسوس کررہے تھے۔ وہ ان ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ افشاں بیگم اپنی سوچوں کی محویت سے چونکیں۔

"کیا سوچ رہی ہو ملکانی؟" وہ بڑے موڈ میں تھے۔ تب ہی انہیں ملکانی کہہ کر مخاطب کیا۔

"ملک صاحب میں زیان کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔"

"کیا سوچ رہی ہو پتا تو چلے۔"

"کل وہ جب تک یہاں تھی ہمارے گھر میں کتنی رونق تھی نا۔ پوری حویلی اس کے آنے سے جیسے سج سی گئی تھی۔"

"ہاں ملکانی اللہ نے ہمیں بیٹی نہیں دی' بیٹی دیتا تو وہ زیان جیسی ہوتی۔ محبت کرنے والی' خیال رکھنے والی۔ کل وہ میرے لیے اتنی پریشان تھی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے گھر میں بیٹی کی کمی محسوس ہوئی۔" وہ بولتے بولتے اداس سے ہوگئے۔

"ہم زیان کو بیٹی بنا سکتے ہیں۔" افشاں بیگم کا لہجہ پرسوچ تھا۔

"کیسے ہم اسے بیٹی بنا سکتے ہیں؟" وہ الجھے۔

"زیان خوب صورت ہے' پڑھی لکھی ہے عنبزہ کی بیٹی ہے' آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟" افشاں بیگم نے ان کے سوال کو ذرہ بھر اہمیت نہیں دی تھی۔

"ملکانی مجھے لگتا ہے تم کچھ خاص سوچ رہی ہو؟"

"ہاں آپ ایسا کہہ سکتے ہیں۔" افشاں بیگم نے انہیں جھٹلانے کی کوشش نہیں کی۔

"لگتا ہے تم نے میرے دل کی بات سمجھ لی ہے۔ کل جب وہ آئی تو کمرے میں میرے پاس کوئی نہیں تھا۔ اس نے ڈھونڈ کر مجھے انہیلر دیا۔ سہارا دے کر اٹھایا۔ اس وقت وہ بہت پریشان نظر آرہی تھی۔ تب سے ہی میں اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں' بہت سلجھی ہوئی خاموش طبع بچی ہے۔" ملک جہانگیر کا انداز تعریفی تھا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں زیان' میں آج کل کی لڑکیوں والی بات ہی نہیں ہے' نہ کوئی نخرا' نہ چھچھورا پن۔ چپ چاپ رہتی ہے۔ ہمارے گھر آئی تو سب میں بیٹھ کر بھی خاموش رہی۔ سچ مانو تو میرا دل دکھ رہا تھا۔" افشاں بیگم کی بات پہ وہ تھوڑی دیر خاموش رہے

جیسے لفظ جمع کر رہے ہوں۔

"تو ملکانی صاحبہ کو زیان بیٹی بہت پسند آگئی ہیں۔" کچھ دیر بعد وہ بڑے شگفتہ لہجے میں گویا ہوئے۔

"ہاں میرا تو ارادہ ہے کہ ہم زیان کو بیٹی بنا کر اپنے گھر لے آئیں۔" جہانگیر کی طرف سے حوصلہ افزائی محسوس کرتے ہی افشاں بیگم نے اچانک دل کی بات کھل کے کہہ دی۔

"اس سے اچھی تو کوئی بات ہی نہیں ہوگی پھر۔۔ زیان 'عزت دار خاندان کا خون ہے' پھر اس کی ماں عنبزہ ہے۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"ملک صاحب سچ پوچھیں تو مجھے زیان پہلی نظر میں ہی بہت اچھی لگی تھی۔ میں نے دل میں سوچ لیا تھا اسے عنبزہ سے اپنے ایبک کے لیے مانگ لوں گی۔"

"ملکانی تم نے اتنے بڑے فیصلے اکیلے ہی کر لیے۔" ملک جہانگیر شرارت سے مسکرائے۔

"میں اکیلی رہ رہ کر تنگ آگئی ہوں' اس لیے یہ فیصلہ کیا ہے۔ ایبک کی دلہن آئے گی تو میری تنہائی تو ختم ہوگی نا۔ آپ باپ بیٹے کو میری پروا ہی کب ہے۔ میں عنبزہ سے بات کرتی ہوں جلدی۔" افشاں بیگم شکوہ کناں انداز میں بولیں۔

"ایبک کی رائے لے لینا۔" انہوں نے مشورہ دیا۔

"میں آپ کی طرح نہیں ہوں کہ اٹھ کر بیٹے کو بتائے بغیر عنبزہ اور ارسلان کے پاس چلی جاؤں۔" ان کا اشارہ احمد سیال کے گھر جانے کی طرف تھا۔ وہ کھسیانے سے ہو کر مسکرائے۔ "میں ایبک سے بات کروں گی۔ ویسے میرا نہیں خیال کہ اسے اعتراض ہوگا۔ شہزادیوں جیسا حسن اور آن بان پائی ہے زیان نے' ایبک انکار کر ہی نہیں سکتا۔" افشاں بیگم کے یقین کا پیمانہ بھی عجیب تھا۔ وہ سر ہلا کر رہ گئے۔ افشاں بیگم ابھی سے ہی ایبک اور زیان کے بارے میں مستقبل کے خواب بننا شروع ہو گئی تھیں۔ زیان کو وہ تصور کی آنکھ سے دلہن بنے گھر میں چلتے پھرتے دیکھ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

ایبک ان کی پوری بات سننے کے بعد خاموشی سے کچھ سوچ رہا تھا۔ افشاں بیگم کو الجھن سی ہو رہی تھی کہ جانے وہ خاموش کیوں ہو گیا ہے۔ کیا سوچ رہا ہے۔ بہت دیر توقف کے بعد اس نے خاموشی کا قفل توڑا۔

"امی زیان مجھے بہت مغرور لگتی ہے۔" افشاں بیگم کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لیں۔ اس نے کیا اعتراض کیا تھا۔

"وہ مغرور نہیں ہے' بس زیادہ گھلتی ملتی نہیں ہے۔ نئی نئی یہاں آئی ہے تو مانوس ہونے میں کچھ وقت تو لگے گا ہی۔"

"ٹھیک ہے امی جیسی آپ کی مرضی۔"

"میری مرضی نہیں۔۔۔ زندگی تم نے گزارنی ہے فیصلہ اور مرضی بھی تمہاری ہوگی۔ ابھی میں نے صرف سوچا ہے زیان کا' جانے کی بات نہیں کی ہے۔"

"امی رسک لے لیتے ہیں۔" ایبک کا لہجہ آخر میں شرارتی ہو گیا۔ اس کی نگاہوں میں زیان کا کچھ دن پہلے کا "میں ہی میں ہوں۔" والا روپ لہرایا تھا۔ اس نے اپنی مسکراہٹ دبالی تھی۔

"میں عنبزہ اور ارسلان سے بات کروں گی جلدی۔"

"آپ کو اتنی جلدی کیوں ہے امی؟" ایبک نے ان کو چھیڑا۔ ایبک کی رضامندی کے بعد ان کا چہرہ خوشی سے جگمگا رہا تھا۔

"میں سارا دن اکیلی ہوتی ہوں' بات کرنے تک کو ترستی ہوں' میری بہو آئے گی تو تنہائیاں بانٹ لے گی میری۔" ان کا لہجہ محبت میں ڈوب گیا تھا متوقع بہو کے خیال سے ہی۔

☆ ☆ ☆

ملک ارسلان' زیان کی پرابلم سمجھ گئے تھے۔ وہ اسے خود سے سنبھلنے کا سوچنے کا موقع دے رہے تھے۔ ان کا رویہ محبت بھرا تھا' جس میں حد درجہ اپنائیت تھی۔ انہیں یقین تھا۔ ایک دن وہ ان کی محبت کی

قائل ہو جائے گی۔ وہ عنیزہ کی کوکھ سے تھی، لیکن انہیں کبھی حسد محسوس نہیں ہوا کہ بچ کسی اور کا بویا ہوا ہے۔ وہ اس سے اپنی سگی اولاد کا سا برتاؤ کر رہے تھے۔ رہ گئے ملک جہانگیر اور افشاں بیگم تو انہوں نے بڑی محبت سے اس کے لیے بازو وا کیے تھے۔ افشاں بیگم کو اس کی خوب صورتی بھا گئی تھی۔

اپنے سگے باپ کے گھر کے مقابلے میں وہ یہاں محفوظ تھی۔ ایک اب گاؤں میں ہی تھا۔ اس کا ملک ارسلان کی طرف روز کا آنا جانا تھا۔ ذیان سے بھی آمنا سامنا ہوتا، پر اس نے ذیان پر کبھی بری نظر نہیں ڈالی تھی۔

ذیان کو اس بات پہ شکر ادا کرنا چاہیے تھا۔ وہ خوف وڈر کے حصار سے نکل آئی تھی، پر ماضی کی تلخیوں کو وہ اتنی جلدی فراموش کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔ اس کی اپنی عدالت اور انصاف تھا۔

☆ ☆ ☆
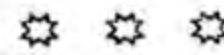
کمرے میں موجود سب نفوس سہمے ہوئے تھے اور تو اور زرینہ بیگم بھی بے حد خائف تھیں، وہاب بری طرح گرج برس رہا تھا۔ اس کے ساتھ روبینہ بھی کینہ توز تیور چہرے پہ سجائے موجود تھیں۔

"خالہ سیدھی طرح بتا دو کہاں ہے ذیان؟" وہ ایک بار پھر غصے سے غرایا۔

"بتایا تو ہے مجھے نہیں پتا کہاں ہے۔ گھر سے اپنی سہیلی کے ہاں جانے کا بول کر نکلی تھی، اب مجھے کیا پتا کہاں گئی۔"

"خالہ آپ نے پوچھا نہیں اس کی سہیلی سے۔" وہ ان کی بات پہ یقین نہ کرنے والے انداز میں بولا۔

"پوچھا تھا اس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ یہاں آئی ہی نہیں۔"

"آپ نے کیا کیا پھر؟"

"میں نے کیا کرنا تھا۔ خاموش ہو گئی ہوں، اپنی عزت کے ڈر سے۔"

"یہ مت سمجھنا کہ میں ان باتوں کا یقین کر لوں گا۔ میں خود کھوج لگاؤں گا اور ہوا اگر آپ کو کچھ پتا ہے تو بتا دیں۔ میں کسی کو کچھ بھی نہیں کہوں گا۔" وہ بات کرتے کرتے بوا کی طرف مڑا۔

"وہاب میاں مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔ سارا دن اپنے کام میں لگی رہتی ہوں۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولیں۔

"کمال ہے یہاں کسی کو کچھ پتا نہیں ہے۔ جیتی جاگتی جوان جہان لڑکی غائب ہو گئی ہے اور سب آرام سے بیٹھے ہیں۔" روبینہ طنزیہ تاثرات چہرے پہ سجائے زرینہ کو دیکھ رہی تھیں۔ زرینہ نے بڑی مشکل سے خود کو کوئی سخت بات کہنے سے روکا۔ کیونکہ اس وقت ان کی پوزیشن کمزور تھی وہ اپنے گھر میں رہتے ہوئے بھی بے سائباں تھیں۔ آفاق جس نے بڑے ہو کر ان کا سہارا بننا تھا خود نادان اور کمسن تھا۔

وہاب ذیان کی گمشدگی کا سن کر آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اسی سلسلے میں اس نے عدالت لگائی تھی۔ روبینہ پوری طرح ساتھ دے رہی تھیں۔ اس لیے وہ اور بھی شیر ہو رہا تھا

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا تھا۔ ساتھ ٹیبل پہ پڑی ایش ٹرے سگریٹ کے ٹوٹوں سے بھر چکی تھی۔ "کہاں ذیان بھلا خود سے گھر چھوڑ کر کہاں جا سکتی ہے؟" اس نے بڑبڑاتے ہوئے جیسے سوال کیا۔

"مجھے تو زرینہ پہ شک ہے کہ اسی نے کہیں ذیان کو اِدھر اُدھر کیا ہے۔ کیونکہ وہ کسی صورت بھی ذیان کی شادی تم سے کرنے کے حق میں نہیں تھی۔" روبینہ نے آج زرینہ کی ناپسندیدگی سے پردہ اٹھایا۔

"کمال مجھے پتا ہے سب۔"

"ساتھ ذیان باپ کی جائیداد میں حصے دار بھی تو ہے۔ زرینہ نہیں چاہتی کہ اسے کچھ دینا دلانا پڑے۔" روبینہ کا لہجہ پر سوچ تھا۔

"میں چھوڑوں گا نہیں خالہ کو انہوں نے اچھا نہیں کیا ہے یہ سب کر کے۔"

"ہاں۔ زرینہ تو میری ماں جائی ہے اسے اپنی بہن کا بھلا سوچنا چاہیے تھا۔ ذیان کی شادی تمہارے ساتھ

ہو جاتی تو اس کا کیا جاتا۔" روبینہ بہن سے بے حد شاکی اور کبیدہ نظر آرہی تھیں۔

"خالہ کو تو میں چھوڑوں گا نہیں۔ ساتھ بوا سے بھی پوچھ گچھ کروں گا۔" اس نے خطرناک انداز میں اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

☆ ☆ ☆

وہاب اور روبینہ آپا کے جانے کے بعد زرینہ تینوں بچوں اور بوا سمیت وہیں بیٹھی ہوئی تھیں۔

"بوا اب کیا ہو گا؟ اس وہاب سے نمٹنا آسان نہیں ہے میرے لیے۔" خاموشی میں زرینہ کی پریشان آواز ابھری۔

"وہاب میاں اس معاملے کو یہاں چھوڑنے والے نہیں ہیں کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔" بوا خود ازحد پریشان تھیں۔

"بوا نے وہاب کا انداز دیکھا؟ کتنی بدتمیزی کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ اس نے تو میرا بھی لحاظ نہیں کیا ہے اور آپا روبینہ نے اسے ذرا بھی نہیں روکا۔"

"چھوٹی دلہن میرا خیال ہے وہاب میاں پھر آئیں گے۔" بوا کا لہجہ تفکر سے بھرپور تھا۔

"میں کیا کروں بوا۔ میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ زیان کے جانے کے بعد یہاں ایسے ایسے مسئلے سر اٹھائیں گے۔"

"چھوٹی دلہن حوصلہ مت ہاریں۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔"

"بوا میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں میں امیر علی کے بعد جیسے جلتے سورج کے نیچے آگئی ہوں۔ پے در پے پریشانیاں مشکلات اور خوف۔" زرینہ کا لہجہ دل گیر تھا۔

"چھوٹی دلہن آپ سنبھالیں خود کو۔ بچوں کا کیا ہو گا۔ آپ کا ٹھیک رہنا بہت ضروری ہے اور آپ اکیلی تو نہیں ہیں میں ہر حال میں آپ کے ساتھ ہوں۔" بوا نے حتی الامکان تسلی دی۔

"آپ فکر مت کریں چھوٹی دلہن جو ہو گا اچھا ہو گا۔" "ان شاء اللہ" جواباً" زرینہ نے دل کی گہرائیوں سے کہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ملک جہانگیر افشاں بیگم کے ساتھ خود آئے تھے۔ حالانکہ ان کی طبیعت ابھی بھی پوری طرح سنبھلی نہیں تھی مگر یہ ان کے بیٹے کے رشتے کا معاملہ تھا۔ وہ ازحد خوش تھے۔ خود کو پہلے سے بڑھ کر توانا اور جوان محسوس کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ آئی نوکرانیوں نے مٹھائی کے ٹوکرے خشک میوہ جات موسمی پھل اور اس نوع کے دیگر لوازمات اٹھا اٹھا کے اندر لانے شروع کیے تو فریدہ نے فوراً" سے عنیزہ کو مطلع کیا۔ وہ فون پہ بات کر رہی تھیں۔ اسی وقت فون بند کر کے ڈرائنگ روم کا رخ کیا۔

زیان ظہر کی نماز پڑھ کر آئی تو اس نے بھی انواع و اقسام کی سب اشیاء دیکھیں۔ آج تو جہانگیر انکل بھی اس کی یہاں موجودگی میں پہلی بار وہاں آئے تھے۔ اس لیے اسے بہت خوشی ہو رہی تھی۔

"انکل میں بہت خوش ہوں آپ یہاں آئے ہیں۔" اس نے اپنی خوشی کا اظہار کرنے میں کنجوسی سے کام نہیں لیا۔ ساتھ آئی افشاں بیگم کے چہرے پہ مسکراہٹ آگئی انہوں نے اسے ساتھ لپٹا کے پیار کیا جہانگیر نے اس کا ماتھا چوما۔

عنیزہ کی نگاہ سب سے پہلے ٹوکروں پہ پڑی تو ان کے دل میں عجیب سی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ اس طرح اتنی ساری سوغات سمیت جہانگیر بھائی اور افشاں بھابھی کا آنا بے سبب نہیں تھا۔ عنیزہ نے جہانگیر بھائی اور افشاں بیگم کی لائی گئی تمام چیزیں نمنال کے سپرد کیں۔ انہیں رکھوا دو۔ ان کا اشارہ ٹوکروں کی طرف تھا۔ فریدہ کے ساتھ مل کر اس نے سب کچھ اٹھوایا۔ دونوں اس سلسلے پہ باتیں کر رہی تھیں۔ فریدہ اسی گاؤں کی پروردہ تھی اسے اچھی طرح پتا تھا کہ یہاں مٹھائی اور دیگر چیزوں سمیت کسی کے

گھر جانے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ مٹھائی خوشی کے اظہار، مبارک باد اور رشتہ مانگنے کے موقعہ پہ لازمی دی جاتی تھی یہ ان کی دیہاتی رسومات کا حصہ تھا۔

"نمناں تمہیں پتا ہے بڑے ملک صاحب یہ سب کس لیے لے کے آئے ہیں؟" اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ وہ خاموشی سے کچھ بولے بغیر اسے تکنے لگی اتنا تو اسے بھی پتا تھا کہ مٹھائی خوشی کے موقعوں کا لازمی جزو ہوتی ہے۔

"میرا خیال ہے کہ بڑے ملک صاحب رشتہ مانگنے آئے ہیں۔" اس نے انتہائی آہستہ سے کہا جیسے کسی کے سن لیے جانے کا ڈر ہو۔

"کس کا رشتہ؟"

"ارے زیان یعنی چھوٹی بی بی کا رشتہ" فریدہ نے جیسے اس کی کم عقلی پہ ماتم کیا۔

"کس کے لیے؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ بڑے صاحب کے لیے کیونکہ چھوٹے صاحب ولایت گئے ہوئے ہیں پڑھنے۔" فریدہ نے اس کی معلومات میں گراں قدر اضافہ کیا۔ نمناں یعنی رنم کے پھرتی سے چلتے ہاتھ یکدم سست پڑ گئے۔

ایبک کو وہ روز ہی دیکھتی تھی دل ہی دل میں اس نے کئی بار ایبک کی مردانہ وجاہت کو سراہا تھا۔ اس میں وجاہت کے ساتھ وقار بھی تھا ذہن میں اسے دیکھتے ہی ایک لفظ گونجتا پیور۔ ریفائنڈ۔ اس کی باوقار مردانہ وجاہت میں کسی شے کی بھی کمی نہیں تھی۔

ابھی مٹھائی اور دیگر اشیاء کے ٹوکرے اٹھاتے وقت اس نے زیان کو بھی دیکھا تھا۔ اس نے آج بھی بہت مہنگا ڈیزائنر سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ وہ ملک جہانگیر اور افشاں بیگم سے ہنس ہنس کے باتیں کر رہی تھی۔ کھلے بالوں کو بار بار کان کے پیچھے کرتی، سمٹتی وہ سادہ سے روپ میں بھی نمناں کو جانے کیوں شدید قسم کی کوفت میں مبتلا کر رہی تھی۔ ابھی فریدہ نے اپنے قیاس کی بنا پہ جو پیش گوئی کی تھی اس نے اس کی جھنجلاہٹ اور بھی بڑھا دی تھی۔

زیان کچھ دیر ہی وہاں بیٹھی۔ افشاں بیگم کے تاثرات بہت معنی خیز قسم کے تھے۔ وہ اٹھ کے باہر نکلی۔ اور چلتے چلتے باغ کی طرف نکل گئی۔

فریدہ اسے تلاش کرتی بھاگنے والے انداز میں چلتی اس کے پیچھے آئی۔

"چھوٹی بی بی آپ کو ادھر بلا رہے ہیں سب" فریدہ کا اشارہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ملک جہانگیر اور افشاں بیگم کی طرف تھا۔ اس کا سانس تیز چلنے اور بھاگنے کی وجہ سے بری طرح پھول گیا تھا۔ چہرے پہ دبا دبا اشتیاق تھا جیسے وہ کچھ کہنے کے لیے بے قرار ہو۔

"ٹھیک ہے جاؤ میں آ رہی ہوں" فریدہ سر ہلاتی واپس چلی گئی۔ اس نے بھی اپنے قدم موڑ لیے۔

زیان آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی واپس رہائشی حصے کی طرف آ رہی تھی جب اس کے پاس سے نمناں بہت تیز رفتاری سے گزری۔ عنیزہ بیگم نے نمناں کے بارے میں اسے تفصیل سے بتایا تھا زیان کو ایک ثانیے کے لیے نمناں بہت اداس اور پریشان محسوس ہوئی تھی۔ وہ ذرا دیر کے لیے بھی اس کے پاس نہیں رکی تھی۔ زیان اس سے کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی اس لیے اس نے نمناں جس سمت میں گئی تھی اس طرف قدم بڑھائے۔ وہ چلتے ہوئے کافی آگے نکل آئی۔ نمناں کہیں نہیں تھی۔ البتہ آگے سے ملک ایبک اسی طرف آ رہا تھا، جہاں زیان کھڑی متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ ایبک شاید یہاں اس کی موجودگی کی توقع نہیں کر رہا تھا اس لیے رک گیا۔

"کس کو ڈھونڈ رہی ہیں؟" زیان کو ایسے لگا جیسے ایبک نے اپنی مسکراہٹ کا گلا گھونٹا ہو۔

"میں نمناں کو دیکھ رہی تھی وہ شاید اس طرف آئی ہے۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا۔

ایبک دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ زیان اس کی گہری نگاہوں کے ارتکاز سے گھبرا گئی۔ اس کی چھٹی حس بار بار کوئی احساس دلا رہی تھی۔

"آپ کو غیر اہم لوگوں اور واقعات سے دلچسپی کیوں ہے؟" ایبک نے کوئی تبصرہ کرنے یا جواب دینے کے بجائے عجیب سا سوال کر دیا۔ وہ اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ وہ انہی قدموں پیچھے ہٹنے لگی۔ ملک ایبک پہ اسے غصہ آ رہا تھا۔

وہ جیسے ہی سیڑھیاں چڑھ کر رہائشی حصے میں داخل ہوئی سامنے سے آتی عنیزہ اسے دیکھ کر رک گئیں۔ ان کے ساتھ ملک ارسلان بھی تھے۔

"افوہ کب سے تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں۔ اندر آؤ رسم کرنی ہے۔ افشاں بھابھی انتظار میں ہیں۔" اس کے کچھ سوچنے سمجھنے سے پہلے ہی عنیزہ نے اس کا ہاتھ تھاما اور ڈرائنگ روم میں لائیں۔ ملک ارسلان عنیزہ کے ساتھ تھے اس لیے وہ کچھ بول ہی نہیں پائی۔ افشاں بیگم نے اسے پکڑ کر اپنے برابر خالی جگہ پہ بٹھایا۔ ملک جہانگیر اور ملک ارسلان دلچسپی سے ساری کاروائی دیکھ رہے تھے۔

افشاں بیگم نے سرخ رنگ کا بھاری کام سے مزین دوپٹا اس کے سر پہ ڈال دیا۔ یہ دوپٹا ان کی ساس نے ملک جہانگیر کے ساتھ نسبت طے ہونے کے موقع پہ انہیں اوڑھایا تھا۔ اور اب انہوں نے نیک شگون کے طور پہ اور خاندانی روایت کو زندہ رکھتے ہوئے اسے اوڑھایا تھا۔ ملک جہانگیر نے مٹھائی کی پلیٹ میں سے ایک گلاب جامن اٹھا کر زیان کا منہ میٹھا کروایا۔

"مبارک ہو مبارک ہو" سب ایک دوسرے کو آپس میں مبارکباد دے رہے تھے۔ زیان کے اعصاب حیرت کی زیادتی سے جیسے فریز ہو رہے تھے۔ دماغ جو سمجھ رہا تھا دل اسے قبول کرنے سے انکاری تھا۔

"اب یہ میرے ایبک کی امانت ہے۔ میں بہت جلد اسے لے جاؤں گی دلہن بنا کے۔" افشاں بیگم کا اشارہ یقیناً "زیان کی سمت تھا۔ سرخ کامدار دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرا چھپا ہوا تھا اور زیان گنگ تھی۔

اس کی زندگی کا اہم فیصلہ اس سے پوچھے بغیر کر دیا گیا تھا۔ ایبک کے ساتھ اس کا رشتہ طے ہو چکا تھا۔ وہ اتنی گئی گزری ہے کہ اس سے پوچھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔

یہ عورت جو اس کی ماں ہونے کی دعویدار ہے وہ اسے اس کی اس حرکت کا مزا چکھا کے رہے گی۔ جس اذیت سے وہ گزری ہے ایسی ہی اذیت سے وہ انہیں بھی گزارے گی۔ اس عورت سے وابستہ ہر رشتے' ہر شخص سے اسے نفرت ہے۔

لیکن وہ الجھ رہی تھی۔ ملک جہانگیر نے اپنا کمزور سا ہاتھ اس کے سر پہ رکھا تو ایک دم امیر علی اس کی نگاہوں کے سامنے آ گئے۔ وہ ان سے بھلا کیسے نفرت کرے گی' وہ انہیں کیسے اذیت دے پائے گی ان میں تو امیر علی کا عکس ہے۔

باقی سب عنیزہ کے حوالے سے اس کی زندگی میں آئے تھے۔ وہ کسی کو بھی معاف نہیں کرے گی' ہر کام کرے گی جس سے انہیں تکلیف ہو' دکھ پہنچے۔ ان کی اذیت میں اضافہ ہو۔ وہ انہیں کوئی رعایت نہیں دے گی رحم نہیں کرے گی۔" زیان کے چہرے پہ نفرت کی پرچھائیاں تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے ہاتھ کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ الٹے ہاتھ کی تیسری انگلی میں ہیرے کی نازک سی انگوٹھی کا اضافہ ہو چکا تھا جو ملک ایبک کے ساتھ اس کے طے پانے والے رشتے کا واضح اعلان تھا۔ انگوٹھی کو تکتے ہوئے اس کے ہونٹوں پہ زہریلی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ اسے بتائے بغیر اچانک اس کے مستقبل کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس کا غصہ اور نفرت حد سے سوا تھی۔

عنیزہ اس رشتے سے بے پناہ خوش تھیں۔ ملک جہانگیر نے جب پہلی بار گھر میں ایبک کی شادی کی بات کی تھی تو ان کا دھیان فوراً "زیان کی طرف گیا تھا۔

ان کے دل نے بے اختیار خواہش کی تھی کہ کاش زیان ان کے پاس ہوتی اور ایبک اس کا نصیب بنتا۔ ایبک ہر لحاظ سے ایک آئیڈیل اور شاندار نوجوان تھا۔ انہیں خبر بھی نہیں ہوئی اور قدرت نے ان کی یہ خواہش من و عن پوری کر دی۔ وہ بے پناہ خوش تھیں

کیونکہ ذیان نے اب ہمیشہ ان کے پاس رہنا تھا۔ یہ احساس ہی ان کے لیے طمانیت انگیز تھا۔

ذیان نے رشتہ طے ہونے کے بعد کوئی ہنگامہ یا احتجاج نہیں کیا تھا' نہ کوئی باز پرس کی۔ ورنہ ان کا خیال تھا کہ اپنا رشتہ اس طرح طے کیے جانے پہ وہ شکوہ کرے گی۔ عنیزہ توقع نہیں کر پا رہی تھیں کہ افشاں بھابھی اور جہانگیر بھائی اس طرح اچانک ذیان کے لیے سوالی بن کے آئیں گے۔ اس خوشی نے ان کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے تھے۔ انہوں نے ذیان سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی اور اس سے پوچھنے کا موقع بھی نہیں تھا ملک ارسلان بھی جوش ۔۔۔ تھے۔ ایبک کو شروع سے پسند کرتے تھے۔ ان کے خیال میں ایبک اور ذیان کی جوڑی شاندار تھی۔

☆ ☆ ☆

ذیان کے بیڈ روم کی لائٹ بند تھی وہ خود ٹیرس پہ تھی۔

"ملک محل" کے دوسرے حصے میں ایبک بھی ٹیرس پہ پڑی کرسی پہ نیم دراز تھا۔ سارے دن کی بھاگ دوڑ سے وہ تھک چکا تھا۔ انڈسٹریل ہوم کی تعمیر مکمل ہونے کے مراحل میں تھی۔ پھر اس کے بعد وہاں اصل کام کا آغاز ہونا تھا جس کے لیے اسے بنایا گیا تھا۔ گاؤں کی بہت سے عورتیں اور لڑکیاں ہنر مند اور محنتی تھی وہ سب ہی اپنی محنت اور ہنر کے جوہر دکھانے کے لیے بے تاب تھیں۔ ملک ایبک ان کے ہنر صلاحیتوں کے لیے انہیں انڈسٹریل ہوم کی صورت میں پلیٹ فارم دے رہا تھا۔ وہ اپنے گھر کی حالت بہتر بنا سکتی تھیں معیار زندگی اچھا بنا سکتی تھیں' آمدنی میں اضافہ کر سکتی تھیں۔

دن بھر مصروفیات کا وہی عالم رہا تھا۔ پورے دن میں یادگار لمحہ وہی تھا جب اچانک اتفاقی طور پہ ذیان سے سامنا ہوا تھا۔ بابا جان اور افشاں بیگم اس کی اطلاعات کے مطابق ارسلان چچا ہی کی طرف تھے۔ ایبک کے راستے میں آجانے سے اس کے چہرے اور آنکھوں میں غصہ اتر آیا تھا۔ وہ منظر یاد آتے ہی اسے ایک بار پھر ہنسی آئی۔

وہ کھانا کھا کے اوپر آیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا تھوڑی دیر کھلے آسمان تلے بیٹھے۔ کبھی کبھی اچانک جڑ جانے والے تعلق کے بارے میں سوچنا کتنا حسین لگتا ہے ابھی ایبک بھی اسی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ کرسی پہ بیٹھے بیٹھے اس کی نگاہ سامنے کی طرف اٹھی۔ وہاں آج مکمل اندھیرا تھا شاید آج روشنی سے کوئی پرانا ادھار چکایا جا رہا تھا۔ اندھیرے کے باوجود بھی وہ نسوانی ہیولے کو پہچان چکا تھا۔ چاند کی ہلکی ہلکی سی روشنی چیزوں کی ہیئت اور خدوخال کو واضح کر رہی تھی۔ ذیان ٹیرس پہ ٹہل رہی تھی۔ ایبک کی طرف کے حصے کی تمام لائٹس آن تھیں۔ وہ تھکے تھکے سے انداز میں کرسی کی پشت سے سر ٹکائے نیم دراز تھا۔

سر میں کچھ گھنٹے قبل شروع ہونے والا درد اب شدت اختیار کر چکا تھا۔ بے اختیار اس کے دل میں ایک خواہش ابھری۔ اک دلنشیں اور خوب صورت سی خواہش کہ ذیان اس کے دکھتے سر اور کنپٹیوں کو ہاتھ سے دبائے۔ پھر یقیناً" اس کے سر درد میں افاقہ ہو گا۔ اپنی اس بچکانہ خواہش پہ اسے خود ہی ہنسی آگئی۔

ذیان اسے ٹیرس پہ بیٹھا دیکھ چکی تھی۔ پچھلے پندرہ منٹ سے وہ اسی پوزیشن میں نیم دراز تھا۔ اس نے نگاہ موڑلی اور ہونہہ کہہ کر رہ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ کرسی سے اٹھا۔ اب ذیان کے سامنے اس کا چہرہ تھا۔ اس نے پشت موڑلی اور کمرے میں آکر دروازہ بند کر لیا۔ پر وہ بند دروازے کے پیچھے اسی کو سوچ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

معاذ اسکائپ پہ سب گھر والوں سے بات کر رہا تھا۔ افشاں بیگم نے ایبک اور ذیان کا رشتہ طے ہونے کی بریکنگ نیوز سنائی تھی۔ وہ ذیان کے "ملک محل" میں آنے کے شاک سے بھی ابھی نہیں سنبھلا تھا۔ کیونکہ اسے عنیزہ چچی کے ماضی کا زیادہ نہیں پتا تھا۔ پھر اس کے سامنے کم کم ہی تذکرہ ہوتا تھا۔ وہ تعلیم کے سلسلے

میں پہلے گھر سے دور رہا پھر پاکستان سے۔ اس لیے جب اسے بتایا گیا کہ "ملک محل" کے مکینوں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا ہے اور اضافہ بھی عنیزہ چچی کی بیٹی کا" تو وہ جی بھر کے حیران ہوا۔ پاکستان والوں نے شاید اسے جی بھر کے حیران کرنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔

"مجھے فوراً" میری بھابھی کی فوٹو دکھائیں۔" اس نے افشاں بیگم سے مطالبہ کیا۔

"چھری تلے دم تو لو' ابھی میں ایبک سے کہتی ہوں تمہیں بھیج دے گا۔" اس کی بے قراری پہ وہ مسکرائیں۔

"نہیں' میں بات بعد میں کروں گا پہلے فوٹو دکھائیں مجھے" اس نے ضدی لہجے میں کہا۔

ملک ارسلان نے کیمرے میں ذیان کی اس خاص موقعے پہ بے شمار فوٹو بنائی تھیں۔ وہ کیمرا افشاں بیگم کے پاس تھا۔ نوکرانی ان کی ہدایت پہ ان کے کمرے سے جھٹ پٹ لے آئی۔

"ایبک' معاذ کو ذیان کی فوٹو ابھی بھیجو یا وُلا ہو رہا ہے۔" افشاں بیگم نے کیمرا اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

ایبک' معاذ کے ساتھ بات کرتے ہوئے ذیان کی تصویریں اسے سینڈ کرنے لگا۔ افشاں بیگم جا چکی تھیں لہٰذا ایبک نے بھی بڑے غور سے ذیان کی سرخ دوپٹے والی تصویریں دیکھیں' ہر فوٹو میں اس کے لب باہم پیوست تھے ہلکی سی مسکراہٹ تک کی رقم نہ تھی۔ جھکی آنکھیں اس کے تاثرات چھپانے میں کامیاب ثابت ہوئی تھیں۔ ایبک نے ذیان کی تمام تر فوٹو ایک الگ فو میں سیو کرلیں۔

ذیان کے ساتھ رشتہ طے ہو جانے کے بعد ذیان کے لیے اس کے تاثرات خود بہ خود ہی بہت نرم اور خاص قسم کے ہو گئے تھے۔ اس کے ذہن میں کبھی یہ خیال تک نہ آیا تھا کہ اس طرح اچانک ایک اجنبی لڑکی اس کی زندگی میں خاص اہمیت اختیار کر جائے گی۔ اسے حویلی آئے ٹائم ہی کتنا ہوا تھا۔

آتے ساتھ ہی اس نے سب کے دل میں جگہ بنالی تھی اور اب تو ایبک کے خیالات پہ بھی وہ اثر انداز ہونے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

ذیان جب سے گاؤں آئی تھی' سوائے ایک بار کے حویلی سے باہر نہیں نکلی تھی۔ صرف ایک بار وہ عنیزہ کے ساتھ شہر شاپنگ کرنے گئی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا باہر نکل کر گاؤں دیکھے لوگوں سے ملے۔ اس کی یہ بے ضرر سی خواہش عنیزہ اور ارسلان تک پہنچی تو انہوں نے فوراً" اسے پورا کرنے کے لیے عملی اقدامات کیے۔

لینڈ روور میں وہ دو نوکرانیوں اور ڈرائیور کے ساتھ جا رہی تھی۔ گاؤں آنے کے بعد آج پہلی بار وہ حقیقی معنوں میں خوش نظر آ رہی تھی۔ گاڑی دو رویہ درختوں والی سڑک سے گزر رہی تھی۔ تاحد نظر سبزہ تھا۔ سڑک کے اختتام پر ملک محل کے ذاتی باغات کا سلسلہ شروع تھا جو کافی وسیع رقبے پہ پھیلا ہوا تھا۔

اس کے اشارے پہ ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ ذیان نیچے اتر آئی۔ نمناں اور فریدہ نے بھی اس کی تقلید کی۔ ذیان گھوم پھر کے باغ دیکھ رہی تھی۔ یہاں آم کی فصل کاشت کی گئی تھی۔ فریدہ نمناں کے ساتھ مل کر آم جمع کرنے لگی' جبکہ ذیان باغ کے بیچوں بیچ گزرنے والی پانی کے نہر میں پاؤں لٹکا کے بیٹھ گئی۔ گرمی کے موسم میں گھنے درختوں کے سائے میں ٹھنڈا پانی اسے ایک عجیب سے لطف سے ہم کنار کر رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جس نے گرمی کی شدت کو کافی قابو میں کیا ہوا تھا۔

ایبک صبح سے باغ میں تھا۔ وہ آج کل روزانہ اس طرف آتا تھا' کیونکہ تھوڑے دنوں تک پھل کو درختوں سے اتارنے کا کام شروع کیا جانے والا تھا۔ وہ باغ کے آخری سرے سے واپس آ رہا تھا جب اس کی نظر نمناں پہ پڑی۔ ذیان اور فریدہ کو اس نے بعد میں دیکھا۔ اس کے ساتھ باغ میں کام کرنے والا ملازم بھی تھا اسے واپس بھیج کر وہ کچے راستے سے اوپر ذیان کی سمت آیا۔

فریدہ اور نمناں اسے سامنے دیکھ کر الرٹ ہو گئیں۔ ایبک کا رخ زیان کی سمت تھا۔

"ادھر آنے کا موڈ تھا تو مجھے بتایا ہوتا۔ میں خود لے آتا آپ کو۔" ایبک زیان کے پیچھے درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔ خوشگوار موسم اس وقت کچھ اور بھی خوشگوار معلوم ہو رہا تھا۔ زیان کی سفید سفید پنڈلیاں پانی سے جھانک رہی تھیں۔ لمبے بالوں کا آبشار حسب معمول اس کی کمر کو بوسے دے رہا تھا۔ وہ ایبک کی ہونے والی بیوی تھی وہ اسے اس وقت خاص نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ دل کی دھڑکن اور تال دونوں پہ احساس ملکیت کا تازہ تازہ خمار چھایا ہوا تھا۔

نمناں درخت کی اوٹ میں تھی۔ ایبک اور زیان دونوں اس کی نگاہوں کی گرفت میں تھے اور اس ٹائم زیان کی سمت اٹھی نگاہوں میں بے پناہ نفرت کا جذبہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

"اب تو ہم آ گئے ہیں۔" نمناں کو زیان کے اس جملے سے غرور کی بو آئی تھی۔ اس نے ترچھی نگاہ زیان پہ ڈالی۔

پھر ملک ایبک کی سمت دیکھا جو سفید کڑکڑاتے لٹھے کے کرتے شلوار میں ملبوس اپنی تمام تر مردانہ وجاہت کے ساتھ ماحول پہ چھایا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے زیان کے پیچھے درخت کے تنے سے ٹیک لگائی ہوئی تھی۔ اپنی پشت پہ وہ اس کی نگاہوں کی تپش محسوس کر چکی تھی پر نمناں کی نفرت سے بھرپور نگاہیں اس سے نہاں تھی۔

اس نے فوراً" دونوں پاؤں پانی سے باہر نکالے۔ نازک سی سینڈل پاس ہی پڑی تھی۔ اس نے گیلے پاؤں جلدی جلدی سینڈلز میں ڈالے۔

"میں واپس جا رہی ہوں۔" زیان کی مخاطب نمناں اور فریدہ تھی۔ ایبک کو تو اس نے ذرہ بھر اہمیت نہ دی تھی۔ ایبک کی موجودگی میں وہ یہاں ایک پل بھی رکنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

ملک ایبک کو پہلی بار شدید توہین کا احساس ہوا۔ مانا کہ حسن میں ادا نخرا اور بانکپن ہوتا ہے اپنے ہونے کا غرور ہوتا ہے پر وہ تو سراسر اس کی مردانہ انا اور عزت نفس کو مجروح کر رہی تھی۔ حالانکہ اس کا ایبک کے ساتھ رشتہ طے ہو چکا تھا۔ مستقبل قریب میں وہ ایک دوسرے کے جیون ساتھی بننے والے تھے۔ ایسے میں زیان کی بے رخی بیگانگی کی حد سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔

مانا کہ وہ عنیزہ چچی کی بیٹی تھی پر وہ ان کے ہاتھوں اور گود میں نہیں پلی بڑھی تھی نہ ان کے زیر سایہ پروان چڑھی تھی۔ "ملک محل" میں ابھی اسے آئے بہت زیادہ وقت نہیں گزرا تھا اس لیے عادات مزاج اور طبیعت کا بھی ایبک کو خاص اندازہ نہ تھا۔

کہیں ملک جہانگیر نے اس کا رشتہ طے کرنے میں جلد بازی سے تو کام نہیں لیا۔ ایبک اسی پہلو پہ سوچ رہا تھا۔ زیان اسے دیکھتے ہی افراتفری میں یہاں سے گئی تھی ورنہ وہ اچھے خاصے موڈ میں تھی۔ ایبک کا ارادہ تھا کہ وہ واپس جا کر عنیزہ چچی سے اس سلسلے میں بات کرے گا۔

زیان کے آج کے اس عمل سے اسے اپنی عزت نفس اور خودداری مجروح ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ زیان کے ساتھ آئی فریدہ اور نمناں نے بھی زیان کا یہ انتہائی رد عمل نوٹ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

افشاں بیگم نے ایک نوکرانی کے ہاتھ پیغام بھیج کر زیان کو بلوایا تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں غلطاں ان کے پاس پہنچی کہ جانے کیوں اس طرح پیغام بھیج کر مجھے بلوایا گیا ہے۔ افشاں بیگم ایک نقشین صندوق کھولے بیٹھی تھیں۔

"آؤ آؤ میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔" وہ اسے دیکھ کر مسکرائیں اور پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ صندوق میں ہاتھ مار کر کچھ نکال رہی تھیں۔ زیان نے دیکھا وہ سونے کے جگ مگ کرتے زیورات تھے۔ انہوں نے ایک جڑاؤ کنگن نکالا اور اس کی کلائی میں پہنا دیا۔

"یہ میرے ایبک کی دلہن کے لیے" انہوں نے پیار سے اس کا ماتھا چوما "میں نے تمہارے لیے رکھا

تھا۔ کہ بات طے ہو جائے گی تو تمہیں بتاؤں گی۔ لیکن بھول بھال گئی۔ آج ادھر آئی تو یاد آیا" انہوں نے وضاحت کی اور اسے دیگر زیورات دکھانے لگیں۔ ان میں سے کچھ ان کی مرحومہ ساس نے شادی کے موقعے پہ انہیں دیئے تھے۔ اور کچھ ملک جہانگیر نے خریدے تھے' باقی ان کے میکے والوں کی طرف سے تھے۔ افشاں بیگم اسے ساتھ ساتھ زیورات کی تفصیل بتا رہی تھیں' جب ایبک سیل فون کان سے لگائے کمرے میں داخل ہوا۔ ذیان کو اچانک یہاں اپنے گھر میں دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا مگر بہت جلد اس نے اپنے تاثرات چھپا لیے۔

"امی معاذ کا فون ہے لیں بات کریں۔" اس نے سیل فون افشاں بیگم کی طرف بڑھایا۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ ذیان کے مقابل بیٹھ گیا۔

"فائن آپ سنائیں؟" وہ رسمی انداز میں بولی۔

"کیا سناؤں؟" وہ بے تکلف ہوا۔ اس سے پہلے کہ ذیان کوئی جواب دیتی افشاں بیگم نے سیل فون ذیان کے کان سے لگا دیا۔ معاذ اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا وہ پہلی بار اس کی آواز سن رہی تھی۔ معاذ شریر اور زندہ دل تھا فون پہ بات کرتے ہوئے اسے چھیڑنے لگا۔ ذیان کو تھوڑی دیر میں ہی گھبراہٹ ہونے لگی۔ معاذ کی ہر بات کے جواب میں اس کے منہ سے ہوں ہاں سے زیادہ کوئی آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ بہت مشکل سے اس نے اللہ حافظ کہہ کر معاذ کی شرارتوں سے دامن بچایا۔ اب وہ ایبک سے بات کر رہا تھا۔

"بھائی جان آپ نے چپکے چپکے سب کام کر لیے اور مجھے انوائیٹ کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔" وہ پیار بھرے شکوے کر رہا تھا۔

"چپکے چپکے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ تمہیں بتایا تو تھا کہ سب بہت اچانک ہوا۔ امی نے عین وقت پہ مجھے بتایا" وہ اپنی مخصوص گہری مردانہ آواز میں بولا۔ ذیان اس کے مقابل ہی تو بیٹھی تھی۔

معاذ کی آواز بخوبی اس کی سماعتوں تک رسائی حاصل کر رہی تھی۔

"ویسے بھائی جان ہماری بھابھی بہت خوب صورت ہیں میں تو فوٹو گرافس دیکھ کر ہی فدا ہو گیا ہوں۔ لال دوپٹے میں مغلیہ شہزادی لگ رہی تھیں۔ دل کر رہا ہے اڑ کر پاکستان آجاؤں۔ مگر میرے پروگریس ٹیسٹ ہو رہے ہیں' نہیں آسکتا" معاذ کا لہجہ بات کرتے کرتے آخر میں اداس ہو گیا۔

"ڈونٹ وری تم شادی پہ آجانا میں کوشش کروں گا شادی تمہاری چھٹیوں کے دوران ہو۔" ایبک نے معاذ سے بات کرتے ہوئے ساتھ بیٹھی ذیان پہ ایک نظر ڈالی تو اس نے بے اختیار پہلو بدلا۔

"بھائی جان میں کیا سن رہا ہوں۔" معاذ حیرت سے بولا۔

"کیا مطلب؟"

"آپ اور شادی کا ذکر! آپ تو شادی کے نام پہ دامن بچاتے تھے ... گریٹ! اس کا مطلب ہے کہ میری بھابھی نے آپ کو تبدیل کر دیا ہے" معاذ کے لہجے میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایبک مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

افشاں بیگم اپنے زیورات کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔

نوکرانی نے چائے کے ساتھ انواع واقسام کی خورد و نوش سے بھری ٹرے ذیان کے سامنے رکھی تو ایبک نے اسے کھانے کا اشارہ کیا۔

"میں ابھی کچھ دیر پہلے لنچ کر کے آئی ہوں اب کچھ بھی نہیں کھا سکوں گی" اس نے انکار کیا۔

"لیکن یہ سب خاص الخاص اہتمام آپ کے لیے کیا گیا ہے۔" ایبک نے کھانے پینے کی چیزوں کی سمت اشارہ کیا۔

"میں چائے نہیں پیتی۔" اس نے منہ بنایا۔

"لیکن ابھی آپ کو چائے پینی پڑے گی۔" ایبک بولتے ہوئے اس کے چہرے کے تاثرات بھی نوٹ کر رہا تھا۔ افشاں بیگم زیورات سے نمٹ کر ان کے پاس آکر بیٹھیں' تو ذیان نے قدرے سکون کا سانس لیا۔

چائے پینے کے بعد وہ عصر کی نماز پڑھنے میں

مصروف ہو گئیں۔ اب وہاں صرف ذیان اور ایبک تھے، وہ جانے کے لیے اٹھی تو ایبک نے اچانک اپنا پاؤں آگے کر دیا۔ وہ گرتے گرتے سنبھلی۔

"بیٹھئے ناں تھوڑی دیر اور" وہ بالکل انجان بنا ہوا تھا۔

"نہیں اب میں گھر جاؤں گی" اس نے مصلحت کے تحت نرمی اپنائی۔ تب ایبک نے اپنا پاؤں راستے سے ہٹایا۔

☼ ☼ ☼

یناں یعنی رنم لیٹی ہوئی تھی۔ باہر سناٹا طاری تھا۔ کسی بھی قسم کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے تکیہ دونوں بازوؤں اور ہاتھوں کے مابین سختی سے دبایا ہوا تھا۔ اس کے دانت بھی سختی سے ایک دوسرے پہ جمے تھے جیسے وہ سخت خلفشار اور اذیت کا شکار ہو۔ بات اذیت والی ہی تھی۔ وہ اپنی فضول ضد کے پیچھے گھر بار، سب سہولیات کو ٹھوکر مار کر نکل آئی تھی۔ قسمت کی ستم ظریفی تھی وہ خود مالکن ہوتے ہوئے یہاں اس "ملک محل" میں معمولی نوکرانی کی حیثیت سے رہ رہی تھی۔ وہ ہرگز مطمئن نہیں تھی۔

جب سے ذیان یہاں آئی تھی۔ اس کا سکون جیسے ختم ہو کے رہ گیا تھا۔ رنم کی نگاہوں میں اپنے سوا کوئی کچھ بھی نہیں تھا۔ احمد سیال کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے اس نے بہت رعائتیں حاصل کی تھیں۔ پھر رہی سہی کسر بے پناہ دولت اور اختیار نے پوری کر دی تھی۔

گھر، خاندان، یونیورسٹی دوستوں میں ہر جگہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ وہ جیسے کسی ریاست کی بے تاج ملکہ ہو۔ "ملک محل" میں اس کی وہ حیثیت نہیں تھی یہاں کی شہزادی ذیان تھی۔ مغرور اور کسی کو خاطر میں نہ لانے والی بیٹھے بٹھائے یہاں کی مالک بن گئی تھی۔ فریدہ اور دیگر نوکرانیوں نے ذیان کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کیے تھے۔ کہ وہ ملک ارسلان کی بیٹی نہیں ہے اور اپنی پیدائش کے بعد پہلی بار حویلی میں آئی ہے۔ کیا قسمت پائی تھی اس نے۔ حویلی آتے ہی سب پہ دھاک بٹھا دی تھی۔ افشاں بیگم اس کے حسن سے متاثر اور ملک جہانگیر اسے بیٹی کے روپ میں دیکھتے۔ ملک جہانگیر کو ــــــ وہ یہاں دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ وہ جس دن ذیان کا رشتہ مانگنے آئے تب رنم نے انہیں پہلی بار دیکھا اور دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ پاپا کے وہی دوست ہیں، جن کا ذکر انہوں نے خاص طور پہ کر کے کہا تھا کہ یہ اپنے بیٹے کے لیے تمہارا رشتہ مانگ رہے ہیں۔ وہ پہلے سے کچھ کمزور لگ رہے تھے لیکن سوفی صد پاپا کے وہی دوست تھے جن کی وجہ سے وہ گھر چھوڑ کر یہاں پڑی تھی۔

انہوں نے رنم پہ کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اور وہ ایک بار کے علاوہ پھر ڈرائنگ روم میں آئی بھی نہیں۔ وہ اسے دیکھ لیتے تو بھی پہچان نہ پاتے کہ یہ احمد سیال کی بیٹی ہے۔ اسے دیکھ کر تو کوئی بھی نہ پہچان پاتا۔ سراپا وہ بدل گئی تھی۔ رنم کو سوفی صد یقین تھا کہ ملک جہانگیر نے ایبک کے لیے ہی اس کا رشتہ مانگا ہو گا۔ اس ایبک کے لیے، جو غریبوں اور انسانیت کا درد اپنے دل میں رکھتا تھا۔ وہ اپنے طبقے کے عام نوجوانوں سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی پوری شخصیت سے متاثر کن وقار جھلکتا۔

یہی ایبک ذیان کو بغیر کسی کوشش اور محنت کے مل رہا تھا اسے رنم کی طرح گھر چھوڑ کر در بدر نہیں ہونا پڑا تھا۔ پپا صرف اس کی وجہ سے دنیا سے چلے گئے۔ کاش وہ فضول سی ضد کے پیچھے اپنا گھر نہ چھوڑتی، پاپا کا دل نہ دکھاتی۔ اب وہ لوٹ کر کیسے جائے گی۔ ہمت کر کے چلی بھی جاتی ہے تو کون سا پاپا اس دنیا میں ہیں۔ ہر چیز پہ قبضہ ہو چکا ہو گا، وہ بالکل محروم اور خالی دامن ہے۔ اپنے پاپا کی شہزادی ــــ نوکرانی بن گئی ہے۔ اسی ملک محل میں نوکرانی بنی ہے، جبکہ قدرت اسے مالک بنانا چاہ رہی تھی۔ بھلا کیا ملا اسے؟ رنم روئے جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

انڈسٹریل ہوم مکمل ہو چکا تھا۔ ایبک ارسلان چچا

کی طرف آیا تھا۔ عنیزہ چچی کی بات اسے یاد تھی انہوں نے نیناں کے بارے میں خاص طور پہ مدد کی تلقین کی تھی کہ بے سہارا اور بے آسرا لڑکی ہے' پڑھی لکھی بھی ہے۔ بہت کام آئے گی۔ یہاں چھوٹے موٹے کاموں میں لگی رہتی ہے تم اسے انڈسٹریل ہوم میں کہیں نہ کہیں لگا دینا۔

وہ عنیزہ چچی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ذیان موٹی سی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی۔ ایبک کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اس نے اپنی توجہ کتاب کی طرف پھیر لی تھی۔ فریدہ' عنیزہ کی ہدایت پہ نیناں کو بلا کے لے آئی تھی۔ اب وہ ملک ایبک کے سامنے بیٹھی تھی اور وہ اسے انڈسٹریل ہوم کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

"میں دو دن بعد آپ کو لینے آؤں گا آپ چل کر دیکھ لیجیے گا سب کام۔ اگر سمجھ میں آئے تو ٹھیک ہے۔"

"وہ نہیں نہیں میں سب کام سمجھ لوں گی۔" نیناں فوراً" بولی جیسے اس نے ہاں نہ کی تو وہ اپنا ارادہ بدل دے گا۔

"ایبک' نیناں پڑھی لکھی ہے' بہت جلدی سمجھ لے گی" عنیزہ نے بھی اس کی حمایت کی تو ذیان نے نظر اٹھا کر نیناں کی سمت دیکھا۔ وہ بے پناہ خوش نظر آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر چلی گئی۔ اس کی واپسی چائے اور دیگر لوازمات سمیت ہوئی۔

اس نے ٹیبل پہ سب کچھ طریقے سے رکھا اور خود بھی ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ ایبک' عنیزہ کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ ذیان جو سر جھکائے کتاب میں محو تھی اچانک اس کی نگاہ نیناں کی طرف اٹھی۔ وہ پوری دلچسپی سمیت' ملک ایبک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ نظر بچا کر یہ سب کر رہی تھی پر ذیان سے اس کی یہ چوری مخفی نہیں رہ پائی تھی۔

ذیان نے دوسری نگاہ ایبک پہ ڈالی جو چائے پیتے ہوئے عنیزہ کے ساتھ باتیں کر رہا تھا وہ قطعا" نیناں کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ ذیان نے دوبارا نیناں کی طرف دیکھا تو گھبرا سی گئی اور فورا" چلی گئی۔ ذیان کو یہ سب عجیب سا لگا۔ اس جذبے کو اس احساس کو وہ کوئی نام نہیں دے پائی۔

☼ ☼ ☼

نیناں' ملک ایبک کے ساتھ جانے کے لیے بالکل تیار تھی۔ آج اس نے اپنا سب سے اچھا سوٹ پہنا تھا جو عنیزہ نے ہی اسے دلوایا تھا۔ شکل و صورت ویسے بھی اچھی تھی تھوڑی توجہ سے اور بھی جاذب نظر لگنے لگی تھی۔

ملک ایبک کی شاندار گاڑی میں بیٹھ کر جاتے ہوئے اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ایک بار پھر سے رنم سیال بن گئی ہے۔ کام سٹ یونیورسٹی کا سرسبز گراؤنڈ' اپنی گاڑی' تیز رفتار ڈرائیونگ' سب سے پہلے پہنچنے کی دھن' پھر سے یہ سب اسے یاد آ رہا تھا۔ ایک حسرت نے انگڑائی لی کہ کاش سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔ اس نے چور نگاہوں سے آگے بیٹھے ملک ایبک کی پشت کی طرف دیکھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اس کے پسندیدہ پرفیوم کی خوشبو پوری گاڑی مہک رہی تھی۔ ہر معاملے میں اس کا ذوق اعلیٰ تھا۔

اسے پتا ہی نہیں چلا گاڑی ایک دم رکی تو وہ اپنے خیالوں سے باہر آئی۔ سامنے خوب صورت سے احاطے میں تازہ پودے لگائے گئے تھے۔ ایبک نے اسے گاڑی سے اترنے کا اشارہ کیا۔ اس کے پیچھے پیچھے چلتی وہ اس تازہ تازہ تعمیر کی گئی عمارت میں داخل ہوئی۔ مشرقی دیوار کے ساتھ ایک کمرا آفس کے طور پہ سیٹ کیا گیا تھا۔ ملک ایبک اسے ساتھ لیے سیدھا ادھر آیا اور کرسی پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"اب آپ یہاں کی انچارج ہیں' میں یہ سب معاملات آپ کے سپرد کرنے لگا ہوں۔ امید ہے آپ بخوبی سنبھال لیں گی۔ ایک دو دن میں باقی سب سامان بھی آ جائے گا۔ ابھی تھوڑی دیر میں انڈسٹریل ہوم میں داخلے کی خواہش مند خواتین اور لڑکیاں آنا شروع ہو جائیں گی۔ آپ نے سب کے نام درج کرنے ہیں' پھر

طریقہ کار اور اصول کے بارے میں بتاتا ہے" وہ اسے انتظامی امور کے بارے میں گائیڈ کرنے لگا۔ نینال پوری توجہ سے سن رہی تھی۔ یہ کام اسے بالکل نیا اور دلچسپ لگ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایبک کے کہنے کے مطابق عورتیں اور لڑکیاں آنا شروع ہو گئیں۔ یہ تعداد خاصی حوصلہ افزا تھی۔ ایبک کچھ دیر وہاں رکا پھر سب کچھ اس کے سپرد کر کے خود شہر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اسے سلائی کڑھائی کے اس مرکز کے لیے مشینوں اور دیگر اشیاء کی خریداری کرنی تھی ساتھ ایک دو کام بھی نمٹانے تھے۔ نینال کو چھوڑ کر آنے کے بعد وہ خاصا پر امید تھا کیونکہ وہ اسے کافی سمجھ دار اور جلد سیکھنے والی لڑکی لگی تھی۔ اب وہ شہر میں بغیر کسی پریشانی کے اپنے کام سرانجام دے سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼
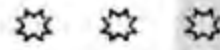
انڈسٹریل ہوم کا آغاز ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ مشینیں اور دیگر سامان آ چکا تھا۔ عورتوں کی تعداد چالیس ہو گئی تھی۔ ان میں سے دو عورتوں کو نینال نے سلائی کڑھائی کے شعبے کی انچارج بنا دیا تھا کیونکہ وہ اپنے کام میں ماہر تھیں۔ یہاں کل چھ کمرے تھے۔ ایک کمرا بطور آفس استعمال ہو رہا تھا جبکہ باقی پانچ کمروں کو شعبوں کے لحاظ سے تقسیم کر دیا گیا تھا۔

نینال، داخلے کی خواہشمند خواتین کا اندراج کرتی اور انتظامی معاملات دیکھتی۔ لڑکیوں عورتوں میں وہ "میڈم" کے نام سے مشہور ہو رہی تھی۔ اس کام میں اسے بے پناہ مزا آ رہا تھا۔ شروع میں وہ ایبک کے ساتھ آتی رہی۔ وہ خود مصروف رہتا تھا اس لیے نرمی سے اسے منع کر دیا کہ وہ روز اسے ساتھ نہیں لا سکتا چنانچہ وہ خود اب آتی جاتی تھی۔

عنیزہ بیگم نے بہت کہا کہ ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ مگر اس نے طریقے سے منع کر دیا اور پیدل آنے جانے لگی۔ مناظر فطرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ آتی اور جاتی۔ وقت گزرنے اور راستہ طے ہو جانے کا پتا ہی نہ چلتا۔

صبح دس بجے تک وہ انڈسٹریل ہوم میں موجود ہوتی۔ شام چار بجے چھٹی ہوتی۔ یہ وقت اس کا بہت اچھا گزرتا۔ اپنا آپ معتبر لگتا۔ ملک ایبک نے تو اس کی کھوئی ہوئی خودداری اور عزت نفس بحال کر دی تھی۔ اب وہ ملک محل میں کام کرنے والی عام سی نوکرانی نہیں رہی تھی بلکہ انڈسٹریل ہوم کی انچارج تھی۔ ملک ایبک نے اس کی معقول تنخواہ بھی مقرر کر دی تھی۔ ہفتے میں ایک دن کی چھٹی تھی۔ طبیعت کی خرابی یا کسی ایمرجنسی کی صورت میں وہ چھٹی کرنے کی حق دار تھی۔

☼ ☼ ☼

معاذ کا سمسٹر ختم ہونے کے قریب تھا وہ پاکستان آنے اور اپنی ہونے والی بھابھی سے ملنے کے لیے سخت بے قرار تھا۔ ادھر ملک جہانگیر، ایبک کی شادی کا پروگرام بنا رہے تھے پر وہ شادی کو موخر کرنے کا بول رہا تھا۔ ابھی بھی اس مسئلے پہ ملک جہانگیر، افشاں بیگم اور ایبک تینوں میں بحث ہو رہی تھی۔

"ایبک اب کس بات کی دیر ہے۔ ماشاء اللہ تم اپنا کما رہے ہو کسی کے محتاج نہیں ہو" افشاں بیگم نے ناراضی سے لاڈلے بیٹے کو دیکھا۔

"امی آپ کو پتا تو ہے کہ میں انڈسٹریل ہوم کے ساتھ اب اسکول کی تعمیر کو بھی مکمل کروانا چاہتا ہوں۔ میں اس کے بعد شادی کروں گا۔" وہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"تم پہلے شادی کرو باقی بعد میں چلتا رہے گا" ملک جہانگیر خاصے رسان سے گویا ہوئے۔

"ٹھیک ہے بابا جان میں بات کروں گا اس پہ آرام سے۔" اس نے بحث ختم کرنی چاہی۔ وہ جس وجہ سے شادی کو ٹال رہا تھا۔ افشاں بیگم اور ملک جہانگیر دونوں اس سے لاعلم تھے۔

"جیسے تمہاری مرضی" ملک جہانگیر نے جیسے ہار مان لی۔

"ویسے تمہارا اسکول کب تک مکمل ہو گا؟" افشاں بیگم نے پوچھا۔ "ابھی ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔" اس نے مبہم سا جواب دیا۔

☆ ☆ ☆

عنیزہ کی پوری بات سننے کے بعد زیان نے جھکا سر اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں عنیزہ کی طرف اٹھیں۔ ان آنکھوں میں عجیب سی بیگانگی اور سرد مہری تھی۔ ہونٹوں پہ مبہم سی مسکراہٹ رقصاں تھی جسے عنیزہ کوئی معنی پہنانے سے قاصر تھیں۔ زیان انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دل میں وہ بے پناہ خوش ہو رہی تھی کہ اس کا رویہ اب "ملک محل" میں بسنے والوں پہ اثر انداز ہونے لگا ہے۔ عنیزہ کی حالیہ گفتگو اور فکر مندی اس کے رویے کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

"دیکھو میں بہت خوش ہوں۔ تم یہاں میرے پاس آگئی ہو اور ہمیشہ کے لیے میرے پاس رہو گی۔ لیکن تمہیں اپنے اور ایبک کے مابین رشتے کو نہیں بھولنا چاہیے۔ اگر وہ یہاں آتا ہے تو اس کے ساتھ اچھے طریقے سے بات کرو۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہتی کہ تم اپنی مشرقیت اور نسوانیت کو فراموش کر دو مگر ایبک کو منفی خیالات دل میں لانے کا موقعہ بھی مت دو۔ اس نے مجھ سے بات کی ہے کہ زیان شاید اس رشتے سے خوش نہیں ہے میں نے اسے مطمئن کر دیا ہے اور یہ بھی سوچا ہے کہ تمہاری شادی جلدی ہونی چاہیے۔" زیان نے ان کے آخری جملے پہ بے اختیار پہلو بدلا۔

"جی ٹھیک ہے۔" ہمیشہ روز اول کی طرح وہ مختصراً" بولی تو عنیزہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ کر بیٹھ گئیں۔

"تم خوش رہا کرو" انہوں نے پیار سے اس کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا تو زیان کے اندر بگولے سے اٹھنے لگے۔

"اور ہاں رات کو تمہارے لیے معاذ کی کال آئی تھی تم سو رہی تھیں میں نے نہیں اٹھایا۔ ہو سکتا ہے آج وہ پھر تمہیں کال کرے۔ اس سے بات کر لینا۔" اس کے بالوں میں عنیزہ نے ہاتھوں سے کنگھی کرتے ہوئے بتایا۔

"جی ٹھیک ہے کر لوں گی" وہ پھر اسی انداز میں بولی۔ عنیزہ کی اتنی ساری باتوں کے جواب میں اس کے پاس ایک آدھ جملہ ہی تھا۔ وہ بحث یا تکرار بھی تو نہیں کرتی تھی جو کہا جاتا مان لیتی۔ عنیزہ نے تھک ہار کر نظریں چھت پہ جما دیں۔

☆ ☆ ☆

ملک ایبک' آفس میں نمناں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

"آپ کا انڈسٹریل ہوم کیسا چل رہا ہے؟" وہ دوستانہ انداز میں باتیں کر رہا تھا۔

"شکر ہے اچھے طریقے سے کام ہو رہا ہے۔ ایبک کے اس طرح اچانک یہاں آنے سے وہ خوش ہو گئی تھی۔

"کوئی مشکل تو نہیں ہے؟"

"نہیں کوئی مشکل نہیں ہے۔" پھر بھی کوئی مسئلہ ہو تو مجھے ضرور بتایئے گا۔"

"جی ایسا ہی ہو گا" وہ سر ہلاتے بولی۔ لان کے خوب صورت پرنٹڈ شلوار قمیض میں ملبوس نمناں کو' ایبک نے غور سے دیکھا۔

"کام کرنے میں کوئی دشواری ہو تو کاریگر عورتوں میں سے آپ کسی کو ساتھ رکھ سکتی ہیں۔"

"کام بہت اچھا چل رہا ہے۔ انڈسٹریل ہوم کی شہرت اردگرد کے دیہاتوں تک بھی پہنچ گئی ہے۔ چھ لڑکیاں آئی ہیں میرے پاس وہاں سے۔ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو بہت جلد سب کمرے بھر جائیں گے۔ میں بہت پر امید ہوں لڑکیاں بہت محنت سے کام کر رہی ہیں۔"

"ان شاء اللہ ان کو اپنی محنت کا معاوضہ بھی ملے گا۔" ایبک مضبوط لہجے میں بولا۔

"میں بہت خوش ہوں آپ نے مجھے یہاں کام کرنے کا چانس دیا" وہ ممنون لہجے میں بولی تو ایبک ایک

بار پھر اسے دیکھنے پہ مجبور ہو گیا۔ اس نے نیناں کے الفاظ اور لہجے پہ غور کیا۔

"آپ یہاں مطمئن ہیں میرا مطلب ہے اس کام سے؟" ایبک نے اچانک سوال کیا۔

"میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہاں مجھے اتنی عزت ملے گی۔ یہ زندگی کا ایک نیا رخ ہے میرے لیے' پر میں خوش ہوں" وہ بہت شائستہ انداز میں بولی تو ایبک ایک بار پھر الجھنے لگا۔ اسے یقین ہونے لگا کہ لان کے عام سے سوٹ میں ملبوس اس کے سامنے جو لڑکی بیٹھی ہے وہ عام سی ہرگز نہیں ہے۔ اس کا لہجہ و انداز' شائستگی سب کچھ اور ہی ظاہر کرتی تھی۔

"ویسے آپ کی تعلیم کتنی ہے کہاں سے پڑھا ہے آپ نے؟"

"میں نے کام ــــ میرا مطلب ہے گورنمنٹ اسکول سے صرف میٹرک کیا ہے۔" جتنا اچانک سوال تھا اتنا اچانک جواب دیتے دیتے وہ رک گئی اور فوراً" گورنمنٹ اسکول کا نام لے دیا۔ ملک ایبک چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ نیناں نے جس طرح اچانک ہڑبڑا کر جواب دیا' وہ اسے شک میں ڈالنے کے لیے کافی تھا۔

"ویسے آپ میٹرک پاس لگتی نہیں ہیں۔" ایبک اسے گہری نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے گھبرا کے پہلو بدلا اور گھبراہٹ زائل کرنے کے لیے مسکرانے لگی۔ اسے ایبک کی گہری نگاہوں سے ڈر لگ رہا تھا۔

نیناں یعنی رنم ایبک کے جانے کے بعد گہری سوچ میں گم تھی۔

عنیزہ اور ملک ارسلان اسے ملک محل میں ساتھ لائے تھے۔ اسے گھر میں جگہ دی' اس کے ساتھ محبت سے پیش آئے کبھی اسے بے سہارا' بے آسرا نہیں سمجھا نہ تحقیر اور ذلت والا سلوک کیا۔ ان کے اعلا ظرف اور بامروت ہونے کے لیے ان کا نرم رویہ ہی کافی تھا۔ وہ گھر سے ایک معمولی سی بات پہ ناراض ہو کر نکلی تھی۔ اس کی یہ احمقانہ بہادری اور بے وقوفی اسے ہوٹل میں کسی بھی بڑے مسئلے میں پھنسا سکتی تھی اگر ملک ارسلان اور عنیزہ وہاں رحمت کے فرشتے بن کر نازل نہ ہوتے۔ پھر وہ اسے اپنے ساتھ گاؤں لے آئے۔ "ملک محل" کے مکینوں نے اسے پیش آنے والی بہت سے مشکلات سے بچالیا تھا۔ ملک ایبک نے انڈسٹریل ہوم کی ذمہ داری اس کے سپرد کر کے اس پہ مکمل اعتماد کا ثبوت دیا تھا۔ اب اسے گھر کی بہا کی یاد بھی کم کم آتی۔ اپنی ہٹ دھرمی اور بے وقوفی کو بھی وہ بھول گئی تھی۔

اب اسے ملک ایبک کی ذہانت سے خوف آرہا تھا۔ اگر اس نے نیناں کی اصلیت پکڑلی تو کیا ہو گا۔ اس نے اپنا بالوں کا اسٹائل' لب و لہجہ' پہناوا سب کچھ ہی تو بدل لیا تھا۔ اس کے باوجود بھی جانے کیوں ملک ایبک کو اس پہ شک ہو گیا تھا۔ اپنے اس شک کا اظہار اس نے کسی پہ بھی عیاں نہیں کیا تھا۔ خاموشی سے نوٹ کر رہا تھا۔ نیناں کا لب و لہجہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ اعلا تعلیمی اداروں میں پڑھتی رہی ہے۔ اس کا انداز' بات چیت' رکھ رکھاؤ' ایک ایک بات اس کی چغلی کھاتی تھی کہ وہ بے سہارا یا بے آسرا نہیں ہے۔ عنیزہ چچی نے بھی زیادہ کھل کر کچھ نہیں بتایا تھا۔

✡ ✡ ✡

ملک ایبک زیان کے رویے کی وجہ سے الجھا ہوا تھا۔ عنیزہ چچی کی وضاحت اور یقین دہانی اسے قائل نہیں کرپائی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ زیان کی رضامندی جانے بغیر اچانک رشتہ طے ہوا اور وہ ذہنی طور پہ ابھی تک تسلیم نہیں کرپائی ہے۔ اس لیے وہ شادی کو موخر کرنا چاہتا تھا تاکہ زیان بھی تب تک تیار ہو جائے۔

وہ جب بھی ارسلان چچا کی طرف جاتا' زیان اسے دیکھتے ہی سرد سے تاثرات چہرے پہ سجالیتی جیسے باقی دنیا اس کے قدموں میں ہو اور کسی کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ کبھی کبھی اس کے تاثرات میں گرم جوشی بھی جھلک آتی پر ایسا بہت کم ہوتا۔ اکثر اوقات وہ گم صم رہتی۔ ایبک کو دیکھ کر بھی اس کے تاثرات سے ایسا نہیں لگا کہ وہ اس کی پرسنالٹی' مردانہ وجاہت اور وقار سے متاثر ہوئی ہو۔

اس کے ایک ایک انداز سے "میں ہی میں ہوں" کا اظہار ہوتا ایک کو کبھی کبھی وہ ناراض بگڑی بچی لگتی۔ اس کی "میں" پہ ایک کو ہنسی بھی آتی۔ پر یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ اس کے لیے اپنے دل میں لطیف سے جذبات محسوس کر رہا تھا۔ ان جذبات کو ایک نے اظہار کی آنچ نہیں پہنچائی تھی ابھی تک۔ لیکن کیا سچ میں زیان اتنی ہی انجان اور لاپروا تھی جتنا خود کو ظاہر کر رہی تھی۔ ایسا ممکن تھا کہ محبت کی جس میٹھی میٹھی آگ میں نازک جذبوں کی تپش سے ایک پگھلا جا رہا تھا وہ ان سے لاعلم تھی۔ کیا ایسا ممکن تھا کہ زیان کو کچھ خبر ہی نہ ہو۔ وہ اتنی ہی لاعلم ہو جتنی نظر آ رہی ہو۔

ایک شادی کے بعد اسے اپنے جذبات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا اس سے پہلے شاید وہ بدک جاتی اگر وہ کچھ ایسا کرتا تو۔ جب وہ قانونی اور شرعی طور پر اسے اپنا بنا لیتا تب اظہار کرنے میں کوئی نقصان نہیں تھا۔ وہ اپنی محبت اور جذبوں کی طاقت سے اسے پگھلا لیتا۔ زیان شاید لڑکیوں کی اس قسم سے تعلق رکھتی تھی جو انجان بن کر فریق مخالف کی تڑپ سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ ورنہ ملک ایک نظرانداز کیے جانے کے قابل تو نہ تھا۔ صنف نازک کی جو نگاہیں اس کی طرف اٹھتیں۔ ان میں تعریف ہوتی' ستائش ہوتی۔ اس کی بھرپور مردانہ وجاہت سے متاثر ہونے کا جذبہ ہوتا۔ بس زیان ہی تھی جس پہ اثر نہ ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

ملک ارسلان' عنیزہ قاسم کو انتظار سونپ کر بیرون ملک جا چکا تھا۔ وہ یونیورسٹی سے آکر بولائی بولائی پھرتی ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے تمام رنگ' خوشیاں' امنگیں ملک ارسلان اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا۔ اسے سچ میں ایسا لگ رہا تھا وہ ملک ارسلان کے بغیر زیادہ جی نہیں پائے گی۔

ادھر قاسم صاحب نے اپنے دوستوں' جاننے والوں سے بیٹی کے رشتے کی پریشانی کا ذکر کیا ہوا تھا۔ وہ چاہ رہے تھے کوئی اچھا سا رشتہ ملے تو دیکھ بھال کر عنیزہ کو اپنے گھر کا کردیں۔ کیونکہ وہ اب بیمار رہنے لگے تھے۔ اللہ کے سوا کسی کا آسرا نہیں تھا۔ وہ خود اپنے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے ادھر سے بیوی کے میکے میں بھی کوئی خاص رشتہ دار نہیں تھے۔ وہ بھی ان کی طرح اکلوتی تھیں۔ کینسر کے موذی مرض کے ہاتھوں لاچار ہو کر وہ ان کا ساتھ چھوڑ چکی تھیں تب سے عنیزہ ان کی زندگی کا محور تھی۔ وہ اس کے لیے ماں اور باپ دونوں کا رول ادا کر رہے تھے۔ اسے تعلیم دلواتے ہوئے یونیورسٹی تک پہنچا دیا تھا اب ان کی دلی خواہش تھی کہ بیٹی اپنے گھر کی ہو جائے۔ دوستوں' جاننے والوں نے جو رشتے اب تک دکھائے تھے ان میں سے کوئی بھی انہیں اس حد تک پسند نہیں آیا تھا کہ وہ عنیزہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما دیتے۔ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں تھے۔

☼ ☼ ☼
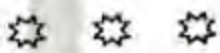
وہ غنودگی میں تھی جب اس کے کمرے کا دروازہ زور زور سے بجایا گیا۔ باتیں کرنے کی بھی آواز آ رہی تھی۔ ان میں سے ایک آواز تو عنیزہ کی تھی جبکہ دوسری نامانوس اجنبی مردانہ آواز تھی۔ اس نے دوپٹے کی تلاش میں بیڈ پہ ادھر ادھر ہاتھ مارا۔ دوپٹا تکیے کے پاس پڑا تھا۔ اس نے اٹھا کر کندھے پہ ڈالا۔ کچھ دیر قبل ہی تو وہ سوئی تھی ابھی سہ پہر کے صرف چار ہی تو بجے تھے لیے دوپہریں کٹنے کا نام نہ لیتی تھیں تھک ہار کر وہ سو جاتی۔

پتا نہیں اس طرح دروازے پہ دستک دینے والا کون تھا اس نے سوچتے ہوئے دروازہ کھولا۔ عنیزہ کے ساتھ نوجوان لڑکا کھڑا تھا سرخ و سفید رنگت اور دلکش مردانہ نقوش لیے وہ لڑکا زیان کو دیکھے جا رہا تھا وہ جھینپ گئی تھی کیونکہ اس کا انداز بے پناہ بے تکلفی لیے ہوئے تھا پر عنیزہ بالکل پرسکون نظر آ رہی تھیں۔

"تو یہ ہیں ہماری بھابھی زیان یعنی چاند کا ٹکڑا۔" آنے والے نے بڑی بے تکلفی سے اس کا ہاتھ خود ہی

پکڑ کر مصافحہ کیا اور پرجوش انداز میں خیر خیریت دریافت کی۔

چند منٹ بعد وہ زیان کے کمرے میں بیٹھا ہنس ہنس کر پاکستان آنے کے بارے میں بتا رہا تھا۔ یہ معاذ تھا ٗ ملک ایبک کا چھوٹا بھائی ٗ اس کا ذکر تواتر سے گھر میں ہوتا تھا۔ زیان کو اس کی بے دھڑک بے تکلفی کا سبب سمجھ میں آ گیا تھا۔

"آخری پیپر دے کر میں نے بوریا بستر سمیٹا اور پاکستان بھاگا۔ مجھے اپنی بھابھی سے ملنا تھا۔ امی جان اور بابا سے مل کر سیدھا ادھر آ رہا ہوں۔" وہ روانی سے اور مسلسل بول رہا تھا۔

زیان اسے حیرت سے دیکھے جا رہی تھی۔ معاذ ٗ ایبک کے بالکل الٹ تھا۔ اس کے آنے سے گھر میں جیسے خوشیوں کی بارات اتر آئی تھی ٗ ہر سو رونق تھی ٗ وہ اپنے نام کا ایک ہی تھا زندہ دل ٗ ہنوز سب کا دل خوش کرنے والا۔ اپنی شوخ اور ہر ایک سے جلد گھل مل جانے والی فطرت کی بدولت وہ زیان سے بھی بے تکلف ہو چکا تھا۔ آدھے گھنٹے میں ہی اس سے معلومات حاصل کر کے پوسٹ مارٹم کر چکا تھا۔

نیناں انڈسٹریل ہوم سے فارغ ہو کر گھر لوٹی تو معاذ رونق کا بازار گرم کیے بیٹھا تھا۔ اس پہ نظر پڑتے ہی معاذ نے سیٹی بجانے والے انداز میں ہونٹ سکوڑے۔

"یہ کون ہے۔ جب میں گیا تھا تب تو نہیں تھی۔ کیا کوئی نئی نوکرانی رکھی ہے۔ واہ جی یہاں رہنے والے بڑے باذوق ہو گئے ہیں۔" وہ بے تکان بولے جا رہا تھا۔ عنیزہ نے اس کی چلتی زبان کے آگے بند باندھا۔

"یہ نیناں ہے اور..." عنیزہ اس کے بارے میں ہوٹل میں ملنے والا قصہ گول کر کے باقی سب بتا رہی تھی۔ سن کر اس نے تاسف سے نیناں کی طرف دیکھا۔

"مس نیناں آپ کے بارے میں جان کر بہت دکھ ہوا ہے۔" اس کے چہرے کے تاثرات لہجے کا ساتھ دے رہے تھے۔ نیناں اس کی فراٹے بھرتی زبان سے خائف ہو گئی تھی اس لیے دانستہ منظر سے غائب ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

ملک جہانگیر نے معاذ کی آنے کی خوشی میں سب دوستوں اور خاندان والوں کی دعوت کی تھی۔ معاذ صرف چند دنوں کے لیے آیا تھا اسے اپنی ہونے والی بھابھی سے ملنے اور دیکھنے کی جلدی تھی۔ زیان پہلی بار ملک ایبک کے سارے خاندان سے مل رہی تھی۔

پرپل کلر کی میکسی میں ملبوس وہ معاذ ملک کے ساتھ پورے گھر میں گویا اڑتی پھر رہی تھی۔ وہ ایک ایک فیملی ممبر کے پاس لے جا کر اس کا تعارف کروا رہا تھا۔ معاذ نے اپنی بے تکلفی اور بے پناہ خلوص کی بدولت اجنبیت کی بھاری دیوار گرا دی تھی جو زیان نے از خود اپنے اردگرد تعمیر کر رکھی تھی۔ جو کام کوئی نہ کر سکا تھا وہ معاذ نے کر دکھایا تھا۔ زیان کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ آج اس کے چہرے پہ سختی اور اجنبیت کی بجائے نرمی اور گرم جوشی تھی۔

ایبک قدرے ہٹ کر الگ تھلگ کھڑا تھا۔ نیناں بھی وہیں چکرا رہی تھی۔ عنیزہ نے اس موقعے کے لیے اسے بہت خوب صورت اور مہنگا سوٹ دلوایا تھا۔ اس سوٹ کو زیب تن کرنے کے بعد وہ قابل توجہ بن گئی تھی۔

نیناں ٗ ملک ایبک کی سمت ایک مخصوص حصے میں موجود گھوم پھر کر چیک کر رہی تھی کہ مہمانوں کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔

ابھی تک وہ بہت پرسکون تھی کیونکہ ملک ایبک ٗ زیان کے بغیر اکیلا اس طرف کھڑا تھا۔ نیناں کا سارا سکون معاذ غارت کرنے آ پہنچا۔ اس نے زیان کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ ایبک کو تلاش کرتے کرتے وہ سیدھا اس کے پاس آ رکا۔

"لیں اپنی امانت۔ میں تعارف کروا کروا کے تھک گیا ہوں باقی کام آپ خود کریں" معاذ نے زیان کا ہاتھ بڑی معصومیت سے ایبک کے ہاتھ میں لا تھمایا اور خود نیناں کی طرف بڑھ گیا۔

"مس نیناں مجھے کچھ پینے کو دیں پیاس سے دم نکلا جا رہا ہے۔" وہ پاس پڑی کرسی پہ گرنے والے انداز میں بیٹھ گیا جیسے بری طرح تھک گیا ہو۔ اس نے مڑ کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ اس کی بے باک سی حرکت کا کیا انجام ہوا۔ وہ مزے سے نیناں کی طرف متوجہ تھا جس کی نگاہ بہانے بہانے سے ملک ایبک اور زیان کا طواف کر رہی تھی۔

ایبک نے نظر بھر کر غور سے زیان کو دیکھا وہ آج بہت قریب تھی معاذ کی شرارت سے کچھ سنہرے پل اس کی مٹھی میں قید ہونے جا رہے تھے۔ اس کا گلابی چہرہ سرخ ہو چلا تھا۔ ایبک نے اس کا ہاتھ بڑے زور سے دبایا وہ ہاتھ چھڑانا چاہ رہی تھی پر جانے ایبک کس موڈ میں تھا۔ شاید وہ سارے خاموش جذبوں کو کوئی زبان دینا چاہ رہا تھا۔ زیان اتنے مہمانوں کی موجودگی سے گھبرا رہی تھی۔ اس نے دوسرے ہاتھ کا ناخن ایبک کے ہاتھ کی پشت پہ مارا۔ یہ اس کی طرف سے احتجاج تھا۔ ایبک کی گرفت 'پرجوش اور مضبوط تھی کچھ کہتی ہوئی۔

اس کے ہاتھ میں گویا سارے جذبے سمٹ آئے تھے ہاتھ زبان بن گیا تھا۔ زیان بزور طاقت ہاتھ چھڑا کر تیزی سے دور ہوئی اور معاذ کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ نیناں معاذ کے لیے سوفٹ ڈرنک لے آئی تھی۔ معاذ کو گلاس تھماتے ہوئے اس نے ایک نظر زیان پہ ڈالی جہاں خفت اور گھبراہٹ تھی۔ دوسری نگاہ ملک ایبک کی طرف اٹھی جو استحقاق کے سب رنگ سمیٹے زیان کی طرف متوجہ تھا۔ اس کا دل دھڑ دھڑ جلنے لگا۔ معاذ سے ایبک کی جسارت پوشیدہ نہیں تھی۔

"بھابھی آج آپ نے اپنی نظر اتروا لینی ہے لوگوں کے دل بے ایمان ہو رہے ہیں۔" معاذ نے ملک ایبک پہ لطیف سی چوٹ کرتے ہوئے زیان کو مشورہ دیا تو اسے غصہ آگیا۔ تقریب کے دوران پہلی بار اس کا موڈ آف ہوا۔ ایبک اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

معاذ نے نیناں سے پانی کا گلاس لے کر بیٹھنے کا اشارہ کیا "مس نیناں آپ تھک گئی ہوں گی۔ دو گھڑی دم لے لیں۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"ویسے آج آپ بہت حسین و جمیل لگ رہی ہیں۔ اچھا آپ کہاں سے آئی ہیں آپ کے کتنے بہن بھائی ہیں کیا کیا کرتی ہیں آپ؟" معاذ کی فراٹے بھرتی زبان شارٹ ہو چکی تھی وہ نیناں سے بھرپور انٹرویو کے موڈ میں تھا۔ نیناں نے امداد طلب نگاہوں سے پاس کھڑے ایبک کی سمت دیکھا۔ اسے ترس سا آگیا۔

زیان سے اس نے توجہ ہٹالی تھی۔

"معاذ ان کو عنیزہ چچی ساتھ لائی ہیں۔ میرے انڈسٹریل ہوم کا سب انتظام انہوں نے ہی سنبھالا ہوا ہے۔" ملک ایبک نے جواب دیتے ہوئے نیناں کو مشکل سے نکالا۔

"میں آؤں گا انڈسٹریل ہوم دیکھنے باقی بہت سی باتیں وہاں کروں گا۔" معاذ نے جھٹ پٹ آئندہ کا پروگرام دے ڈالا۔ نیناں نے متشکرانہ نگاہوں سے ملک ایبک کی سمت دیکھا تو زیان کے ہونٹوں پہ عجیب سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔ معاذ مسلسل بول رہا تھا اس کی بے تکلفی اور شرارتوں کا نشانہ اب نیناں تھی۔ وہ گھبرا رہی تھی کہ معاذ کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات اس کے منہ سے نہ نکل جائے جو اسے ملک محل کے مکینوں کی نگاہوں میں مشکوک بنا دے۔ اور ملک ایبک کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔ یہی نیناں جو رنم تھی کبھی کسی سے نہ دبنے والی نہ ڈرنے والی۔ آج معاذ کے سامنے اس کی بولتی بند تھی۔

تقریب کے اختتام پہ معاذ' زیان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ اس نے نیناں کو بھی پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ پریشان ہو رہی تھی کہ اسے کیوں بلوایا جا رہا ہے۔

"آپ دونوں خواتین تھک گئی ہوں گی اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میوزک سے لطف اندوز ہوں" وہ ایسے بے تکلفی سے بولا جیسے وہ دونوں مل کر اس کے

ساتھ شروع سے ہی موسیقی کی محفلوں میں حصہ لیتی آ رہی ہوں۔ نہناں نے بے چارگی سے معاذ کی سمت دیکھا۔ چلو زیان تو اس کی ہونے والی بھابھی ہے مگر اسے معاذ کس کھاتے میں یہاں تک لایا ہے۔

اگر کوئی برا مان جاتا تو۔ اسے یہی فکر کھائے جا رہی تھی۔

معاذ نے ریحانہ کے دھوم دھڑکے والے سونگز چلا دیے۔ یہ رنم کی فیورٹ سنگر تھی یونیورسٹی جاتے ہوئے وہ اکثر گاڑی میں ریحانہ کو فل والیوم میں سنتی تھی۔ معاذ اب زیان کو اپنی فوٹوز دکھا رہا تھا اس کا ہر فوٹو کی تفصیلات بتاتے ہوئے انداز بیان اتنا دلچسپ تھا کہ زیان ہنس ہنس کر دہری ہو رہی تھی۔ ”مس نہناں آپ کو انگلش آتی ہے“ معاذ نے ایک دم سوال کیا تو وہ بوکھلا گئی۔ ”نہیں تو۔“

”اچھا جس طرح آپ میوزک انجوائے کر رہی ہیں مجھے لگا کہ آپ کو آتی ہو گی۔ ویسے آپ نے پڑھا کتنا ہے؟“

”میں نے بی ایس آنرز کیا ہے“ سچ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ریحانہ کی پرشور آواز میں معاذ نے سنا ہی نہیں۔ اس نے شکر ادا کیا۔ معاذ کی بے تکلفی سے وہ ڈر گئی تھی۔ کیونکہ اس کی پوری توجہ نہناں کی طرف تھی۔ زیان کو جانے کیوں نہناں کی موجودگی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ معاذ اپنی ہانکے جا رہا تھا۔

”میں نے سوچا تھا یہاں آ کر بھائی جان کی شادی کی دعوتیں اڑاؤں گا مگر وہ بھی ابھی میرے نصیب میں نہیں ہیں.... کہتے ہیں ابھی شادی نہیں کرنی۔“ اس نے منہ بنا کر چہرے پہ مصنوعی اداسی طاری کر لی۔ زیان کی آنکھیں سلگ اٹھیں۔

معاذ اپنے بیگ سے زیان کے لیے چاکلیٹس اور دیگر گفٹس نکال رہا تھا۔ معاذ کی بات پہ نہناں کی آنکھوں میں چمک ابھری جیسے اس نے کوئی من پسند بات کہہ دی ہو۔ اب اس کے تاثرات میں دلچسپی تھی۔ معاذ بے دھیانی اور بے تکلفی میں کام کی باتیں کر رہا تھا۔ زیان کاؤچ سے اٹھی۔

”معاذ میں جا رہی ہوں۔ سر میں اچانک درد ہو رہا ہے۔“

”بھابھی اپنے گفٹس تو لے جائیں۔“

”بعد میں لے لوں گی۔“ نہناں نے اسے اٹھتے دیکھا تو وہ بھی معاذ کے کمرے سے نکل آئی۔ وہ آخری سیڑھی پہ تھی جب اس نے ملک ایبک کو اس سمت آتے دیکھا اس کا رخ بھی سیڑھیوں کی طرف تھا۔ نہناں کے آگے بڑھتے خود بہ خود ہی سست پڑ گئے۔

زیان 'معاذ کے روکنے کے باوجود رکی نہیں۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آ رہی تھی جب اوپر کی طرف آتے ایبک سے اس کا ٹکراؤ ہوا وہ ادھر ہی رک گئی تھی کیونکہ ایبک اس کے راستے میں حائل تھا وہ بالکل درمیان میں تھا دائیں بائیں اتنی جگہ نہیں تھی کہ وہ سائیڈ سے ہو کر نکل جاتی۔ چند ثانیوں کے لیے دونوں کی نگاہیں آپس میں ملیں۔ زیان کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں جیسے وہ اندر ہی اندر کسی کرب کو برداشت کر رہی ہو۔ اس نے فورا" پلکوں کی چلمن گرائی اور ایبک کو ایک ہاتھ سے پرے ہٹاتے ہوئے نیچے جانے کی کوشش کی۔ اس کے مہکتے رنگین آنچل کا کونہ ایبک کے بازو سے چھو گیا۔ وہ فورا" سائیڈ پہ ہوا۔ زیان سیڑھیاں اتر گئی تھی۔ ایبک کو اس کی نگاہوں میں خاموش شکووں کا سیلاب مچلتا نظر آیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا وہ جیسے ابھی رو پڑے گی اس کی پلکوں کو ہلاتے ہی فورا" موتی ٹپک پڑیں گے۔ نیچے کھڑی نہناں نے یہ تصادم دیکھا۔ ایبک کی پشت اس کی سمت تھی پر زیان اس کے سامنے تھی۔

اس کی لال لال آنکھوں نے نہناں کو عجیب سی تسکین بخشی تھی۔ وہ آگے بڑھ گئی تھی۔ ایبک نے آخری سیڑھی چڑھ کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ زیان برآمدے سے گزر رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا زیان کے پیچھے جائے۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنی اس خواہش پہ قابو پایا۔ اور معاذ کی طرف بڑھ گیا جو زیان کے لیے لائے گئے گفٹس کو دیکھ رہا تھا۔

”بھائی جان یہ دیکھیں میں نے بھابھی کے لیے

اتنے شوق سے یہ چیزیں لیں نکال رہا تھا انہیں دینے کے لیے کہ چلی گئیں۔" اس نے ایبک کو دیکھتے ہی شکائتی انداز میں کہا۔

"مجھے دو میں خود دے دوں گا" ایبک نے آفر کی۔

"آپ کو دیکھ کر وہ نروس ہو جائیں گی یہ نہ ہو لینے سے ہی انکار کر دیں۔" معاذ شرارت سے ہنسا۔

"نہیں نروس ہو گی تم فکر مت کرو" ایبک نے اسے تسلی دی۔ "آپ ان کے ساتھ انڈرسٹینڈنگ ڈیولپ کریں گھومیں پھریں لانگ ڈرائیو پہ لے جائیں بھابھی کو۔ ڈنر کریں ایک ساتھ۔ کیونکہ بھابھی مجھے بہت شائے لگتی ہیں۔" معاذ نے مشورہ دیا۔

"تم مجھے اپنے ماحول کے مطابق ایڈوائس دے رہے ہو یہ ہمارا گاؤں ہے کوئی یورپ نہیں ہے۔" ایبک نے اسے سرزنش کی تو اس نے منہ بنا لیا۔

☼ ☼ ☼
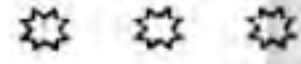
آج سامنے والے کمرے کی سب لائٹس آف تھیں۔ کھڑکیاں کھلی تھیں کمرے سے اندر مکمل طور پہ اندھیرا تھا۔ ایبک دونوں ہاتھ ریلنگ پہ ٹکائے وہ ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ زیان شاید اس کی ہاتھ دبانے کی جرات کو مائنڈ کر گئی تھی۔

تب ہی تو سیڑھیوں پہ سامنے ہوتے وقت اسے شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھا تھا۔ حالانکہ ایبک نے محض شرارت میں زیان کا ہاتھ دبایا تھا۔ معاذ کی وہ حرکت اچانک اور بے ساختہ تھی اس نے زیان کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں لا تھمایا تھا۔

وہ پہلی بار اتنے قریب آئی تھی کہ ایبک اس کا لمس محسوس کرنے کے قابل ہوا تھا۔ اس کا نازک گلابی مخروطی انگلیوں والا ہاتھ ایبک کے ہاتھ کی گرفت میں آ کر جیسے احتجاج کر رہا تھا۔ زیان نے ناخن اس کے ہاتھ پہ مارا تھا۔ ایبک نے ہاتھ آنکھوں کے سامنے کیا جہاں ناخنوں سے لگنے والی خراشیں بہت واضح تھیں۔ اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آ گئی۔ صرف ہاتھ دبانے پہ اسے اتنا تاؤ آیا تھا۔ کیا واقعی وہ اسے ناپسند کرتی ہے؟

ایبک کو رہ رہ کر یہ سوال پریشان کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہاب کے درشت تیور اور دھمکانے والے انداز دیکھ کر بوا اور زرینہ سچ مچ سہمی ہوئی تھیں۔

"مجھے ہر حال میں زیان کا پتا چاہیے خالہ اور یہ مت کہنا کہ مجھے نہیں معلوم" اس کے تاثرات بہت سفاک اور سرد تھے۔

"وہاب میاں ہمیں نہیں معلوم" بوا نے کمزور سے لہجے میں ایک بار پھر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو وہاب غصے سے گھورتا ان کے پاس آ رکا۔

"بڑھیا تم تو خالہ کے ہر راز میں شریک ہو۔ تم مجھے بتاؤ گی کہ زیان کہاں ہے کہاں چھپایا ہے تم نے اسے بولو۔" وہاب کا لہجہ بدتمیزی اور سفاکی کو چھو رہا تھا۔

"وہاب بوا کے ساتھ بدتمیزی مت کرنا چھوڑ دو انہیں۔" زرینہ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ بوا کے ساتھ اس کا لب و لہجہ بہت نامناسب تھا۔

"تو خالہ تم تمیز سے بتا دو کہ کہاں ہے زیان؟" وہ طنزیہ انداز میں بولتا ان کے قریب چلا آیا۔

"زیان اپنی ماں اور سوتیلے باپ کے پاس ہے۔" دل کڑا کے انہیں یہ سچ بولنا ہی پڑا ورنہ وہاب سے کچھ بعید نہیں تھا۔

"کیسے گئی وہ اپنی ماں کے پاس۔ یہ ایک دم سے اس کی ماں کہاں سے ٹپک پڑی۔ پہلے کہاں سوئی ہوئی تھی۔"

"اس کی ماں ٹپکی نہیں ہے پہلے سے تھی اور اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے تڑپ رہی تھی۔" زرینہ بیگم نے بڑی مشکل سے خون کے گھونٹ پی کر وہاب کا یہ انداز برداشت کیا تھا۔

"جب اس کی ماں آئی تو مجھے کیوں نہیں بتایا کیوں جانے دیا اسے۔ پتا نہیں تھا کہ وہ میری ہونے والی بیوی ہے۔ اور اس کی ماں کیوں لینے آئی اسے۔ خالو کی وفات کا کس نے بتایا اسے؟" وہاب کے اعصاب غصے سے تن رہے تھے۔

"میں نے بتایا اسے اور ذیان کی ماں کو میں نہیں روک سکتی تھی وہ اس کی ماں ہے۔"

"خالہ بڑے خدمت خلق کے شوق چڑھے ہیں تمہیں۔ ذیان کو ساری عمر تم نے خون کے آنسو رلایا چین سے ٹکنے نہیں دیا اور اب اچانک انسانیت جاگ پڑی۔ پہلے تو ہمیشہ اسے ماں کے طعنے دیتی رہیں کہ تمہاری ماں ایسی تمہاری ماں ویسی۔" وہاب طنزیہ انداز میں ماضی کا آئینہ زرینہ بیگم کو دکھایا تو وہ نظر چرا گئیں۔

"یہ میرا اور ذیان کا معاملہ تھا تم اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہو۔" اندر سے خود کو مضبوط کرتے ہوئے زرینہ نے اس کی بات کا جواب دیا۔

"میں اعتراض کرنے والا کون ہوتا ہوں۔ خالہ بتاؤں گا آپ کو۔ پہلے ذیان سے نمٹ لوں۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

"کیا کرو گے تم؟"

"ذیان میری ہونے والی بیوی ہے سب سے پہلے جا کر اسے واپس لانا ہے مجھے ایڈریس چاہیے۔"

"ہمیں ایڈریس نہیں معلوم۔ ذیان کا سوتیلا باپ خود اسے لینے آیا تھا۔" زرینہ کا لہجہ کافی مضبوط تھا۔

"خالہ مجھے ایڈریس چاہیے ورنہ میں کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ پورے گھر کو آگ لگا دوں گا۔" وہ زرینہ کے قریب جا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بول رہا تھا۔ زرینہ بیگم کو معلوم تھا کہ وہاب جو کہتا ہے وہ کرتا بھی ہے۔

"ذیان کی ماں کوئی معمولی عورت نہیں ہے۔ نہ اس کا سوتیلا باپ گرا پڑا ہے۔ جاگیردار ہے وہ۔" زرینہ نے اپنے تئیں اسے متاثر کرنے کی کوشش کی۔

"ہاہاہاہا۔" وہاب نے بے ڈھنگا قہقہہ لگایا۔ "خالہ تمہیں تو ذیان کے بارے میں سب کچھ پتا ہے۔"

"ہاں پتا ہے اور اس بھول میں مت رہنا کہ تم وہاں تک پہنچ کر ذیان کو واپس لا سکو گے۔"

"خالہ میرا نام وہاب ہے اور ذیان میری ہونے والی بیوی ہے۔ اسے کیسے اور کس طرح واپس لانا ہے یہ میرا کام ہے۔ بس مجھے وہاں کا پتا دو۔"

"وہاب میاں، چھوٹی دلہن کو کچھ نہیں معلوم ہوا زرینہ بیگم کی مدد کے لیے آگے بڑھیں۔

"تو پھر کسے معلوم ہے۔ یہ معلوم ہے کہ ذیان کی ماں کوئی معمولی عورت نہیں ہے اس کا باپ جاگیردار ہے۔ بس پتا نہیں معلوم۔" وہ خوفناک طنزیہ ہنسی ہنس رہا تھا۔ زرینہ اور بوا دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہاب ٹلنے والا نہیں تھا۔ اس نے ایڈریس لے کر ان دونوں کو چھوڑا۔

"خالہ ابھی بہت سے حساب آپ کی طرف باقی ہیں۔ لیکن پہلے ذیان والا معاملہ سیٹ کرلوں۔" وہ اب قدرے پرسکون نظر آرہا تھا۔

"خالہ آپ کے اس گھر کی موجودہ مالیت کتنی ہوگی؟" اس نے اچانک سوال کیا تو زرینہ چونک گئیں۔

"مجھے کیا پتا؟" وہ تیکھے لہجے میں بولیں۔

"خالہ اگر اس کو آپ فروخت کردیں تو بہت اچھی قیمت پہ بک جائے گا۔"

"مجھے اپنا گھر نہیں فروخت کرنا یہ میرے بچوں کا ہے۔ آسرا ہے ہمارا۔"

"ٹھیک ہے خالہ آپ اس پہ سوچ لینا۔ میں جا رہا ہوں پھر ملاقات ہوگی۔" وہ گیٹ سے باہر نکلا تو زرینہ نے خود دروازہ لاک کیا۔ شکر ہے کہ تینوں بچے اسکول میں تھے ورنہ وہاب کا یہ انداز و تیور دیکھ کر سہم جاتے۔

"بوا اب کیا ہوگا؟ وہاب مردود کی نظر تو اب اس گھر پہ ہے۔" زرینہ کو اب گھر کی فکر لگ گئی تھی۔

"میں تو کہتی ہوں کہ خاموشی سے یہاں سے نکل چلیں تاکہ وہاب میاں سے جان ہی چھوٹ جائے۔" بوا نے مشورہ دیا۔

"بوا گھر چھوڑ کر جائیں گے تو وہاب کا کام آسان ہو جائے گا۔ وہ اس گھر پہ قبضہ کرلے گا۔" زرینہ بہت فکر مند تھیں۔

"چھوٹی دلہن میری مانیں تو اس گھر کو فروخت کر دیں۔ ورنہ وہاب میاں آپ کو گھر سے بھی محروم کر دیں گے۔"

"بوا آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اس کا شک تو مجھے پہلے سے تھا کیونکہ روبینہ آپا بھی بہانے بہانے سے بہت بار مجھے اپنے گھر رہنے کے لیے کہہ چکی ہیں۔ لیکن کیا کروں میں کچھ سمجھ نہیں آرہا ہے۔ میں اکیلی عورت کہاں اس گھر کے لیے گاہک ڈھونڈوں گی۔"

"آپ امیر میاں کے وکیل سے بات کریں انہیں اپنی پریشانی بتائیں۔ وکیل صاحب بھلے مانس آدمی لگتے ہیں مجھے۔"

"بوا یہ بات آپ نے اچھی کہی ہے۔ میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی کہ مجھے بیگ صاحب سے رابطہ کرنا چاہیے۔" زرینہ کے لہجے میں ایک دم امید جاگی۔

"میں ابھی بیگ صاحب سے بات کرتی ہوں۔" زرینہ نے سیل فون اٹھا کر وکیل کا نمبر ملانا شروع کر دیا۔

☼ ☼ ☼

زیان تکیے میں منہ چھپائے خوب اونچی اونچی آواز میں رو رہی تھی۔ تکیے نے اس کا بھرم رکھ لیا تھا ورنہ اس کی آواز سب کو متوجہ کرچکی ہوتی۔ کمرے میں لگا میوزک سسٹم آن تھا۔ جانے کیوں آج اسے اتنا زیادہ رونا آرہا تھا۔ امیر علی کی وفات کے بعد آج وہ پہلی بار اتنا زیادہ رو رہی تھی۔ کوئی ٹھیس تھی یا پچھتاوا جس کی وجہ سے دل درد کا ٹکڑا بنا ہوا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

عین جس لمحے وہ رو رہی تھی اسی وقت ملک ایبک، عنیزہ سے اسی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ وہ کوئی ضروری بات کرنے آیا تھا۔ عنیزہ نے بخوشی اسے زیان کے کمرے میں جانے کی اجازت دی تھی۔ ایبک نے بات ہی ایسی کی تھی وہ خود اب امید و بیم کی حالت میں تھیں۔

زیان کو ایسے محسوس ہوا جیسے دروازے پہ دستک ہو رہی ہے۔ اس نے تکیے سے منہ باہر نکالا۔ واقعی سچ مچ دستک ہو رہی تھی اس کا وہم نہیں تھا۔ اس نے بے دردی سے دوپٹے سے آنکھیں رگڑیں اور دروازہ کھول کر دیکھے بغیر باتھ روم میں گھس گئی۔ اسے نہیں معلوم کہ کون آیا تھا۔ واش بیسن کا نل کھول کر اس نے لگاتار ٹھنڈے پانی کے چھپاکے ہاتھ بھر بھر منہ پہ مارے۔ باتھ روم کا دروازہ ہلکا سا کھلا ہوا تھا زیان کے دوپٹے کی ہلکی سی جھلک ایبک کو نظر آئی۔ کمرے میں اداس آواز بکھری ہوئی تھی جیسے پوری فضا سوگ منا رہی ہو۔

ایبک شدت سے زیان کے باہر آنے کا منتظر تھا۔ چند لمحے بعد منہ ہاتھ دھو کے فارغ ہونے کے بعد وہ باہر نکلی تو سچ مچ ملک ایبک کو سامنے دیکھ کر پچھتائی۔ ایبک اس کی شدت گریہ سے لال آنکھیں دیکھ چکا تھا پھر گانے کے اداس سے بول۔ ملک ایبک کو کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ اس کے روم میں آئے۔

☼ ☼

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

مکمل ناول

نبیلہ ابر راجہ

میں گمان نہیں یقین ہوں

ساتویں قسط

ذیان کی آنکھوں میں غصہ جاگا۔ اسے ملک ایبک کا اس وقت مخل ہونا بالکل بھی پسند نہیں آیا تھا۔

"جی کہیے... کیا بات ہے۔" اس کا لہجہ خشک اور سرد تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایبک نے کچھ فیصلے آنا "فانا" کیے ہیں۔ اس کا چہرا بے حد سنجیدگی کے حصار میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"ذیان آپ کو اچھی طرح علم ہے کہ معاذ کم دنوں کے لیے پاکستان آیا ہے۔ بابا جان اور امی کی مرضی ہے کہ معاذ کی چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے ہماری شادی ہو جائے۔ خود معاذ بھی چاہتا ہے کہ شادی اٹینڈ کر کے جائے۔ میں اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔ عنیزہ چچی سے اجازت لی ہے' باقاعدہ آپ سے بات کرنے یہاں تک آنے کی۔" وہ اس کی مسلسل خاموشی سے تنگ آکر وضاحت دینے لگا۔

"آپ کو کسی قسم کا اعتراض تو نہیں؟" وہ اب بطور اس کے تاثرات جانچ رہا تھا۔ ایبک اسے منتظر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میکانکی انداز میں ذیان کا سر بے اختیار نفی میں ہلا۔ حالانکہ دماغ مسلسل انکار پہ اکسا رہا تھا۔ پر دل نے دماغ کو شکست دے دی۔ ایبک کو ایسے محسوس ہوا جیسے ذیان کی روئی روئی آنکھیں مسکرائی ہوں۔

"ٹھیک ہے' پھر اب شادی کے دن ہی آپ سے ملاقات ہوگی۔" جاتے جاتے اس نے شریر جملہ اچھالا۔ وہ جا رہا تھا ابھی ابھی ذیان پہ اس کی ایک خوبی عیاں ہوئی تھی۔ وہ قائل کرنے کی' منوانے کی صلاحیت سے مالا مال تھا۔

☼ ☼ ☼

عنیزہ بے قراری سے میٹنگ روم کے چکر لگا رہی تھیں۔ ایبک اوپر ذیان کے کمرے میں گیا ہوا تھا۔ کچھ منٹ بعد وہ کھڑکی کے شیشوں سے سیڑھیاں اترتا نظر آیا تو وہ اٹھ کر دروازے تک پہنچ گئیں۔

"ایبک اتنے جلدی کیوں آگئے ہو؟" انہوں نے دروازے پہ ہی اسے کندھوں سے تھام لیا۔

"چچی' ذیان کو جلد شادی پہ کوئی اعتراض نہیں ہے۔" ایبک نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جیسے مژدہ جاں فزا سنایا۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔" عنیزہ نے بے اختیار شکر ادا کیا۔

"ایبک میری بیٹی نے مجھ سے دور رہ کر زندگی گزاری ہے اور میں تصور کر سکتی ہوں کہ ماں کے بغیر وہ زندگی کیسے ہوگی۔ اسی وجہ سے وہ تلخ ہو گئی ہے۔ اس وجہ سے وہ بے رخی کا برتاؤ کرتی ہے تو تم پریشان مت ہوا کرو' نظر انداز کر دیا کرو۔ ہم سب ایک طرح سے اس کے لیے اجنبی ہی ہیں' اسے گھلنے ملنے میں ایڈجسٹ کرنے میں تھوڑا وقت لگے گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟" وہ آس بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"چچی آپ فکر مت کریں۔ میں ان سب باتوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔" اس نے ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بھرپور یقین دلایا تو عنیزہ کے ہونٹوں پہ پرسکون مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

ملک جہانگیر بہت خوش تھے اور معاذ کی خوشی تو حد سے سوا تھی' ورنہ وہ ایبک بھائی کی طرف سے شادی مؤخر کرنے کے فیصلے سے خوش نہیں تھا۔ ایبک نے سختی سے ہر قسم کے جہیز کے لیے منع کر دیا تھا۔ بیڈ روم فرنیچر اس نے خود پسند کیا تھا۔ باقی پردے' قالین' کلر اسکیم زیان کی پسند کی تھی۔

ان دونوں میں ملک ایبک کا انکار موضوع گفتگو بنا ہوا تھا۔ نہناں بھی ان کی باتیں پاس بیٹھی غور سے سن رہی تھی۔

"ایبک بے شک انکار کرتا رہے' ہم اپنی بیٹی کو ہر چیز دیں گے۔" یہ ارسلان تھے۔ ایبک کے منع کرنے کے باوجود زیان کو بہت کچھ دینا چاہ رہے تھے۔

"اس نے دوٹوک منع کردیا ہے' ایسا نہ ہو وہ اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لے۔ ویسے بھی اس نے زیان کے لیے سب کچھ خرید لیا ہے۔ صرف ولیمہ کا جوڑا باقی ہے۔ وہ بھی ایک دو دن تک مل جائے گا۔" عنیزہ نے ملک ارسلان کی توجہ اس طرف دلائی تو وہ کچھ سوچنے لگے۔

"ہاں بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ ایبک اصولوں اور بات کا کھرا آدمی ہے' نہیں مانے گا۔" کچھ توقف کے بعد وہ بولے اور عنیزہ کی بات کی تائید کی۔

"میں بہت خوش ہوں' میری بیٹی کو ایبک جیسا ہم سفر مل رہا ہے۔ میرے رب نے اتنی خوشیاں میری جھولی میں ڈالی ہیں۔ میں تمام عمر شکر ادا کرتی رہوں تو بھی کم ہے۔" جذبات میں انہوں نے پاس بیٹھی نہناں کی موجودگی نظر انداز کردی تھی۔ ارسلان بھی بھول گئے تھے کہ نہناں ادھر موجود ہے۔ اس کے کان ان دونوں کی گفتگو کی طرف لگے ہوئے تھے۔ ملک ارسلان کی نگاہ اس پہ پڑی تو انہوں نے بہانے سے اسے وہاں سے ہٹا دیا۔

"ایک کپ چائے کا مل جائے تو۔۔۔"

"جی ابھی بنواتی ہوں۔" وہ سعادت مندی سے بولی اور باہر آگئی۔ وہ دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھی' سماعتیں اندر سے آنے والی آوازوں کی سمت لگی تھیں۔ ملک ارسلان' عنیزہ کو تسلی دے رہے تھے۔ کسی کے قدموں کی آہٹ اسی طرف آتی محسوس ہو رہی تھی' نہناں فوراً" دروازے سے ہٹ کر آگے بڑھ گئی۔ زیبو نے چائے بنادی تھی' نہناں خود لے کر واپس آئی۔ اندر داخل ہونے سے پہلے وہ چند لمحے کے لیے دروازے پہ ہی ٹھہر گئی۔ ایبک اور زیان کی شادی کا موضوع چل رہا تھا۔ وہ ٹرے سمیت اندر داخل ہوئی۔

"ایبک بہت خوددار ہے۔" یہ عنیزہ تھیں۔

"ہماری بیٹی کو اللہ نے بہترین ہم سفر دیا ہے۔" ملک ارسلان کے لہجے میں ہماری بیٹی کہتے وقت عجیب سی مٹھاس اور اپنائیت اتر آئی تھی۔ نہناں ان ہی کی طرف متوجہ تھی۔

☼ ☼ ☼

آج اسے ذرا بھی بھوک نہیں تھی۔ سر میں درد الگ ہو رہا تھا۔ وہ طبیعت میں سستی کی وجہ سے جلدی اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ ملک ارسلان اور عنیزہ کی باتوں پہ غور کر رہی تھی۔ ان کی گفتگو سے نہناں نے ایک نتیجہ نکالا تھا کہ زیان پہلے سے حویلی میں نہیں تھی۔ اس سے پہلے وہ کہاں تھی۔ اس بارے میں وہ لاعلم تھی۔ نہناں کو یقین تھا' وہ ان دونوں سوالوں کے جواب حاصل کرلے گی۔

نہناں سوچ رہی تھی کہ زیان کے بارے میں کیسے' کس سے اور کس طرح معلومات حاصل کی جاسکتی ہے۔ فی الحال تو ملک ایبک اور زیان کی شادی اس کے لیے شاک کا باعث بنی ہوئی تھی۔ ملک ایبک بالکل ویسا ہی تھا جیسا وہ ڈھونڈ رہی تھی۔ واہ ری قسمت تیرے کھیل۔

اس کا مطلوبہ شخص ایبک اور حیثیت میں اسے ملا تھا اور وہ اپنی ضد میں گھربار' عیش و آرام' ناز نعم سب چھوڑ آئی تھی۔ اسے ایسا شخص مل کے نہیں دے رہا تھا۔ لیکن یہ ہی شخص' کسی اور کو بغیر کسی ضد کے بن مانگے مل رہا تھا۔

زیان کو تو کچھ چھوڑنا بھی نہیں پڑا تھا۔ زیان جیسی مغرور بددماغ لڑکی جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی کیا ملک ایبک جیسا شاندار مرد اس کے لائق تھا یا وہ اس قابل تھی کہ ملک ایبک کے خواب بھی دیکھ سکے۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔" ان تمام سوالوں کے جواب میں کوئی بڑے زور و شور سے نہناں کے اندر چیخا تھا۔

☼ ☼ ☼

ملک جہانگیر نے ایبک کے لیے مختص رہائشی حصے کو نئے سرے سے آراستہ کروایا تھا۔ ایبک اور زیان کا بیڈ روم نئے اور قیمتی فرنیچر سے سجایا گیا تھا۔ انسپکشن کے لیے معاذ خاص طور پر نہناں کو لے کر آیا۔ نہناں آراستہ و پیراستہ بیڈ روم کو غور سے دیکھ رہی تھی' آنکھوں میں رشک و حسد کے ملے جلے جذبات تھے۔ معاذ حسب معمول بول رہا تھا۔

"زیان بی بی پہلے شہر میں رہتی رہی ہیں کیا؟" نہناں

نے عام سے انداز میں سوال کیا۔
"آف کورس بھابھی 'پہلی بار حویلی آئی ہیں۔" معاذ اپنی دھن میں بول رہا تھا۔
"امکچوئیلی! ارسلان چچا' زیان بھابھی کے سوتیلے ابو ہیں۔" معاذ نے بولتے بولتے اہم انکشاف کیا تو حیرت کی زیادتی سے 'جیسے نیناں جہاں کی تہاں رہ گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو نارمل کیا' ورنہ معاذ شک میں پڑھ سکتا تھا۔ معاذ کی باتوں کی طرف اب اس کا دھیان نہیں تھا۔ وہ فقط میکانکی انداز میں سرہلا رہی تھی۔

افشاں بیگم نے' عنیزہ سے درخواست کی تھی کہ نیناں کو کچھ دن کے لیے ان کے ہاں رہنے کے لیے بھیج دیا جائے۔ وہاں بہت کام بکھرے ہوئے تھے' جبکہ افشاں بیگم سے اب "ملک محل" کی دیکھ بھال کے امور درست طریقے سے سنبھالے نہیں جا رہے تھے۔ ایک کی شادی کا ہنگامہ سر پہ تھا۔ کوئی بیٹی نہیں تھی جو بے شمار چھوٹے چھوٹے کاموں میں ان کی مدد کرتی۔
"میں نیناں سے کہتی ہوں بلکہ اسے ساتھ لے جائیں۔" عنیزہ نے فورا" ہی رضامندی دے دی تو افشاں بیگم مطمئن ہو گئیں۔ نیناں کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ عنیزہ بیگم نے اسے کچھ دنوں کے لیے ملک ایبک کی طرف شفٹ ہونے کا کہا تھا۔ اس نے بڑی فرماں برداری سے سرہلایا تھا۔ افشاں بیگم اسے اپنے ساتھ ہی لائی تھیں اور فورا" ہی کاموں کی ایک لمبی چوڑی فہرست بتائی تھی۔

کارڈز چھپ کے آگئے تھے۔ نیناں افشاں بیگم کی ہدایت پہ سب کارڈز ان کے پاس لائی تھی۔ وہ ملک ایبک کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ نیناں کارڈز کا بنڈل ان کے سامنے رکھ کر وہیں سائیڈ پر کھڑی ہوئی۔ ملک ایبک کارڈ کھول کر ان پہ لکھے نام پڑھ رہا تھا۔ چوہدری طارق' صغیر گیلانی' رانا رب نواز' احمد سیال۔
احمد سیال کے نام پہ نیناں فورا" اضطراب کا شکار ہوئی۔ بے چینی اس کے پورے جسم میں سرائیت کر چکی تھی۔ وہ کسی معجزے کی توقع تو نہیں کر رہی تھی پر احمد سیال کے نام پہ اسے شدید جھٹکا لگا تھا۔ دماغ جو کچھ سمجھا رہا تھا دل اسے قبول کرنے پہ آمادہ نہیں تھا۔
اس نے آخری بار ہوٹل سے جب اپنے گھر کال کی تھی تو وہاں سے رونے پیٹنے کی آوازیں سنی تھیں۔ اس نے اسے اپنی غلطی سمجھا تھا اور پھر کال کی تھی لیکن اس بار بھی تو غلطی نہیں ہو سکتی تھی ہوٹل اسٹاف کے ایک آدمی نے نمبر ڈائل کیا تھا اور تصدیق کی تھی جس نمبر پہ اس نے کال کی تھی اس گھر کے مالک کا انتقال ہو چکا تھا۔ رونے پیٹنے کی آوازیں ان کے دکھ کا اظہار تھیں۔ وہ ادھڑ کے رہ گئی تھی۔
اس کی تو دنیا ہی ختم ہو گئی تھی۔ جب پاپا ہی نہیں رہے تھے تو وہ واپس کس کے پاس جاتی' اور واپس جا کے کرتی بھی کیا۔ ساری عمر ضمیر کی مجرم بنی رہتی۔ اس نے واپس جانے کے بجائے عنیزہ اور ملک ارسلان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ اس کی خوشی یا چوائس نہیں تھی بلکہ بطور سزا' یہ راستہ اس نے چنا تھا۔ وہ اپنے پاپا کی قاتل تھی اس گھر کے چھوڑنے کے صدمے نے ان کی جان لی تھی۔ ضمیر کی چبھن اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔
پر کارڈ پہ لکھا پاپا کا نام جو ملک ایبک نے ابھی ابھی پڑھ کر اس کی سوچوں کو جھنجوڑا تھا وہ تو کوئی اور ہی حقیقت بیان کر رہا تھا۔ وہ مر چکے ہوتے تو کارڈ پہ ان کا نام کیوں لکھا جاتا۔ کارڈ پہ لکھا نام ظاہر کر رہا تھا کہ وہ زندہ تھے اور انہیں شادی میں بلایا جا رہا تھا۔ اس کا ذہن تیزی سے سارے واقعات پہ غور کر رہا تھا۔ یقینا" پریشانی میں اسے نمبر ڈائل کرنے میں غلطی ہوئی تھی جس کی وجہ سے اس نے پاپا کو مردہ تصور کر لیا تھا۔ اس وقت اس کی عقل کام کر رہی ہوتی تو وہ نام ضرور پوچھتی۔
کارڈ پہ لکھا احمد سیال کا نام اس کے لیے مژدہ جاں فزا ثابت ہوا تھا۔
"احمد سیال کے گھر تمہارے پاپا اور میں خود جائیں گے۔ ملک صاحب بتا رہے تھے۔ کہ ان کا یہ دوست تھوڑا بیمار ہے۔ بیٹی بھی پڑھنے کے لیے باہر چلی گئی

ہے۔ اور کوئی بیٹا بھی نہیں ہے۔" افشاں بیگم نہال کی دلی حالت سے بے خبر ایبک کے ساتھ بات کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے نہال کو اشارہ کیا کہ سب کارڈز اٹھا کر وہاں رکھ دے جہاں سے لائی ہے۔ نہال نے اپنی آنکھیں جھکاتے ہوئے ٹیبل سے سب کارڈز اٹھائے۔ وہ دروازے سے باہر آتے ہی تیز تیز قدموں سے سیدھی اس کمرے کی طرف آئی جو عارضی طور پہ اسے دیا گیا تھا۔ اس نے ڈھونڈ کر مطلوبہ کارڈ نکالا اور باقی سب الگ کر کے رکھے۔

کارڈ پہ احمد سیال کا نام گولڈن روشنائی کے ساتھ چمک رہا تھا۔ اس نے بے اختیار پاپا کے نام پہ ہاتھ پھیرا تو آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے خوامخواہ وہ اتنے ماہ اپنے پاپا کو مردہ تصور کرتی رہی۔

اس نے آنسو صاف کر کے کارڈ باقی کارڈز کے ساتھ رکھا اور اپنا سیل فون اٹھایا۔ یہ اسے عنیزہ بیگم نے لے کر دیا تھا۔ پاپا کا نمبر اسے ازبر تھا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پاپا کا نمبر ڈائل کر کے فون کان سے لگایا۔ کال فوراً" ریسیو کی گئی۔ اس کا پورا وجود سماعت بنا ہوا تھا۔

دوسری طرف احمد سیال اپنی مخصوص مہذب آواز میں ہیلو ہیلو کر رہے تھے۔ اس نے فوراً" رابطہ منقطع کر دیا۔ اس بار اس کی آنکھوں میں آنسو خوشی کی وجہ سے آئے تھے۔ پاپا زندہ تھے۔ اس کی امید زندہ تھی۔ یعنی اب وہ کوئی عام سی لڑکی نہیں تھی۔ رنم سیال تھی اپنے پاپا کی لاڈلی بیٹی' دنیا جس کے جوتے کی نوک پہ تھی۔

✡ ✡ ✡

ملازم وزیر بخش دودھ کا گلاس ان کی ٹیبل پر رکھ گیا تھا۔ احمد سیال نے نیند کی دو گولیاں دودھ کے ساتھ نگلیں۔ انہیں اب اس کے بغیر نیند نہیں آتی تھی۔ بلڈ پریشر الگ ہائی رہنے لگا تھا۔ رنم کے جانے کے بعد وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ خود کو از خود مصروف کر لیا تھا۔ وہ بیرونی دوروں پہ پاکستان سے لمبے عرصے کے لیے غائب رہنے لگے تھے۔ اس گھر میں ان کی لاڈلی بیٹی کی یادیں بکھری پڑی تھیں۔ وہ انہیں بھلانے کے جتن کرتے تھے۔ نیند کی گولیاں کھانے کے باوجود انہیں نیند بہت کم اور دیر سے آتی تھی۔ وہ اس آس پہ گھر لوٹتے کہ رنم آئی ہوگی۔ فون کی بیل بجتی تو فون کی طرف بھاگتے کہ اس کی کال ہوگی۔ گھر سے نکلتے تو آتے جاتے لوگوں کو غور سے تکتے شاید ان میں رنم نظر آجائے۔ وقتاً" فوقتاً" وہ فراز اور کومل سے بھی پوچھتے کہ شاید رنم نے ان سے کوئی رابطہ کیا ہو اور انہیں وہاں سے کوئی سراغ مل جائے۔ مگر ان کی ساری امیدیں ایک ایک کر کے دم توڑتی جا رہی تھیں۔ رنم کا دکھ انہیں لے ڈوبا تھا۔

انہوں نے آفس سے گھر اور گھر سے آفس کا راستہ پکڑ لیا تھا۔ باقی ہر جگہ آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ ملک جہانگیر کا چھوٹا بیٹا پاکستان آیا تو انہوں نے بہت محبت سے احمد سیال کو بھی مدعو کیا پر انہوں نے بہانہ کر دیا اور نہیں گئے۔ ملک جہانگیر ویسے ہی اصرار کر کے "ملک محل" آنے کا بول رہے تھے اور وہ مسلسل ٹال رہے تھے۔

کل ان کے سیل نمبر پہ اجنبی کال آئی تھی تو انہوں نے نمبر دیکھتے ہی جھٹ ریسیو کر لی پر دوسری طرف سے ان کے ہیلو کہتے ہی کال ختم کر دی گئی۔ انہوں نے کچھ توقف کے بعد اس نمبر پہ تین بار کال بیک کی پر کوئی رسپانس نہیں ملا۔ نہ جانے کیوں ان کا دل کہہ رہا تھا یہ رنم کی کال تھی۔

ملک جہانگیر' معاذ کے ساتھ احمد سیال کے گھر انہیں ایبک کی شادی کا دعوت نامہ دینے آئے تھے۔ معاذ نے پہلی بار ان کا گھر دیکھا تھا اور بے حد متاثر نظر آ رہا تھا۔ دونوں دوست باتیں کر رہے تھے۔ معاذ چائے پی کر ڈرائنگ روم سے باہر آیا۔ اسے واش روم جانا تھا۔ وہ واش روم جانے کے لیے کوریڈور سے گزرتے رک گیا۔ اچانک ہی اس کی نظر وہاں دیوار پہ لگے فوٹو گراف پہ پڑی تھی۔ اس کے رکنے کی وجہ وہ فوٹو تھی۔ وہ سو فیصد نہال تھی۔ معاذ نے قریب جا کر دیکھا۔

حیرت انگیز طور پہ اس کی شکل نمنال سے مل رہی تھی جسے ابھی ابھی کچھ گھنٹے پہلے وہ خود ملک محل میں دیکھ کے آیا تھا۔ اس سے اپنی حیرت چھپائی ہی نہیں جا رہی تھی۔ اس نے گھر میں جگہ جگہ نمنال سے مشابہت رکھنے والے بے شمار فوٹو دیواروں پر لگے دیکھے۔

وہ واپس آیا تو ملک جہانگیر وہاں موجود نہیں تھے' احمد سیال اکیلے بیٹھے ہوئے تھے۔ ملک جہانگیر عصر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ اور احمد سیال ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ پچھلی دیوار پر بھی اس لڑکی کی تصویر آویزاں تھی۔ معاذ نے جرات سے کام لیتے ہوئے اس بارے میں پوچھ ہی ڈالا۔

"یہ میری بیٹی رنم ہے ہائر اسٹڈی کے لیے ابراڈ گئی ہوئی ہے۔" انہوں نے برا منائے بغیر بتایا۔

"آپ کا گھر بہت خوب صورت ہے۔" معاذ نے موضوع بدلا اور ان کے گھر کی تعریف کی تو وہ خوش ہو گئے۔ وہ واپسی میں بھی نمنال اور رنم کی خطرناک حد تک مشابہت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"بابا جان آپ نے مجھے اپنے کسی دوست کی بیٹی کے بارے میں بتایا تھا کچھ ماہ پہلے۔" گاڑی کے شیشے سے باہر تکتے ملک جہانگیر سے اس نے سوال کیا۔

"ہاں میں نے تم سے بات کی تھی پر تم مانے ہی نہیں۔ پھر میں نے سوچا تم نہ سہی ایبک سہی' پر تمہاری ماں دل سے راضی نہیں تھی اور ایبک کی بھی خاص مرضی نہیں تھی۔" ملک جہانگیر نے جواب دیا۔

"وہ احمد سیال کی بیٹی ہی تھی جس کے گھر سے ہم ابھی واپس آرہے ہیں۔" انہوں نے انکشاف کیا۔

"بابا جان احمد انکل کی بیٹی کہاں ہے اب کیا کر رہی ہے؟" معاذ نے سوال کیا حالانکہ احمد سیال اسے بتا چکے تھے۔

"احمد کی بیٹی پاکستان سے باہر پڑھنے کے لیے گئی ہوئی ہے۔ میری دلی خواہش تھی کہ احمد کی بیٹی بہو بن جائے۔"

"بابا جان آپ اس سلسلے میں احمد انکل کے گھر گئے تھے؟"

"ہاں میں گیا تھا سرسری بات ہوئی تھی۔ میں اکیلا ہی احمد سے ملا تھا بات کی تھی۔"

"پھر کیا جواب دیا انہوں نے؟"

"کچھ نہیں احمد کی بیٹی پاکستان سے باہر چلی گئی۔ بات چلنے سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔ پر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" ملک جہانگیر نے گہری نگاہ سے اسے تکتے ہوئے سوال کیا۔

"بابا جان ایسے ہی۔ وہ امی جان بھی ذکر کر رہی تھیں نا اس لیے۔" معاذ نے بروقت امی کا نام لے کر ملک جہانگیر کو مطمئن کیا۔

"ویسے میں نے احمد کی بیٹی کو پہلی بار دیکھا تو تمہارے لیے پسند کیا تھا۔ اس کا جوڑ تمہارے ساتھ ہی تھا۔" انہوں نے اسے آگاہ کیا تو وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

ملک ارسلان نے عنیزہ کے مشورے سے مدعو کیے جانے مہمانوں کی فہرست حتمی طور پہ تیار کر لی تھی۔ عنیزہ نے بہت سے کارڈز زیان کو دیے تھے۔ وہ جس کو چاہے انوائٹ کرے۔ جب عنیزہ نے کارڈز اسے دیے تھے تب کوئی خاص نام اس کے ذہن میں نہیں تھا لیکن وہ ذرا اکیلی بیٹھی کر سوچنے کے قابل ہوئی تو اسے بوا رحمت' زرینہ بیگم' آفاق' رابیل اور منابل سب بے طرح یاد آئے۔ جب سے وہ ملک محل میں آئی تھی اس کے بعد سے لے کر اب تک اس کا ان میں سے کسی کے ساتھ بھی کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ امیر علی کا گھر چھوڑتے ٹائم زرینہ بیگم نے سختی سے منع کیا تھا کہ ہم میں سے کسی کے نمبر پہ بھی کال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب ضرورت ہوگی ہم خود فون کریں گے۔ ایسی ہی نصیحت اسے بوا نے بھی کی تھی کہ یہاں اب آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن آج اسے ان سب سے بات کرنے کی ملنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

آفاق' رابیل اور منابل تینوں اس کے بہن بھائی آخری ملاقات میں سہمے اور گھبرائے ہوئے تھے۔ یاد

آنے پہ زیان کی آنکھوں میں نمی سی چمکی۔ آفاق بے شک چھوٹا تھا پر بھائی تو تھا۔ بے شک ان کی مائیں الگ الگ تھیں پر باپ تو ایک تھا ناں۔ زیان "ملک محل" میں تھی اور وہ یہاں سے سینکڑوں میل دور شہر میں تھے پر اس دوری نے دلوں میں بھڑکنے والے محبت کے الاؤ اور خون کی کشش کو بڑھا دیا تھا۔

بے اختیار اس نے کارڈ پہ زرینہ آنٹی کا نام لکھا دوسرے کارڈ پہ خوش خط انداز میں اس نے بوا رحمت کا نام لکھا۔ کارڈ لفافے میں ڈال کر وہ عنیزہ کے پاس لے گئی۔ وہ اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر چونکیں۔ زیان بہت کم ان کے بیڈ روم میں آتی تھی اس لیے وہ حیران ہو رہی تھیں۔

"ماما ان کو بلوا بھیجیے گا میں نے کارڈز پہ نام لکھ دیے ہیں۔" اس نے کارڈ ان کی طرف بڑھائے۔ انہوں نے کارڈ پہ لکھے نام بغور پڑھے۔

"تم یہ نہ بھی کرتیں تو میں نے تب بھی ان کو بلوانا تھا۔ بوا کے بہت سے احسانات ہیں مجھ پہ۔ زرینہ بیگم اور بوا نے زندگی کی سب سے بڑی خوشی مجھے بخشی ہے۔ میں خود جاؤں گی شہر ان کے گھر۔ اور انہیں ساتھ لے کر آؤں گی۔" عنیزہ نے دونوں ہاتھ اس کے شانے پہ رکھے اور محبت سے اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرا۔ وہ بہت کم انہیں اس طرح مخاطب کرتی تھی اور ماما تو بھی کبھار ہی بولتی تھی زیادہ تر آپ کہہ کر کام چلاتی۔ اس لیے وہ بہت خوش تھیں۔

"ہاں آپ بوا کو لازمی ساتھ لے کر آنا۔" زیان کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ ابھری تو عنیزہ سو جان سے جیسے اس مسکراہٹ پہ فدا ہونے لگیں۔ وہ اس سے کچھ اور بھی کہتی تو انہوں نے لازمی ماننا تھا۔

☼ ☼ ☼

بوا، زرینہ بیگم اور تینوں بچے اداس اور خاموش بیٹھے تھے۔ گھر کا سودا ہو چکا تھا۔ آج ان کی اس گھر میں آخری رات تھی۔ وہاب کی دھمکیوں سے زرینہ بیگم بے حد خوفزدہ تھیں۔ انہوں نے اپنے وکیل سے مشورہ کیا تھا۔ انہوں نے تو مکان نہ بیچنے پہ زور دیا تھا پر زرینہ نے حالات کے رخ کو دیکھتے ہوئے دل پہ پتھر رکھ کر مکان فروخت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہاں رہنے سے وہاب کی تلوار سر پہ لٹکتی رہتی وہ آئے روز دھمکاتا اور زندگی اجیرن کرتا۔ اس لیے انہوں نے یہاں سے بہت دور ایک اور علاقے میں اپنے وکیل کے توسط سے ہی نیا گھر خرید اتھا۔

یہ گھر امیر علی نے بڑی چاہتوں سے تعمیر کروایا تھا اور زرینہ بیگم نے سجایا سنوارا تھا۔ وہ اس گھر میں دلہن بن کر آئی تھیں یہاں پہ ہی آفاق، رابیل اور مناہل پیدا ہوئے، پروان چڑھے۔ زندگی کی بہت سی خوشگوار بہاریں انہوں نے اس گھر میں دیکھی تھیں۔ پھر امیر علی سے جدائی کا ابدی غم بھی انہوں نے اس گھر میں برداشت کیا تھا۔ یہ گھر ان کے لیے اینٹ پتھر اور سیمنٹ سے تعمیر کردہ محض ایک عمارت نہ تھا بلکہ ان کے خوابوں کی جنت اس گھر میں تھی۔ اب جنت میں اب ایک شیطان گھس آیا تھا جس نے انہیں دربدر کرنے کی ٹھان لی تھی۔ بوا نے بھی اپنی عمر کا بڑا حصہ اس گھر میں گزارا تھا۔ انہیں بھی بے حد دکھ نے گھیرا ہوا تھا۔ دل گرفتہ زرینہ کو انہوں نے تسلی دی تو وہ پھیکے انداز میں مسکرائیں جس میں اداسی کا رنگ رچا ہوا تھا۔

"بوا صبح جلدی نکلنا ہے۔ اس لیے اب سو جانا چاہیے۔" انہوں نے اپنے آنسو پیتے ہوئے بوا سے نظر چرائی تو بوا نے فوراً" اثبات میں سر ہلایا۔

☼ ☼ ☼

عنیزہ اور ملک ایبک دونوں دعوت نامہ لے کر امیر علی کے گھر پہنچے تھے۔ بیل بجانے پہ اندر سے جو صاحب برآمد ہوئے وہ ان دونوں کے لیے تو اجنبی تھے ہی، لیکن اس گھر کے مکینوں سے بھی ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ انہوں نے حال ہی میں یہ گھر خریدا تھا اور پرانے مالک مکان کے بارے میں وہ لاعلم تھے۔

ملک ایبک اور عنیزہ واپسی کا ارادہ باندھ ہی رہے

تھے جب وہاں گیٹ پہ وہاب کی گاڑی رکی۔ وہ گیٹ پہ ایک اجنبی صورت کو بے تکلف انداز میں کھڑے دیکھ کر سٹ پٹا سا گیا۔ واپسی کے لیے مڑتی قیمتی گاڑی کو بھی اس نے بغور دیکھا تھا۔

"السلام علیکم" وہ گیٹ کے بیچوں بیچ کھڑے عباس احمد سے مخاطب ہوا۔

"جی میں وہاب ہوں آپ کون اور یہ اس طرح یہاں کیوں کھڑے ہیں؟" اپنا تعارف کرواتے اور آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس کا لہجہ خود بہ خود ہی سخت سا ہو گیا۔

"میں اس گھر کا نیا مالک عباس احمد ہوں۔" اجنبی صورت نے اپنا تعارف کروایا تو وہ پریشانی سے انہیں تکنے لگا جیسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہو۔

"یہ گھر میری خالہ زرینہ امیر علی کا ہے تین دن پہلے تک تو وہ یہاں ہی تھیں۔"

"میں کل ہی اپنی فیملی کے ساتھ شفٹ ہوا ہوں۔ میں کسی زرینہ امیر علی سے واقف نہیں ہوں میں نے یہ گھر بروکر کے توسط سے خریدا ہے۔" عباس احمد کے بتانے پہ حیرتوں کے جال وہاب کے چہرے پہ پھیلتے جا رہے تھے۔

"آپ نے یہ گھر کب خریدا ہے؟" حیرت کی جگہ اب شدید غیض و غضب اور اشتعال نے لے لی تھی۔

"میں نے یہ گھر پچھلے ہفتے ہی خریدا ہے اور تمام ادائیگی بھی کر دی ہے۔" عباس احمد تفصیل بتانے کے ساتھ ساتھ وہاب کے تاثرات کا بھی بغور جائزہ لے رہے تھے۔

وہ اپنی گاڑی اسٹارٹ کر کے وکیل کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں سب سے پہلا نام وکیل کا آیا تھا۔ امیر علی کا وکیل مکان کی فروخت اور زرینہ خالہ کی موجودہ رہائش سے یقیناً واقف ہوتا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ وکیل صاحب کے آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پے در پے سوالات پہ انہوں نے مکمل حیرت اور لاعلمی کا اظہار کیا۔

"مجھے قطعی طور پہ علم نہیں ہے کہ زرینہ بیگم نے مکان فروخت کر دیا ہے کم سے کم انہیں مجھے تو بتانا چاہیے تھا۔" وکیل صاحب خود الجھے ہوئے تھے۔

"یہ آپ میرا نمبر رکھ لیں جب بھی خالہ آپ سے رابطہ کریں مجھے اس نمبر پہ اطلاع کر دیجیے گا۔" وہاب نے کارڈ پہ لکھا اپنا نمبر انہیں دیا۔

"جی ضرور۔" وکیل صاحب خوش دلی سے بولے۔

وہاب ان کے آفس سے نکلا تو انہوں نے زرینہ بیگم کو فون کر کے وہاب کی آمد سے مطلع کیا۔ وہاب کو دیکھتے ہی انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے پتا چل چکا ہے تب ہی وہ ان کے پاس آیا ہے۔ انہوں نے خوب صورتی سے ٹال دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بدن کی قید سے نکلیں تو اس نگر جائیں
جہاں خدا سے کسی شب مکالمہ ہوگا
جہاں یہ روح کا بھی کوئی حق ادا ہوگا
نہ دل کو تنگ کرے گی حصول کی خواہش
نہ کوئی خدشہ لاحاصل ستائے گا
ہمیں قبول نہ ہوگی صدائے نوحہ گری
کہ پھر وصول نہ ہوگی شکست سادہ دلی
نہ مرحلے وہ شفقت کے پیش جاں ہوں گے
کہ جن کے خوف سے لب تمنا بھول جاتے ہیں
نہ ایسی شب کی مسافت کا سامنا ہوگا
جہاں یہ چراغ وفا نہیں جلتا
لبوں کی شاخ پہ حرف دعا نہیں کھلتا
کہیں پہ کوئی مزاج آشنا نہیں ملتا
عذاب ترک مطلب سے بھی اب مکر جائیں
زمین کی قید سے نکلیں تو اس نگر جائیں
جہاں خدا سے کسی دن مکالمہ ہوگا
جہاں یہ روح کا بھی کوئی حق ادا ہوگا

زیان نے نماز پڑھ کر بہت دل سے دعا مانگی۔ وہ عنیزہ بیگم کا انتظار کر رہی تھی وہ شہر گئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اپنے وعدے کے مطابق بوا کو ساتھ لے کر

آنا تھا۔ زیان کا ٹائم ہی نہیں گزر رہا تھا۔ وہ نماز کی ادائیگی کے بعد اسی جگہ بیٹھی ہوئی تھی' جب باہر سے چہل پہل اور مخصوص آوازیں آنا شروع ہوئی۔ یہ اس بات کا اظہار تھا کہ عنیزہ واپس آگئی ہیں اور سب الرٹ ہو گئے ہیں۔ اس نے اشتیاق سے باہر جھانکا کہ بوا بھی ہوں گی۔ پر عنیزہ اکیلی تھیں اور اسی کی طرف آرہی تھیں۔ مایوسی اور ناکامی ان کے چہرے پہ لکھی تھی۔

"کیا بوا اور زرینہ آنٹی نے آنے سے انکار کر دیا ہے۔" سب سے پہلے یہی سوچ اس کے دماغ میں آئی۔ وہ عنیزہ کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔

"وہ لوگ گھر چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ہیں اور ان کے نئے گھر کا کسی کو بھی علم نہیں ہے۔ میں بہت شرمندہ ہوں' اپنا وعدہ پورا نہ کر سکی۔" عنیزہ کی آواز میں ندامت اور شرمندگی تھی جیسے ان کا قصور ہو۔

"بھلا وہ لوگ گھر چھوڑ کر کہاں جا سکتے ہیں۔ میرے آنے تک تو ایسا کچھ نہیں تھا۔ کیوں گئے ہیں وہ ایسے۔" زیان خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔ کوئی لفظ عنیزہ کی سماعتوں تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔

"آپ کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے آپ کی شرمندگی سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ کوئی نقصان ہے۔ گزر جانے والے لمحوں کی تلافی آپ کر نہیں پائیں گی۔ زرینہ آنٹی نے گزرتے اٹھارہ برس میں اٹھارہ ارب مرتبہ مجھے بتایا ہے کہ تم ایک سال چند ماہ کی تھیں جب تمہاری ماں تمہیں چھوڑ گئی تھی۔ ایک سال ڈیڑھ سال کیا عمر ہوتی ہے۔ بچے کو اپنا تک پتا نہیں ہوتا' ماں ہی ماں اس کے لیے سب کچھ ہوتی ہے۔ بچے کی زبان ضرور تیں وہی سمجھ سکتی ہے۔ زرینہ آنٹی میرے سامنے آفاق' رابیل' مناہل کو چومتیں' گلے لگاتیں' لاڈ کرتیں' اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتیں۔"

بولتے بولتے زیان لمحہ بھر کے لیے رکی اور دھواں دھواں چہرے والی عنیزہ کی سمت دیکھا جن کی آنکھوں میں حیرانی' دکھ' افسوس' بے چارگی' لاچاری' درماندگی سمیت جانے کون کون سا جذبہ رقم تھا۔

"لیکن میری ماں میری ساتھ نہیں تھی۔ انیس سال تک بوا نے میری پرورش کی' ماں بن کر' باپ بن کر' دوست بن کر' ان کے روپ میں میرے سب رشتے تھے۔ وہ میری ماں بھی تھیں' میری بہن بھی' میرا بھائی بھی' میرا باپ بھی اور میرا دوست بھی۔ وہی میری ہمدرد تھیں۔ مجھے ایک ایک پل' ایک ایک لمحہ یاد ہے جب مجھے ماں کی ضرورت پڑی بوا نے میری انگلی تھام لی۔ زرینہ بیگم اور امیر علی میری ماں کے خلاف زہر اگلتے رہے۔ ماں کا نام تک لینے پہ پابندی تھی گھر میں۔ پر بوا رات کی تنہائیوں میں چھپ چھپ کر مجھے ماں کی ماں' جیسی پری کی کہانیاں سناتی رہیں۔ وہ کوئی بری بات کر ہی نہیں سکتی تھیں' انہوں نے میری ماں کو بھی چاند کی پری بنا کر پیش کیا۔ کبھی وہ ماں کو پھولوں کی تتلی کی روپ میں ڈھالتیں تو کبھی بادلوں کی رانی کا خطاب دیتیں' لیکن وہ سب جھوٹ تھا۔ میں پانچ سال کی تھی جب زرینہ آنٹی نے مجھے بتایا کہ تمہاری ماں اپنے عاشق کی خاطر تمہیں اور تمہارے باپ کو چھوڑ گئی تھیں۔ میری وہ عمر ایسی نہیں تھی جو ایسے بوجھ سہار سکتی۔ میں پانچ سال کی عمر سے ہی بالغ ہونا شروع ہو گئی تھی۔

بوا مجھے بتاتیں تمہاری ماں مجبور تھی' لیکن زرینہ آنٹی کہتیں تمہاری ماں عشق کے ہاتھوں مجبور تھیں۔ بوا پردے ڈالتیں' زرینہ آنٹی پردے چاک چاک کر دیتیں۔ کوئی ماں ایسا نہیں کرتی اپنی سگی اولاد کو ایسے چھوڑ جائے' بھول جائے۔ میری ماں میری ڈیڑھ سال کی عمر میں ہی مر گئی تھی۔ وہ صرف محبوبہ تھی جو مجھے' اپنے شوہر کو لات مار کر محبوب کے ساتھ چلی گئی تھی۔ اس ماں کے حوالے سے میں نے بہت دکھ اور رسوائی سہی ہے۔ میری ماں تو صرف بوا تھیں۔ میں اپنی ماں کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ اکیلی ہوں نا اس لیے اس موقع پہ ان کی ضرورت محسوس کر رہی ہوں۔ آپ میری ماں نہیں ہیں اس لیے آپ کو شرمندہ ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ آپ کو پتا ہے میں نے اللہ

سے اٹھارہ برسوں میں ایک ہی دعا مانگی ہے۔" عنیزہ یک ٹک اسے دیکھے جارہی تھیں انہیں ایسا لگ رہا تھا ان کی تمام طاقت توانائی اور قوت برداشت ابھی تھوڑی ہی دیر میں ختم ہو جائے گی۔

"آپ جانتی ہیں وہ کیا دعا تھی؟" اس کی آنکھوں اور ہونٹوں پہ سوال تھا۔ عنیزہ کا سر بے اختیار نفی میں ہلا۔

"وہ یہ دعا تھی کہ اے اللہ مجھے اس عورت سے ملا دے ایک بار اس کی شکل دکھا دے۔ جس نے مجھے پیدا کیا جو مجھے اس دنیا میں لائی۔ پتا ہے میں یہ دعا کیوں مانگا کرتی تھی؟"

ایک بار پھر عنیزہ کا سر پھر نفی میں ہلا۔

"میں یہ دعا اس لیے مانگا کرتی تھی کہ میں اپنی نام نہاد ماں کو بتا سکوں کہ میں اس سے کتنی شدید نفرت کرتی ہوں۔ کل وہ با اختیار طاقت ور تھی سب حق رکھتی تھی۔ آج میں بھی طاقت ور ہوں اس پوزیشن میں ہوں اپنی نام نہاد ماں کو اپنی زندگی سے ایسے ہی کک آوٹ کروں جیسے اٹھارہ سال پہلے اس نے مجھے ٹھوکر ماری تھی۔" زیان کا ہر ہر جملہ ایک ایک لفظ پنا تلا تھا۔ وہ پورے اعتماد کے ساتھ بول رہی تھی۔ عنیزہ جیسے اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتی چلی جارہی تھیں۔ کوئی ایسی نفرت بھی کسی سے کر سکتا ہے جیسی زیان نے ان سے کی ہے۔

"آپ یہاں سے تشریف لے جاسکتی ہیں۔" وہ لمحوں میں ہی اجنبی بن گئی تھی۔

"دیکھو پلیز! ایسے مت کہو۔" عنیزہ کا انداز گڑگڑانے والا تھا۔ زیان نے دروازہ پوری قوت سے باہر کی طرف کھولا اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی جیسے عنیزہ کی کوئی بات بھی نہ سننا چاہ رہی ہو۔

دروازے کے پیچھے چھپی نہنال کو ادھر ادھر ہونے کی مہلت بھی نہ مل سکی تھی کیوں کہ زیان نے اچانک ہی تو دروازہ کھولا تھا۔ اسی دروازے نے اسے چھپا کر اس کا بھرم رکھ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ اندر سے عنیزہ باہر آتیں نہنال دروازے کے پیچھے سے نکل کر ایک طرف چل دی۔ آج اس پہ بڑے بڑے رازوں کا انکشاف ہوا تھا۔ دل و دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ اپنی کچھ چیزیں لینے آئی تھی جب دروازے کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے زیان کی آواز سنی۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ دروازے سے کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگی۔ خاموش خاموش زیان کی آواز آج تو سماعتوں کو حیران کر رہی تھی وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس نے ابھی جو کچھ سنا ہے وہ زیان نے ہی کہا ہے۔

☆ ☆ ☆

آئینے کچھ تو بتا! ان کا ہمراز ہے تو
تو نے وہ زلف وہ مکھڑا وہ دہن دیکھا ہے
ان کے ہر حال کا بے ساختہ پن دیکھا ہے
وہ نہ خود دیکھ سکیں جس کو نظر بھر کے کبھی
تو نے جی بھر کے وہ ہر خط بدن دیکھا ہے
ان کی تنہائی کا دل دار ہے تو دم ساز ہے تو
آئینے کچھ تو بتا ان کا ہمراز ہے تو
شوخ معصوم جواں مست تخیل بے پروا
کیا وہ خود اپنے یہ انداز دیکھتے ہیں
ان کے جذبات کی سہمی ہوئی آواز ہے تو
آئینے کچھ بتا ان کا ہمراز ہے تو

ملک ایک محویت کے عالم میں زیان کی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ معاذ کچھ دیر پہلے ہی کیمرا اسے دے کر گیا تھا۔ ایبک نے ایک ایک کر کے سب تصویریں دیکھ ڈالیں۔ پیلے کپڑوں، پیلے دوپٹے کے ہالے میں موتیوں کے گجروں سمیت وہ پہلے سے بڑھ کر دلفریب اور حسین لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے ابھی پلکوں کو چھوا تو رو پڑے گی۔ اس کے پورے چہرے اور آنکھوں میں اداسی رچی ہوئی تھی۔ ایبک تکیہ بازوؤں میں دبائے لیٹا ہوا زیان کے کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سب لائٹیں آن تھیں پردہ خود نیچے تھی۔ مایوں بیٹھنے کے بعد اس کا داخلہ اوپر ممنوع ہو گیا تھا۔ اس لیے ایک ہفتے سے ایبک نے اس کی کوئی

جھلک نہیں دیکھی تھی۔ آخری بار جب وہ اس کے کمرے میں گیا تھا تب اسے ملا تھا اور دیکھا تھا۔ اسے شادی پہ اعتراض نہیں تھا تب ہی دونوں طرف سے جھٹ پٹ تیاری ہوئی۔ پرسوں ذیان نے مسز ایبک بن کر اس کے پاس آجانا تھا۔ ایبک کے پاس اس موقعے پر بہت سے سوالات تھے' جن کے جوابات اسے ذیان سے حاصل کرنے تھے۔ فی الحال تو اسے معاذ کا شکریہ ادا کرنا تھا جس نے ذیان کی فوٹو بنا کر اسے دکھائی تھیں۔

افشاں بیگم کو وہ بھاگئی تھی اور ملک ایبک کو حیرت ہو رہی تھی کہ امی جان نے جب ذیان کے بارے میں اس کی رائے لی تو اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا بخوشی رضامندی دی۔ کیا اس میں ذیان کے بے تحاشا حسن کا عمل دخل تھا یا اس کی بے رخی ایبک کو بھڑکا گئی تھی یا پھر اسے واقعی ذیان اچھی لگی تھی۔ اسے پہلے بابا جان نے احمد سیال کی بیٹی کے لیے اپنی پسندیدگی ظاہر کی تھی تب ایبک دل سے آمادہ نہیں تھا۔ پر ذیان کے معاملے پہ ایسا نہیں ہو۔ افشاں بیگم کو آگاہ کرتے ہوئے وہ پوری طرح خوش اور مطمئن تھا۔ ملک ایبک نے اپنے سب جذبے' سب محبتیں وچاہتیں اپنی شریک حیات کے لیے سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔ ذیان یقیناً "بہت خوش قسمت تھی جو ایبک اس کا ہم سفر بن رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج ذیان کی طرف سے ملک ایبک کی مہندی جانی تھی۔ سب تیار ہو رہے تھے۔ گھر میں ذیان کے ساتھ عمر رسیدہ نوکرانیاں تھی اور ساتھ ملک ایبک کی ایک رشتے کی خالہ تھیں۔ سب ملک ایبک کی طرف جا چکے تھے۔ ایبک کی خالہ اس کے پاس سے اٹھ کر کسی کام سے باہر نکلی تھیں۔ ملک محل کے دوسرے رہائشی حصے سے ڈھول باجوں شور شرابے' ہنسی مذاق کی آوازیں' ہوا کے دوش پہ سفر کرتی بخوبی اس کے کانوں تک رسائی حاصل کر رہی تھیں۔ بلند آواز میں بجتے شادی بیاہ کے گانوں کی آواز اس کے علاوہ تھی جو اس کی سماعتوں کو گویا چیر رہی تھیں۔

وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اس کا ویران اداس سراپا بڑا واضح تھا۔ پیلے رنگ کے کپڑوں میں ملبوس اسے اپنا چہرہ کچھ اور بھی پیلا لگ رہا تھا۔ خود کو آئینے میں تکتے تکتے اسے ملک ایبک اور اس کی باتیں یاد آنے لگیں جب وہ شادی کے بارے میں رضامندی معلوم کرنے آیا تھا۔ وہ پچھتا رہی تھی کیوں ہاں کی ہے؟ اس کے پاس انکار کرنے کا سنہرا موقعہ تھا جو ملک ایبک کی معرفت اسے آسانی سے حاصل ہوا تھا۔ لیکن اس نے اپنی بیوقوفی سے گنوا دیا۔

وہ ایک بار انکار کر کے ملک ایبک کے تاثرات تو دیکھتی۔ بہت ناز ہو گا ملک ایبک کو خود پہ' اپنی شخصیت پہ' اپنے خاندان پہ۔ جب وہ انکار کرتی تو بے چارے ایبک کا سارا غرور' ناز مٹی میں مل جاتا۔ عنیزہ بیگم اس کی نام نہاد ماں' اسے اذیت دینے کا اچھا بہانہ تھا اس انکار سے ان کی کتنی توہین ہوتی وہ ملک جہانگیر' افشاں بیگم اور تو اور ملک ارسلان جیسے محبوب شوہر کی نگاہوں سے بھی گر جاتیں۔ عین وقت پہ۔ جب بارات لانے کی تیاری ہو رہی ہے پورے گاؤں کو رشتہ داروں کو ملک ایبک اور ذیان کی شادی کی خبر ہے' وہ خوشی منانے ملک محل میں جمع ہوئے ہیں' وہ اس موقعے پہ شادی سے انکار کرتی ہے تو کیسی رسوائی ہوتی ملک خاندان کی۔ بے چاروں کے اٹھے سر جھک جاتے۔ مگر اپنی بے وقوفی یا جلد بازی سے اس نے سب ضائع کر دیا۔ ذیان کے پاس پچھتانے کے لیے بہت کچھ تھا۔

اپنے اور ایبک کے ملن کے بارے میں سوچنے کے بجائے وہ بدلے' انتقام اور اذیت دینے کے طریقوں پہ غور کر رہی تھی۔ سوچتے سوچتے اس کا دماغ گھٹن سے بھر گیا۔ اس نے بے اختیار میکانکی انداز میں سب کھڑکیاں واکردیں اور خود ایک کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر لمبے لمبے گہرے سانس لینے لگی۔ اتنے میں آہٹ ہوئی۔ ملک ایبک کی رشتے کی خالہ واپس لوٹ آئی تھیں۔ اسے یوں کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر ان کی فکر و حیرانی بڑھی۔

"پتر کھڑکی کھول کے کیوں کھڑی ہو۔ ہٹو۔ ادھر سے اور اپنا چہرا چھپاؤ۔" انہوں نے بڑے آرام سے کھڑکیاں بند کردیں۔ زیان کو دل میں بے پناہ غصہ آیا۔

"تمہاری شادی میں کل کا دن باقی ہے ابھی سے اپنا چہرہ کھول کر کمرے سے باہر مت جھانکو تم مایوں کی دلہن ہو۔ سو چیزیں چمٹ جاتی ہیں۔ تمہیں کچھ ہو گیا تو سب میری جان کو آجائیں گے۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بول رہی تھیں۔

زیان خاموشی سے کچھ کہے بغیر بیڈ پہ جاکر بیٹھ گئی۔ اسے ایک کی رشتے کی خالہ سے اختلاف تھا' پر وہ کچھ بولنا نہیں چاہ رہی تھی۔ ادھر وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں اس کی معصومیت اور بے خبری پہ ترس کھا رہی تھیں۔

✡ ✡ ✡

مہندی کا ہنگامہ تھمے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی۔ عنیزہ واپس آچکی تھیں۔ ذہنی اور جسمانی تھکن نے انہیں جیسے نچوڑ کے رکھ دیا تھا۔ ان کی اذیت بھی حد سے سوا تھا۔ زیان نے زندگی میں پہلی بار ان سے اتنی طویل اور مکمل بھرپور گفتگو کی تھی۔ ہر ہر جملہ' ہر ہر لفظ' برچھی بن کر ان کے دل میں اترا تھا۔ وہ تو اس کی ماں ہی نہیں تھیں' بلکہ اپنے آشنا کے ساتھ جانے والی ہوس پرست عام سی عورت تھی۔ وہ عورت جو اپنی ڈیڑھ سال کی بیٹی کا خیال کیے بغیر' رحم کھائے بغیر اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ عنیزہ خالی الذہنی کے عالم میں کسی غیر مرئی چیز کو دیکھ رہی تھیں آنسو سلسلہ وار ان کی آنکھوں سے رواں تھے۔

انہیں خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب ملک ارسلان کمرے میں آئے۔ وہ اس وقت چونکیں جب انہوں نے عنیزہ کے کندھے پر تسلی دینے والے انداز میں ہاتھ رکھا۔ وہ بری طرح رو رہی تھیں۔ ارسلان ان کے پاس بیٹھ گئے۔

"تم زیان کی خاطر رو رہی ہو۔ ماں ہو ناں۔" عنیزہ نے ڈھل کر جیسے ان کی طرف دیکھا کیا اس دن کی باتیں انہوں نے سن تو نہیں لی تھیں۔ زیان نے ماں کے حوالے سے کیسی کیسی باتیں کی تھیں یقیناً" ارسلان کو غصہ آیا ہوگا کیونکہ وہ عنیزہ سے بے پناہ پیار کرتے تھے اور زیان کی باتوں میں کوئی صداقت بھی نہیں تھی۔ وہ اس کے پاس بیٹھ چکے تھے عنیزہ کے بہتے آنسو انہوں نے اپنے ہاتھ سے صاف کیے۔

"ہر ماں بیٹی کی رخصتی پہ روتی ہے اور تم خوش قسمت ہو کہ ہماری بیٹی رخصت ہو کر کہیں دور نہیں جارہی ہے۔ وہ اس گھر میں ہماری آنکھوں کے سامنے رہے گی۔ اس لیے تم دل چھوٹا مت کرو۔" وہ قدرے پرسکون ہوئیں صد شکر انہوں نے اس دن والی باتیں نہیں سنی تھیں۔ عنیزہ نہیں چاہتی تھیں ارسلان کے دل میں زیان کی طرف سے کوئی میل آئے۔

"تم سو جاؤ۔ کل کا دن بہت مصروف ہوگا۔" انہوں نے تکیے درست کرتے ہوئے عنیزہ کو کندھوں سے پکڑ کر بستر پر لٹایا۔ ارسلان تھکے ہوئے تھے پندرہ منٹ بعد ان کے ہلکے ہلکے خراٹے گونجنا شروع ہوگئے جو اس بات کا ثبوت تھے کہ وہ گہری نیند سو چکے ہیں۔ عنیزہ نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر ان کی طرف دیکھا اور پھر آہٹ پیدا کیے بغیر بستر سے اتر کر کھڑکی کے پاس بڑی ایزی چیئر پہ بیٹھ گئیں۔ آج کی رات نیند آنے والی نہیں تھی۔ یہ کرب و اذیت کی رات تھی' تکلیف دہ ماضی کی طرف اذیت ناک سفر کی رات تھی۔ انہوں نے اپنے تئیں ماضی کی طرف کھلنے والے ہر دروازہ پر' کھڑکی پر روزن بند کردیا تھا' پر ماضی زیان کی صورت زندہ تھا۔

✡ ✡ ✡

قاسم صاحب بہت خوش تھے۔ وہ کھانے پینے کی انواع واقسام کی اشیاء لے کر آئے تھے۔ عنیزہ نے اس سے پہلے انہیں بہت کم خوش دیکھا تھا۔

قاسم صاحب بیٹی کے رشتے کی طرف سے بے حد پریشان تھے۔ ان کے دیرینہ دوست نے ان سے امیر علی کے خاندان کا ذکر کیا تھا اور وہ لوگ عنیزہ کو دیکھنے

آرہے تھے۔ قاسم صاحب بہت خوش تھے۔ ان کی دلی خوشی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

امیر علی کے گھر سے ان کی والدہ' دور پرے کے رشتے کے چچا اور دو رشتہ دار خواتین آئی تھیں۔ امیر علی کے گھر والوں کو عنیزہ بے پناہ پسند آئی تھی۔ پہلی ملاقات میں ہی ان کی کوشش تھی کہ قاسم صاحب سے جواب لے کر جائیں۔ مگر انہوں نے رسمی طور پر سوچنے کی مہلت طلب کی تھی۔ مہمان بہت خوش خوش رخصت ہوئے مگر عنیزہ کے دل میں سناٹے پھیلنا شروع ہو چکے تھے۔

ارسلان پاکستان سے باہر تھا۔ اس سے بہت کم رابطہ ہو پاتا تھا۔ خط لکھنے سے اسے عنیزہ نے خود ہی منع کیا ہوا تھا۔ فون ان کے گھر نہیں تھا۔ عنیزہ کو جب کبھی ارسلان سے بات کرنی ہوتی تو اپنی ایک کلاس فیلو کے گھر چلی جاتی جسے ارسلان اور عنیزہ کے دلی معاملات کا علم تھا۔ ارسلان اس مشترکہ کلاس فیلو کو فون کر کے دن اور ٹائم بتا دیتا مقررہ ٹائم پہ عنیزہ کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جاتی۔ ابھی دو دن پہلے ہی تو ارسلان سے اس کی بات ہوئی تھی وہ اپنے امتحانات کی تیاری میں مصروف تھا۔ زیادہ دیر بات نہیں ہو پائی تھی۔ وہ بے حد پریشان تھی۔ قاسم صاحب اپنی خوشی میں اس کی اداسی کو محسوس ہی نہیں کر پائے۔ وہ اس کے پاس بیٹھے امیر علی کی فیملی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔

"امیر علی بہت اچھے خوش حال خاندان سے ہے۔ میری خواہش تھی کہ میری بیٹی خاندانی لوگوں میں بیاہ کر جائے۔ اللہ نے جیتے جی میری خواہش پوری کر دی ہے۔ تمہاری ماں کے بعد میں دعائیں مانگتا تھا کہ میری بیٹی عزت سے اپنے گھر کی ہو جائے۔ میں زندگی کا بوجھ اکیلے ڈھوتے ڈھوتے تھک گیا ہوں۔" بولتے بولتے قاسم تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوئے تو عنیزہ نے ان کا چہرہ دیکھا۔ وہ ایک پریشان حال باپ کا چہرہ تھا جس پہ وقت اور مسائل نے بے پناہ جھریاں قبل از وقت ہی ڈالی تھیں۔

"تمہاری ماں زندہ ہوتی تو خود تم سے یہ سب باتیں کرتی' سمجھاتی۔" وہ پھر گویا ہوئے۔ عنیزہ کا چہرہ اور تاثرات جیسے جامد ہو رہے تھے۔ وہ سر جھکائے آنکھیں نیچی کیے بیٹھی تھی۔ قاسم صاحب سمجھ رہے تھے وہ شرما رہی ہے۔

"میں جلدی تمہاری شادی کرنا چاہتا ہوں تاکہ عزت سے مر سکوں۔" وہ آخری جملہ بول کر اس کے پاس سے اٹھ گئے تھے۔

آج سے پہلے وہ سوچا کرتی تھی کہ اگر ارسلان سے دور ہو گئی تو مر جائے گی ان کے درمیان کوئی تیسرا آیا تو وہ سہ نہیں پائے گی' اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا' پھٹ جائے گا۔ مگر اب امیر علی اس کا امیدوار بن کر درمیان میں آگیا تھا اور اس کا دل ریزہ ریزہ بھی نہیں ہوا تھا۔

ابو خوش تھے' اس کی باعزت رخصتی کے خواب آنکھوں میں سجائے بیٹھے تھے۔ وہ بے بس و مجبور بت جواہی تو تھی۔ صرف کڑھ سکتی تھی' اپنے خوابوں کا ماتم کر سکتی تھی اور وہ کر رہی تھی۔

قاسم صاحب کو بہت جلدی تھی وہ امیر علی کے گھر گئے ہوئے تھے۔

عنیزہ' قاسم صاحب کے جانے کے بعد اپنی کلاس فیلو راحت سے ملنے چلی گئی۔ وہ عنیزہ کا ویران اجڑا سراپا دیکھ کر ہی جان گئی کہ وہ وقت آن پہنچا ہے' جو عنیزہ جیسی متوسط طبقے کی لڑکیوں کے نصیب میں ہوتا ہے۔ عنیزہ کے آنسو اس کے دل کو موم کر رہے تھے۔ ملک ارسلان کے دیئے گئے نمبر پہ عنیزہ نے راحت کے گھر بیٹھ کر کئی بار کال کی لیکن نمبر نہیں مل رہا تھا۔ امریکہ کے جس شہر میں ملک ارسلان بغرض تعلیم مقیم تھا وہاں شدید سردی اور کئی کئی انچ پڑنے والی برف نے نظام زندگی مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔

عنیزہ کو پورا یقین تھا ارسلان سے اس کی بات ہو جائے تو وہ فوراً" سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لوٹ آئے گا۔ پلک جھپکتے سب بدل جائے گا' وہ اپنے گھر والوں کو راضی کر کے لے آئے گا اور وہ دونوں اس دنیا میں رہیں گے جو انہوں نے اپنے خوابوں میں سجا رکھی

ہے۔

ارسلان سے بات کرنے کی کوشش مکمل طور پر ناکام ہوگئی تھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے گھر لوٹی۔ قاسم صاحب ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ عنیزہ تکیے میں منہ چھپا کر روتی رہی۔ قاسم صاحب امیر علی کے گھر سے کھانا کھا کر وہیں سے ہی اپنے دوست کے ساتھ اس کے گھر چلے گئے تھے۔ انہیں بیٹی کی شادی' دیگر معاملات میں ان سے مشورہ کرنا تھا۔

اگلے دن قاسم صاحب نے امیر علی کے رشتے کے لیے ہاں کہلوا دی تھی۔ عنیزہ کا رونا دھونا' آنسو' آہیں سب بے کار گئے۔ سب فریادیں دل میں ہی دبی رہ گئیں۔ اس کی اور ارسلان کی محبت کا پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا چکا تھا۔ امیر علی کے گھر والوں کو بہت جلدی تھی۔ وہ جھٹ منگنی پٹ بیاہ کے چکر میں تھے۔

ارسلان ایگزامز سے فارغ ہوا تو عنیزہ کی یاد دل پہ بری طرح حملہ آور ہوئی۔ اسے پتا تھا' وہ اس کے فون نہ کرنے پہ سخت ناراض ہوگی۔ ایک تو ایگزامز کی مصروفیت تھی اوپر سے قدرتی آفت کی وجہ سے موسم خراب تھا وہ چاہنے کے باوجود بھی عنیزہ سے رابطہ نہیں کرپایا تھا۔

اس نے راحت کو کال کی۔ عنیزہ کی بابت پوچھنے پہ جو جواب ملا اس نے ارسلان کے ہوش ہی اڑا دیے دل کی دنیا جو اس نے بڑے ارمانوں سے ننھے منے حسین خوابوں سے سجائی تھی وہ اجڑ گئی تھی۔ راحت بتا رہی تھی کہ آج عنیزہ کا ولیمہ ہے وہ اس میں شرکت کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ ارسلان سائیں سائیں کرتے کانوں سے سن رہا تھا الفاظ تھے کہ پگھلا ہوا سیسہ۔

اس پہ شدید نوعیت کا ڈپریشن حملہ آور ہوا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے رونے لگتا۔ ملک جہانگیر چند دن میں ہی اس کے پاس امریکہ پہنچ گئے تھے۔ ان کے گلے لگ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رویا۔

"بھائی جان میں زندہ نہیں رہ پاؤں گا عنیزہ کے بغیر۔ وہ چلی گئی ہے میں نے بہت دیر کردی ہے ناں۔"

وہ اونچا لمبا مرد بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ ملک جہانگیر نے پہلی بار اسے ایسے دیکھا تھا۔ وہ ڈر گئے تھے کہ ارسلان خود کو نقصان نہ پہنچالے۔ وہ اسے اپنے ساتھ پاکستان لے آئے۔ یہاں بھی اس کی وہی حالت تھی بلکہ اب تو وہ پہلے سے زیادہ قابل رحم ہوگیا تھا۔ یہاں اسے عنیزہ اور بھی زیادہ یاد آنے لگی تھی۔ وہ بری طرح روتا اپنے بال نوچتا۔ وہ پاگل پنے کی حدود کو چھو رہا تھا۔ ملک افتخار بیٹے کے اس دکھ کو لے کر قبر میں ابدی نیند جا سوئے۔

ملک ارسلان پہلے سے بھی زیادہ ڈپریشن کا شکار ہوگیا تھا۔ وہ پہروں خاموش رہتا' خلاؤں میں گھورتا۔ افشاں بیگم اور ملک جہانگیر نے اسے شادی کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی پر وہ تو کف اڑانے لگا' اسے صرف عنیزہ چاہیے تھی۔

ملک جہانگیر نے بہترین ڈاکٹرز اور سائیکاٹرسٹ سے رجوع کیا انہوں نے انٹی ڈپریشن میڈیسن کے نام پہ سلیپنگ پلز دے دیں۔ ملک ارسلان سویا رہتا۔ اس کے اعلا تعلیم حاصل کرنے کا خواب آنکھوں اور دل تک ہی محدود رہ گیا تھا۔ ملک جہانگیر اس کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتے۔ وہ دنیا سے بے خبر ہوش و حواس سے بے گانہ ہوگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شادی کے بعد امیر علی کے ساتھ عنیزہ کی زندگی نارمل ڈگر پہ رواں دواں تھی۔ باقی سب ٹھیک تھا بس عنیزہ کے دل کا ایک حصہ ویرانیوں کی زد میں تھا۔ اپنے گھر سے روتی دھوتی سسرال میں آئی تھی۔ امیر علی کے سر پہ اس کے حسن کا جادو چڑھ چکا تھا۔ شادی کے شروع میں وہ سمجھ ہی نہیں پایا کہ عنیزہ اس قدر اداس اور چپ چپ کیوں رہتی ہے۔ حالانکہ وہ گھر کے سب کاموں میں حصہ لیتی' سب کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی ہنستی بولتی مگر اکثر اوقات ایسا لگتا جیسے یہ مسکراہٹ مانگے کی ہے اس کے قہقہے مستعار لیے ہوئے ہیں۔

امیر علی کا اپنا کاروبار تھا وہ دس بجے ناشتا کر کے آرام سے آفس جاتا۔ اس کے جانے کے بعد عنیزہ بوا رحمت کے ساتھ ان کے منع کرنے کے باوجود کاموں میں لگ جاتی۔ کپڑے دھونے پہ آتی تو گھر بھر کے کپڑے جمع کر لیتی کھڑکیوں دروازوں کے پردے تک اتار لیتی۔ حالانکہ اسے کپڑے دھونے کی ضرورت نہیں تھی اس مقصد کے لیے امیر علی نے تین تین ملازمائیں رکھ چھوڑی تھیں۔

عنیزہ خود کو کاموں میں غرق کر کے ارسلان کی یادوں سے پیچھا چھڑانا چاہ رہی تھی۔ اس نے پوری ایمانداری کے ساتھ امیر علی کے ہمراہ زندگی کا یہ نیا سفر شروع کیا تھا۔ گھر میں سب ہی اس سے خوش تھے۔ بوا رحمت تو اسے بہت پیار کرتی تھیں۔ چپ چپ بھیگی بھیگی آنکھوں والی عنیزہ انہیں بہت اچھی لگتی تھی۔ اس نے کسی کو بھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

امیر علی کے ساتھ شادی کے چند ماہ بعد ہی عنیزہ کی ساس کا انتقال ہو گیا۔ اسی دوران اس کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے خوش خبری سنائی تو امیر علی کے تن من میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مگر عنیزہ کی کھوئی کھوئی حالت مستقل طور پر انہیں ڈسٹرب کرنے لگی۔ پتا نہیں ہنستے وقت آنکھیں عنیزہ کا ساتھ کیوں نہیں دیتی تھیں۔ وہ روبوٹ کی طرح ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتی جس میں صرف اس کا ساتھ جسم دیتا اور روح دور پیچھے بہت پیچھے ارسلان کے پاس رہ جاتی۔

ویسے بھی وہ امیر علی کے پاس ان کے گھر میں صرف اپنا جسم ہی لے کر تو داخل ہوئی تھی 'روح ارسلان کے پاس رہ گئی تھی۔ اس کے خواب ارسلان کے پاس رہ گئے تھے۔ وہ محض گوشت پوست کا ڈھیر تھی جس میں کوئی جذبہ اور احساس نہیں تھا۔

قاسم صاحب اسے ملنے آئے تو اسے اتنے بڑے گھر کی مالکن کے روپ میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ عنیزہ کی اندرونی حالت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اب تو امیر علی اس کی خاموشی سے چڑنے لگے تھے۔ ان ہی خاموشیوں کے درمیان عنیزہ نے بیٹی کو جنم دیا۔

☆ ☆ ☆

ملک جہانگیر اس لڑکی کا پتا چلانے کی کوشش کر رہے تھے جس کی وجہ سے ملک ارسلان ان کا لاڈلا چھوٹا بھائی ان حالوں کو پہنچا تھا۔ اس تلاش کے دوران ان کے ہاتھ ارسلان کی ڈائری لگی جس میں بہت سے نمبر لکھے ہوئے تھے۔ اس میں راحت کا نمبر بھی تھا۔ وہ ایک دن سراغ لگانے کے بعد خاموشی سے راحت کے گھر پہنچ گئے۔ وہ بے حد خوف زدہ ہوئی۔ ملک جہانگیر کا کروفر اور شاہانہ جاہ و جلال بتا رہا تھا کہ وہ عام سی شخصیت نہیں ہیں۔ جہانگیر سمجھ رہے تھے کہ راحت ہی وہ لڑکی ہے جس کی وجہ سے ارسلان کی یہ حالت ہوئی ہے پر راحت سے ملنے کے بعد ان کی یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔

راحت سے ملنے کے بعد ان کی مایوسی بڑھ گئی تھی امید کے سب جلتے دیے ایک ایک کر کے بجھ گئے تھے۔ جس لڑکی کی محبت میں ارسلان سودائی ہو گیا تھا' وہ تو اپنا گھر بسا کر ایک بیٹی کی ماں بھی بن چکی تھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے واپس لوٹے تھے۔

ملک جہانگیر کی آمد اور ارسلان کی موجودہ حالت راحت کے لیے بہت بڑی خبر تھی۔ وہ عنیزہ کو بتانے کے لیے بے چین تھی۔

امیر علی حسب معمول آفس میں تھے۔ شام کو راحت عنیزہ کے پاس پہنچی۔ ملک جہانگیر کی آمد سے لے کر ملک ارسلان کی حالت تک اس نے الف تا یے سب عنیزہ کے گوش گزار کر دیا۔

اسے جوش جذبات میں امیر علی کے آنے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔ وہ راحت کی زبان سے نکلا ایک ایک لفظ سن چکا تھا۔ پر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کچھ دن تک اس نے بہت مشکل سے خود پہ قابو پائے رکھا اور اپنا رویہ نارمل رکھا۔ مگر کب تک اس کے اندر جوار بھاٹا ابل رہا تھا۔ اس نے بہت دھیمے سے لہجے میں عنیزہ سے باز پرس کی۔ وہ ابھی اتنی پختہ اور چالاک

نہیں ہوئی تھی کہ کچھ چھپا پاتی۔ اس نے بہت سادگی سے ارسلان کے یونیورسٹی میں ملنے اور پھر باہم پسندیدگی کا بتایا۔ اس کے دل میں چور نہیں تھا کیونکہ اس نے اپنی زندگی ایمان داری کے ساتھ امیر علی کے گھر سے شروع کی تھی۔ ٹھیک تھا اس کے دل اور یادوں میں ارسلان کا قبضہ تھا پر اس نے امیر علی کی امانت میں خیانت نہیں کی تھی نہ ایسا کرنے کا سوچا تھا۔

امیر علی جیسے تنگ دل، تنگ نظر شوہر کے نزدیک اس کا جرم ناقابل معافی تھا۔ حالانکہ وہ عنیزہ کا ماضی تھا، خود امیر علی کا ماضی ایسی پسندیدگی سے خالی نہیں تھا پر عنیزہ عورت تھی اس لیے سزا کے لائق تھی۔ اس نے اسی ٹائم سزا سنا دی۔ کھڑے کھڑے عنیزہ کو گھر سے نکال دیا۔ ایک سال تین ماہ کی زیان کو امیر علی نے عنیزہ کی گود سے چھین لیا تھا۔ عنیزہ روئی، تڑپی، فریادیں کیں، واسطے دیے پر امیر علی کا دل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پتھر ہو چکا تھا۔ اسے باپ کے گھر زبردستی بھیجنے کے ایک ہفتہ بعد اس نے عنیزہ پہ وہ ستم بھی توڑ ڈالا جس سے ہر شریف عورت ڈرتی ہے۔ امیر علی نے اسے طلاق دے دی تھی۔ عنیزہ نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اسے زیان مل جائے پر وہ کمزور عورت تھی، ساتھ قاسم صاحب کی اپروچ نہ ہونے کے برابر تھی۔ امیر علی بزور طاقت جیت گیا۔ طلاق کے ساتھ بدنامی و رسوائی اور بدکرداری کا طعنہ بھی امیر علی نے عنیزہ کی جھولی میں ڈالا تھا۔ ایک مرد ہونے کے ناطے اس نے وہ سب کیا تھا جو وہ کر سکتا تھا۔ وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی قصوروار تھی۔ اس پہ دنیا بھر کے جھوٹے الزامات تھوپ کر امیر علی سچا اور مظلوم بن گیا تھا۔ خاندان میں ہر کوئی اسے اپنی بیٹی دینے کے لیے تیار تھا۔

حالانکہ عنیزہ نے اپنا گھر بچانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی وہ امیر علی کے پاؤں پہ اپنا سر تک رکھ کر دیکھ چکی تھی۔ پر وہ ماضی بھولنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ شادی کے بعد عنیزہ کا ملک ارسلان کے ساتھ کوئی رابطہ بھی نہیں تھا۔ اسے امیر علی نے معاف نہیں کیا تھا۔ کیونکہ خدا معاف کرتا ہے اور وہ انسان تھا عام سا انسان۔

☼ ☼ ☼

زیان نے احساس سے عاری، خالی دل خالی جذبوں کے ساتھ نکاح نامے پہ سائن کیے۔ نینال اس کی پشت پہ کھڑی اس کے حنائی ہاتھوں میں تھامے سنہری پین کو دیکھ رہی تھی، جس سے زیان نے نکاح نامے پہ سائن کیے تھے۔ زیان کی پشت اس کی سمت تھی۔ نکاح کے لیے مولوی صاحب دیگر مردوں کے ہمراہ جن میں ملک جہانگیر، ملک ارسلان اور دوان کے خاندان کے اور مرد تھے، زیان کے پاس آئے تھے۔ ایجاب و قبول اور نکاح کے بعد وہ جا چکے تھے۔ سب عورتیں عنیزہ کو مبارک باد دے رہی تھیں۔ نینال وہاں کھڑی زیان کی پشت کو گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے لپک رہے تھے۔ زیان کی طرف نفرت سے اٹھی جھلستی نگاہیں معاذ کے دماغ پہ نقش ہو گئی تھیں۔ وہ اس کا دیکھنا، دیکھ چکا تھا۔ معاذ کے دماغ میں ایک لفظ گونجا تھا خطرہ۔ اس وقت بہت رش تھا، سب عورتیں زیان کو دیکھنے کے لیے ٹوٹی پڑی تھیں۔ معاذ کے پاس سوچنے کے لیے غور کرنے کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

ملک ایبک کا بیڈ روم بہت شاندار تھا۔ پردے، فرنیچر، کارپٹ سے لے کر ڈیکوریشن پیسز اور جہازی سائز بیڈ تک ایک ایک چیز کمرے کے مکین کے ذوق کو سراہ رہی تھی، خواب آگیں فضا میں مدھر گیت کا ارتعاش تھرتھرا رہا تھا۔

یہ پربتوں کے دائرے، یہ شام کا دھواں
ایسے میں کیوں نہ چھیڑ دیں دلوں کی داستان

یہ روپ، یہ رنگ، یہ چبھن چمکتا چاند سا بدن
برا نہ مانو تم اگر تو چوم لوں کرن کرن

کہ آج حوصلوں میں ہیں بلا کی گرمیاں
یہ پربتوں کے دائرے' یہ شام کا دھواں

معاذ کچھ دیر پہلے زیان کے پاس آیا تھا' اسی نے میوزک سسٹم آن کیا تھا' یہ اسی کی شرارت تھی کہ وہی گیت بار بار ریوائنڈ ہو رہا تھا۔

ملک ایبک نے اندر قدم رکھا تو ہر شے بولتی محسوس ہوئی' یہاں تک کہ خاموشی بھی سرگوشیاں کر رہی تھی۔ زیان کا وجود قابل توجہ اور پرکشش تھا۔ زیان کی آنکھوں میں سرخی چھلک رہی تھی۔ جب وہ زیان کے قریب جاکر بیٹھا تو تب اس نے زیان کی آنکھوں کی لالی واضح طور پہ دیکھی۔ اس کی آنکھوں کے کنارے سوجے سوجے نظر آرہے تھے۔ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی زیان کے دونوں ہاتھ گھٹنوں پہ دھرے تھے۔ ایبک نے ایک پل میں دل ہاتھوں سے نکلتا محسوس کیا۔ وہ اتنی حسین اور دل کش نظر آرہی تھی کہ ایبک کے حواس کی نبضیں سست پڑ گئی تھیں۔

آج سے پہلے جب بھی زیان سے ملاقات یا آمنا سامنا ہوا اور وہ "میں ہی میں ہوں۔" کی عملی تفسیر بنی ملی تھی' رسائی سے کوسوں دور' جس کو چھونے کا سوچنا بھی محال تھا۔ آج وہ اپنی تھی' ہمیشہ کے لیے اس کی ملکیت بن چکی تھی اور وہ احساس ملکیت کے نشے میں سرشار تھا۔ ملکیت کو عملی طور پہ ثابت کرنے کے لیے اس نے زیان کے گھٹنوں پہ دھرا اس کا ایک ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھاما' شاید وہ یقین کرنا چاہ رہا تھا کہ زیان اس کے پاس ہی ہے۔ خاموشی اور بھی کھل کر کلام کر رہی تھی۔ رنگ' خوشبو اور روشنی کا ایک مجسم وجود ایبک کے سامنے اس کی دسترس میں تھا۔

ایبک نے زیان کے پاس سے ایک تکیہ اٹھا کر اپنے کندھے کی طرف رکھا اور قدرے جھک کر نیم دراز ہو گیا۔ اب زیان کا چہرا اس کے بالکل سامنے اور قریب تھا۔ اس کے حنائی پاؤں ایبک کے دائیں بازو کو چھو رہے تھے۔ اس کے پاؤں میں سجی پائل تک کو وہ بڑی وضاحت سے دیکھ اور چھو سکتا تھا۔ آج ایبک کی نگاہوں کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ زیان نے ابھی تک اس سے نظر نہیں ملائی تھی پر وہ اس کے بہت قریب تھا۔ زیان کے دل کی دھک دھک' اسے اپنی سماعتوں کے قریب تر محسوس ہو رہی تھی۔ زیان کے نچلے ہونٹ کے کنارے کالا تل اس کے لبوں کی خفیف تھرتھراہٹ سے لرز رہا تھا۔ ایبک نے اچانک اپنی انگشت شہادت وہاں رکھی' انگلی کی پور تلے اس نے بھی وہ لرزاہٹ محسوس کی۔

"میں کہاں سے آغاز کروں کہ مجھے کب کہاں' کس وقت تم سے محبت ہوئی؟" ایبک کی نگاہ اس کے ایک ایک نقش کو چھو رہی تھی۔ وہاں شوق کا گرمئ جذبات کا ایک جہاں آباد تھا۔ زیان کی آنکھوں کی سرخی کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔ تب اس نے پہلی بار نگاہیں اٹھا کر ایبک کی طرف دیکھا۔

ایبک کی نگاہوں میں بڑی خوب صورت التجا میں اور گستاخ جذبے مچل رہے تھے۔ اس نے دوسرا ہاتھ بڑھا کر زیان کی پلکوں کو چھوا تو اس کا ہاتھ پلکیں اور پورا وجود گویا بھونچال کی لپیٹ میں آگیا۔ ایبک نے کندھا اوپر کرتے ہوئے زیان کا بھاری آنچل اس کے سر سے کھسکایا وہ قدرے پیچھے ہٹی' لیکن آج وہ ہار ماننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ زیان کے لبوں سے پہلی چیخ نکلی اس کے بعد اس کے حلق سے نہ رکنے والی چیخوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رات کے گہرے ہوتے سناٹے میں یہ آواز ایسی دلخراش تھی جیسے اسے ذبح کیا جارہا ہو۔ ملک محل کے مکین ایک ایک کرکے اس کا سبب معلوم کرنے کے لیے دوڑ پڑے۔

ملک ایبک مضبوط اعصاب کا مالک اور بے مثال قوت برداشت رکھتا تھا' اس وقت اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا ہے اور اسے کیا کرنا چاہیے۔ زیان کے بالوں کے خوب صورت اسٹائل کا حشر ہو چکا تھا' بالوں میں سجے پھول' پتی پتی بکھر گئے تھے۔ لپ اسٹک پھیل کر لبوں کے کنارے سے باہر نکل رہی تھی۔ مسکارے اور آئی شیڈ اور دیگر میک اپ کا بھی یہ ہی حال تھا جو بڑی مہارت اور نفاست سے کیا گیا تھا۔

دوپٹا سر سے اتر کر بیڈ کے نیچے جا پڑا تھا۔ اس کی وحشت زدہ لال لال آنکھیں بے قراری سے گردش کررہی تھیں۔ کچھ دیر پہلے تک وہ دلہن کے خوب صورت ترین روپ میں تھی۔ مگر اب اس ہیبت کذائی میں وہ خون آشام چڑیل لگ رہی تھی۔

دوڑتے قدموں اور شور کی آوازیں ایبک کے کمرے کے دروازے تک آکر قدرے تھم گئی تھیں۔ دروازہ زوردار طریقے سے دھڑدھڑایا جارہا تھا۔ اس اچانک لگنے والے شاک سے ایبک کے حواس ماؤف سے ہورہے تھے۔ اس نے اسی کیفیت میں دروازہ کھولا۔ اس کے کھلنے کی دیر تھی' عورتوں کا ریلا اندر گھس آیا۔ عورتوں کے پیچھے ملک جہانگیر اور معاذ بھی تھے' پر وہ مصلحت کے تحت دروازے سے باہر ہی رک گئے تھے۔ پر جب اندر کا منظر ملاحظہ کیا تو وہ بھی داخل ہوگئے۔ زیان بے ہوش ہو کر بیڈ پہ عجیب سے انداز میں لڑھک گئی تھی۔ ہر کوئی ایبک سے پوچھ رہا تھا' کیا ہوا' کیا ہوا۔ وہ بولنے میں سخت دقت محسوس کررہا تھا۔ اس وقت لفظ اس کی گرفت سے بھاگ گئے تھے۔ زیان کی حالت ہی بتانے کے لیے کافی تھی۔ نوکرانی جاکر عنیزہ کو بھی بلا لائی تھی۔

"چھوٹی بی بی پہ جن کا اثر ہوگیا ہے' کل مغرب کے ٹائم' باغ میں پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھی تھیں اور ایسی ہی حالت تھی جیسی ابھی ہے۔ چھوٹی بی بی پہ جن عاشق ہوگیا ہے۔"

اس نے انکشاف کیا تو سب سر اس کی طرف گھوم گئے۔ واقعی زیبو کی بات قابل غور تھی۔ گاؤں دیہات میں حسین لڑکیوں پہ آسیب کا آجانا' جن کا عاشق ہوجانا کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی۔

ایبک ایک کونے میں بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ افشاں بیگم انتہائی پریشانی کے عالم میں بے سدھ پڑی زیان کو دیکھ رہی تھیں' جس کے ہاتھ پاؤں مڑے ہوئے تھے۔ عنیزہ رو رہی تھیں۔ انہیں تسلی دیتے ہوئے۔ زیان کو ہوش میں لانے کی تدابیر ناکام ہورہی تھیں۔ عنیزہ کی پریشانی اب تشویش میں ڈھلنے لگی تھی۔ کسی رشتہ دار عورت نے زیان کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا مشورہ دیا۔

"تمہاری بہو کو ڈاکٹر کی نہیں کسی اللہ والے کی ضرورت ہے۔" ایبک کی رشتے کی خالہ نے جھٹ مشورہ رد کردیا۔

"ہاں بھئی میری بیٹی کو دم درود کی ضرورت ہے۔" افشاں بیگم نے بھی تائید کی اور آنسو پونچھے۔ مشورہ دینے والی عورت اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

ایبک بھانت بھانت کی بولیاں سن رہا تھا اور گاہے بگاہے بے سدھ پڑی زیان کو بھی دیکھ رہا تھا۔ وہاں عورتوں کا میلہ سا لگا ہوا تھا اور ان سب کا مشترکہ متفقہ خیال تھا کہ زیان پہ باغ میں جن عاشق ہوگیا ہے یا کسی ہوائی مخلوق کا اثر ہوگیا ہے۔

رنگ رنگ کی بولیاں سن کر عنیزہ پریشان ہورہی تھیں۔ انہوں نے افشاں بیگم کو کمرے میں ہی الگ لے کر جاکر درخواست کی کہ سب عورتوں کو کمرے سے نکالا جائے۔ ویسے بھی کافی دیر گزر چکی تھی۔ افشاں بیگم کی نرمی سے کہی گئی بات کا اچھا اثر ہوا۔ عورتیں ایک ایک کرکے چلی گئیں۔ صرف اب نمناں' افشاں بیگم' عنیزہ اور ملک ایبک ہی وہاں تھے' ان سب افراد میں اگر کوئی خوش اور پرسکون تھا تو وہ صرف اور صرف نمناں تھی۔ زیان کی اس حالت کا جواز اسے سمجھ نہیں آرہا تھا' نہ ہی وہ کوئی تاویل خود کو دے پارہی تھی' پر مڑی تڑی پڑی زیان اس کے دل کو مسرور کررہی تھی۔

افشاں بیگم سب کی باتیں سن سن کر دہل گئی تھیں۔ زیان کی اس حالت کے بعد وہ ایبک کو کوئی نقصان پہنچتا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ اس کا فی الحال زیان سے دور رہنا ہی بہتر تھا۔

"ایبک پتر تم نیچے والے کمرے میں سو جاؤ۔" انہوں نے بیٹے سے نگاہیں ملائے بغیر کہا۔ کتنے ارمانوں سے وہ زیان کو دلہن بنا کر لائی تھیں۔ ایبک کی سب خوشیاں خاک میں مل گئی تھیں۔ وہ جیسے خود کو ذمہ دار سمجھ رہی تھیں۔ ایبک ان کی دلی کیفیت خوب اچھی

طرح سمجھ رہا تھا۔ اس لیے اس نے بنا کسی پس و پیش کے ان کی بات پہ سر تسلیم خم کر دیا۔ عنیزہ اور افشاں بیگم دونوں زیان کے پاس تھیں۔

ایبک کو کمرے سے باہر جاتا دیکھ کر نیہناں نے آسودہ سانس لی۔ جلتے بلتے دل کو سکون مل گیا تھا۔ وہ دریا کے پاس رہ کر پیاسا لوٹ گیا تھا۔ اس تشنگی میں نیہناں کی خوشی اور سکون مضمر تھا۔

✿ ✿ ✿

ولیمہ کی پوری تقریب کے دوران زیان بالکل نارمل رہی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا اس پہ جن آنے والا سنگین واقعہ رونما ہو چکا ہے۔ وہ شرمگیں مسکراہٹ، جھکی نگاہوں سمیت شادی سے پہلے والی زیان لگ رہی تھی۔ گزرے دو دن کا عکس تک اس کے چہرے پہ نہیں تھا۔ ولیمہ کی تقریب سے فارغ ہو کر شام سے پہلے پہلے سب مہمان رخصت ہو چکے تھے۔

افشاں بیگم نے نیہناں کو مزید ایک دن اپنے پاس روک لیا تھا زیان کو وہی کندھوں سے تھام کر کمرے تک لائی۔ زیان آج پہلے سے بڑھ کر حسین لگ رہی تھی۔ ولیمہ کی دلہن کے روپ میں وہ معصوم و دلکش نظر آ رہی تھی۔ اس کی کمر کے پیچھے تکیے سیٹ کرتے ہوئے نیہناں نے اس کے من موہنے روپ کو غور سے دیکھا۔ کل تو ایبک کے خوابوں کی تکمیل نہیں ہو پائی تھی۔ پر آج ایسا ہونا ممکن تھا۔ زیان بالکل ٹھیک نظر آ رہی تھی۔ ایبک اور زیان دونوں امنگوں بھرا دل رکھتے تھے، پھر قدرت نے انہیں ایک مضبوط شرعی رشتے میں باندھ دیا تھا۔ وہ خوابوں کی حسین رہگزر پہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے خوشی خوشی تمام عمر ساتھ چل سکتے تھے۔ نیہناں کے دل میں دھڑ دھڑ بھانبھڑ جلنے لگے۔ اندر بیٹھا کوئی دہائیاں دے رہا تھا کہ ایبک تو میری تلاش کا حاصل تھا۔ امیدوں کا ثمر تھا۔ پھر زیان کیسے مالک بن بیٹھی۔

دن بھر کی بھاگ دوڑ اور ولیمہ کی مصروفیت نے ملک ایبک کو تھکا دیا تھا۔ وہ دور صوفے پہ بیٹھا تھا۔ سوفٹ ڈرنک سے بھرا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ آہستہ آہستہ پی رہا تھا۔ زیان بیڈ کراؤن سے کمر ٹکائے ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھی تھی۔ شاہانہ جوڑے میں ملبوس وہ پہلے سے بڑھ کر حسین لگ رہی تھی، مگر ایبک نے جذبات کی لگام کو ڈھیلا نہیں پڑنے دیا۔ وہ صوفے سے اٹھا اور ہاتھ میں تھاما خالی گلاس سائیڈ ٹیبل پہ رکھا۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے نائٹ شرٹ کے اوپری دو بٹن کھولے اور آستین کہنیوں تک فولڈ کیں۔ رسٹ واچ اتار کر سائیڈ پہ رکھی۔ اب وہ سامنے کھڑا تھا۔ زیان چاہتی تو نظر اٹھا کر دیکھ سکتی تھی کہ ان دونوں میں زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ ایبک نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ زیان کو اپنی طرف سے پیش قدمی کا تاثر دینا چاہ رہا تھا۔ اس میں وہ پوری طرح کامیاب رہا تھا۔

چند لمحے بعد وہاں سے اس کی ہذیانی چیخیں گونج رہی تھیں۔ چیخیں تھی کہ صور اسرافیل تھا۔ اس بار افشاں بیگم کے ساتھ ملک جہانگیر بھی افتاں و خیزاں ایبک کے کمرے میں موجود تھے۔ زیان کی حالت بہت بری تھی۔ لمبے بال چہرے کے اطراف جھول رہے تھے اور وہ خود آنکھیں بند کیے جھوم رہی تھی جیسے اپنے حواس میں نہ ہو۔ وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ اس کے حلق سے دبی دبی مردانہ آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔

"نہیں چھوڑوں گا، نہیں چھوڑوں گا۔ اس کے پاس آیا تو بھسم کر دوں گا۔" اشارہ یقیناً" ایبک کی طرف تھا۔ ملک جہانگیر اور افشاں بیگم نہایت پریشانی اور حواس باختگی سے زیان کو دیکھ رہے تھے۔ خاص طور پہ افشاں بیگم کی حالت بہت پتلی ہو رہی تھی۔

"میری بہو پہ سچ مچ کا جن عاشق ہو گیا ہے ملک صاحب۔" ان کا لہجہ مارے خوف کے کانپ رہا تھا۔

انہوں نے زیان پہ عاشق ہونے والے جن کی دھمکی سن کر ایبک کو کمرے سے باہر جانے کو کہا۔ کیونکہ زیان لال لال آنکھیں نکالے ایبک کو گھور رہی تھی۔ ایبک اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا تو وہ اسے بہلا کر باہر لے گئیں۔ بہو پہ تو جن عاشق ہو گیا تھا اب

بیٹے کی سلامتی بھی خطرے میں تھی۔ ایک بار پھر وہی صورت حال تھی۔ زیان بے ہوش ہو چکی تھی۔ عنیزہ اور ملک ارسلان بھی افشاں بیگم کے بے وقت بلاوے پہ آچکے تھے۔ زیان کی حالت دیکھ دیکھ کر عنیزہ رو رہی تھیں۔

"زیان کی حالت تمہارے سامنے ہے، جن نے براہ راست دھمکی دی ہے تمہیں، میرے بچے۔ اس لیے تمہیں اس کے سامنے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔" افشاں بیگم الگ لے جا کر ایبک کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"امی آخر ایسا کب تک ہوگا۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہے کہ میرا اس کے ساتھ آمنا سامنا نہ ہو۔" اس بات پہ افشاں بیگم اسے بے بسی سے دیکھ کر رہ گئیں۔ حالات نے انہیں حواس باختہ کر دیا تھا۔ نئی نویلی دلہن گھر میں لاتے ہی پریشانی نے منہ دیکھ لیا تھا۔ ایبک کو دیکھتیں تو دل مسوس کر رہ جاتیں، اس نے ازدواجی زندگی کی خوشی ہی نہیں پائی تھی، جن نے صاف بولا تھا "زیان کے قریب آئے تو بھسم کر دوں گا۔"

"زیان کو ایسے تو نہیں چھوڑیں گے نا۔ طاہرہ کہہ رہی تھی آپ کو سائیں بابا کے پاس لے جاؤں گی جن نکالنے کے ماہر ہیں۔" افشاں بیگم نے اپنی بہن کا نام لیا تو وہ دل میں محض افسوس ہی کر سکا۔

نمنال، عنیزہ بیگم کی طرف واپس آگئی تھی۔ نوکرانیاں دبی دبی آواز میں زیان کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔ نمنال دلچسپی سے سن رہی تھی، خود وہ ایک لفظ بھی نہیں بولی تھی۔

"بے چاری چھوٹی بی بی پہ جن آگیا ہے، اب ملک صاحب کی خیر نہیں ہے۔" فریدہ نے جھرجھری لی۔

"جن نے ملک صاحب کو تو کمرے کے اندر قدم بھی نہیں رکھنے دیا ہے۔" یہ زیبو تھی۔

"ہاں بے چارے چھوٹے ملک صاحب نیچے آگئے تھے۔" فریدہ کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

"ہاں تو کیا کرتے پھر وہ۔ چھوٹی بی بی کی حالت ہی اتنی خراب ہو رہی تھی۔" زیبو کو بھی ملک ایبک سے ہمدردی ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

عنیزہ، زیان کے پاس تھیں، جب کہ افشاں بیگم، اپنی بہن طاہرہ کے ساتھ جلالی بابا کے پاس گئی ہوئی تھیں۔ دونوں گاڑی سے اتر کر آستانے کے چھوٹے گیٹ سے اندر داخل ہوئیں۔ اتنا رش اور ہجوم دیکھ کر دونوں مایوس ہو رہی تھیں۔ بالآخر ان کی پریشانی پہ جلالی بابا کے ایک مرید کو ترس آگیا۔ اس نے ایک پرچی پہ ان کے نام لکھ کر اندر بھجوائی۔

انہوں نے اپنا مسئلہ بتایا ہی نہیں تھا اور جلالی بابا جان گئے تھے، وہ روشن ضمیر تھے۔

"ہم کیا کریں اب؟" ڈرتے ڈرتے افشاں بیگم گویا ہوئیں۔

"دیکھو بی بی تمہارا مسئلہ بہت بڑا اور خطرناک ہے، آسانی سے حل ہونے والا نہیں ہے۔ تمہاری بہو خطرناک جن کے زیر اثر آگئی ہے۔ ہمیں پوری حقیقت سمجھنے کے لیے تمہارے گھر آنا پڑے گا۔" جلالی بابا اپنی مخصوص رعب دار آواز میں بول رہے تھے۔ افشاں بیگم کے چہرے پہ اب پریشانی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جلالی بابا بہت جلد "ملک محل" میں رونق افروز ہونے والے تھے۔ یعنی ان کی پریشانی کے خاتمے کے دن قریب آگئے تھے۔ دونوں خوشی خوشی واپس آئیں۔

عامل جلالی بابا اپنے ساز و سامان سمیت "ملک محل" تشریف لا چکے تھے۔

"کیا لینے آیا ہے تو اس لڑکی سے، بدبخت تیرا نام کیا ہے؟" اپنی گونج دار آواز میں جلالی بابا زیان پہ عاشق ہونے والے جن سے مخاطب تھے۔ زیان نے سرخ سرخ لال آنکھوں سے عامل جلالی بابا کو گھورا۔

"آتم توش نام ہے میرا۔ میں اس لڑکی سے محبت کرتا ہوں۔" زیان کے لبوں سے مردانہ آواز برآمد ہوئی۔ یہ سو فیصد مردانہ آواز تھی، وہاں پہ موجود سب

افراد کو گویا سانپ سونگھ چکا تھا۔ صرف عامل جلالی بابا جن سے سوال جواب کر رہے تھے۔

"کیا لینا ہے تجھے اس لڑکی سے؟"

"میں زیان سے محبت کرنے لگا ہوں۔ جب یہ باغ میں اکیلی بیٹھی رو رہی تھی' میں تب اس پہ عاشق ہوا۔ اب میں اس کے قریب کسی کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتا۔ خاص طور پہ اس کے شوہر کی۔ یہ صرف میری ہے۔" زیان کے لبوں سے غصے بھری آواز بر آمد ہوئی۔ اس نے گردن موڑ کر ون سیٹر صوفے پہ بیٹھے ملک ایبک کو گھور کر دیکھا' جیسے کچا چبا جائے گی۔ ایبک اپنے اعصاب پہ قابو پائے برداشت کر رہا تھا۔ عامل جلالی بابا' زیان کے کمرے سے اٹھ کر نیچے آگئے تھے۔ ان کے چہرے پہ فکر و تردد کی گہری لکیریں نمایاں تھیں۔ ملک جہانگیر' افشاں بیگم اور ملک ایبک ان کے پاس تھے۔

"جن بہت طاقت ور اور شری ہے' آپ کی بہو کے علاج کے لیے بہت وقت اور صبر کی ضرورت ہے۔" جلالی بابا نے اپنے سامنے بیٹھے تینوں افراد کو باری باری دیکھا۔ اس جن سے نمٹنے کے لیے خاص عمل اور حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ میں ہفتے بعد پھر آؤں گا اور بتاؤں گا کہ علاج کیسے شروع کیا جائے۔ علاج کے دوران اور ابھی بھی لڑکی کے شوہر کو اس سے دور رہنا ہوگا' ورنہ آتم توش غصے میں آکر شدید قسم کا نقصان بھی پہنچا سکتا ہے' جیسا کہ اس نے دھمکی بھی دی ہے۔" عامل جلالی بابا گونج دار آواز میں بول رہے تھے۔

ملک ایبک کے علاوہ سب ہی متاثر اور پریشان ہو گئے تھے۔ ایبک' اندرونی اور بیرونی دونوں طرح پرسکون تھا۔ وہ زیان کے اس علاج کے حق میں نہیں تھا۔ مخالفت کرتا تو افشاں بیگم کے ناراض ہونے کا سو فیصد امکان تھا۔ لہٰذا اس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

☆ ☆ ☆

ایبک اور زیان کی شادی کے بعد نمناں نے سلائی کڑھائی کے مرکز میں پھر سے جانا شروع کر دیا تھا۔ گھر میں زیان کے حوالے سے جو پریشانی چل رہی تھی' وہ اپنی جگہ تھی۔ ایبک نے اس طرف سے دھیان ہٹا کر' اسکول والے پروجیکٹ پہ توجہ دینا شروع کر دی تھی۔ اس نے شادی کے بعد پہلی مرتبہ اسکول کی تیزی سے تعمیر کے مراحل طے کرتی عمارت کا جائزہ لیا۔ ٹھیکیدار اسے کام کی تفصیلات بتا رہا تھا۔ ایبک اس کی کارکردگی سے مطمئن تھا۔ آدھ گھنٹہ گھوم پھر کر اطمینان کر لینے کے بعد وہ انڈسٹریل ہوم کی طرف آگیا۔ بہت دن بعد اس طرف آنا ہوا تھا۔ نمناں اسے دیکھتے ہی الرٹ ہو گئی۔ دل کی دھڑکنوں نے خوش گوار آلاپ الاپنا شروع کر دیا تھا۔ بہت دن کے بعد نمناں اسے اپنے سامنے' ایسے اکیلے دیکھ رہی تھی۔ ایبک کو سامنے پاکر وہ بے اختیار اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"السلام علیکم!" ایبک نے دھیمے سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ آپ کیسے ہیں؟ بیٹھیے پلیز!" نمناں نے آداب میزبانی نبھائے۔ وہ دھیرے سے سر کو جنبش دیتا بیٹھ گیا۔

"کام کیسا چل رہا ہے' کوئی پریشانی تو نہیں ہے اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو لسٹ بنا کر بھجوا دیجیے گا۔" وہ اپنے مخصوص مہذب انداز میں گویا ہوا۔

"پریشانی تو نہیں ہے' البتہ کچھ مشینیں خراب ہو گئی ہیں' ساتھ کڑھائی کی ایک نئی مشین کی ضرورت ہے۔"

"آپ گھر جا کر مجھے ایک بار یاد کروا دیجیے گا۔ منشی شہر سے لے آئے گا۔"

"ایک بات پوچھوں' آپ برا تو نہیں مانیں گے۔" نمناں نے پہلی بار بولنے کی ہمت کی تھی۔ ایبک کرسی پہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ نمناں کے لہجے میں محسوس کی جانے والی جرات تھی۔

"جی مس نمناں پوچھیں۔"

"آپ بہت پریشان اور تھکے تھکے نظر آرہے ہیں' کیا وجہ ہے اس کی؟" نمناں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔

"لگتا ہے میری بات آپ کو بری لگی ہے' معذرت چاہتی ہوں۔" ایبک کی طرف سے خاموشی طاری رہی تو اس نے دبے دبے انداز میں شرمندگی ظاہر کی۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"تو پھر۔" وہ تیزی سے گویا ہوئی۔

"میں حیران ہوا ہوں' کیونکہ آج سے پہلے آپ نے کبھی ایسی بات نہیں کی نا۔" نہنال دھیمے سروں میں ہنسی۔ ایبک ٹھٹک کر اسے تکنے لگا۔ آج تو وہ حیران کردینے پہ تلی ہوئی تھی۔

"آپ کو میری بات بری نہیں لگی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اچھی لگی ہے۔" وہ بالکل عام سے انداز میں بولی۔ ایبک بے ساختہ ہنس پڑا۔ یہ سادہ اور بے ریا ہنسی تھی۔ نہنال سب کچھ بھلائے اس کی ہنسی کے سحر میں گم ہونے لگی تھی۔ یہ پہلا اتفاق تھا جو ایبک نے اس سے اتنی باتیں کی تھیں۔

"ہاں میں ڈسٹرب ہوں تھوڑا۔" وہ ہنستے ہنستے اچانک خاموش ہوا تو سارا سحر اچانک ٹوٹ گیا۔

"آپ زیان بی بی کی وجہ سے پریشان ہیں نا؟" وہ ہمدردی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ ہولے سے سر ہلا کر رہ گیا۔

"آپ انہیں کسی ڈاکٹر کو دکھائیں نا۔" نہنال نے خلوص سے مشورہ دیا۔ پر یہ خلوص ایبک کے لیے تھا' زیان کے لیے ہرگز نہیں تھا۔

"آپ کی اس ہمدردی اور خلوص کا بے حد شکریہ۔" ایبک اس کی بات کے جواب میں گویا ہوا۔ اس نے ڈاکٹر کو دکھانے کے حوالے سے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔

"اچھا مس نہنال میں جارہا ہوں' یہاں کسی قسم کی کوئی پرابلم ہو تو مجھے بتا دیا کریں۔" وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دروازے کی طرف مڑا اور نپے تلے باوقار قدموں سے چلتا اپنی گاڑی میں جاکر بیٹھ گیا۔ نہنال کھڑکی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا گاڑی اسٹارٹ کررہا تھا۔ وہ وہاں سے روانہ ہوا تو وہ کھڑکی سے ہٹی۔

☆ ☆ ☆

معاذ کی واپسی میں صرف کل کا دن تھا۔ وہ بجھے بجھے دل کے ساتھ تیاری میں مصروف تھا۔ ایبک بھائی کی شادی کا سارا مزا کرکرا ہوگیا تھا۔ اس نے بھائی اور بھابھی کی شادی کے بعد سیر و تفریح' گھومنے پھرنے کے بہت سے پروگرام بنائے تھے۔ جو زیان بھابھی کے بجن کی وجہ سے غارت ہوکر رہ گئے تھے۔ پورے ملک محل میں عجیب سا سناٹا تھا' لگتا ہی نہیں تھا کہ یہاں کسی کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ ملک جہانگیر اور افشاں بیگم زیان کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ گھر میں کام کرنے والی نوکرانیاں تک خوف زدہ تھیں۔ بات بھی سرگوشیوں میں کرتیں۔ معاذ الگ جھنجلایا ہوا تھا۔ اس نے کتنی بار مشورہ دیا کہ بھابھی کو کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھائیں' مگر اس کے مشورے پہ کسی نے بھی کان نہیں دھرا۔ اس کا دل کرتا زیان سے فرمائشیں کرے۔ لاڈ اٹھوائے' چھوٹے چھوٹے کام کروائے' اسے لے کر گھومنے پھرنے جائے۔

معاذ کو بہن کا بہت شوق تھا' وہ اکثر و بیشتر بڑے حسرت ناک انداز میں' اللہ سے بہن نہ ہونے کا شکوہ کرتا تھا۔ زیان کو دیکھتے ہی اس کے دل نے کہا کہ اس کی بہن کی کمی پوری ہوگئی ہے۔ وہ بالکل ویسی ہی تھی جیسا اس کے ذہن میں بہن کا تصور تھا۔ بہت جلد دونوں آپس میں بے تکلف ہوگئے تھے۔ زیان اس کی باتوں پہ ہنستی' دلچسپی لیتی تو اسے بہت اچھا لگتا۔ ان دونوں یعنی زیان اور ایبک بھائی کی شادی پہ اس نے کیسی رونق لگائی' خوشی منائی۔ زیان رخصت ہوکر آئی تو معاذ نے اس کے بیڈروم میں جاکر سب سے پہلے اس کا چہرا دیکھا اور منہ دکھائی دی۔

اس کے شرارتی جملوں کی بہار سے وہ نروس ہو رہی تھی' اپنی مسکراہٹ چھپا رہی تھی۔ معاذ نے کتنی ڈھیر ساری اس کی فوٹو بنائیں۔ سب ٹھیک تھا' وہ میوزک سسٹم آن کرکے وہاں سے باہر آیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تھوڑی دیر میں ہی خوشیوں بھرا ماحول پریشانی میں بدل

گیا تھا۔ معاذ نے بھی دیکھا۔ ذیان بھابھی پہلے والی تو لگ ہی نہیں رہی تھی۔ نہ ہنستی' نہ بولتی' نہ اس کی شرارتوں پہ مسکراتی۔ اب تو اس کے جانے میں ایک دن باقی تھا۔ وہ بے حد اداس ہو رہا تھا۔ لگ رہا تھا ان کے گھر کو کسی کی نظر کھا گئی ہے۔

معاذ' ذیان کے بیڈ روم کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ افشاں بیگم بھی تھیں۔ وہ اس کے ساتھ آئی تھیں' انہیں انجانا سا خوف تھا کہ شاید ذیان' معاذ کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ حالانکہ شادی کے بعد سے لے کر اب تک ایسا ہوا نہیں تھا' آتم توش نامی جن کا سب غصہ' غیض و غضب صرف اور صرف ایبک کے لیے ہی تھا۔ ذیان بیڈ پہ بیٹھی تھی' چہرے پہ فکر کے سائے تھے' پر مجموعی طور پہ وہ بالکل ٹھیک نظر آرہی تھی۔

"آؤ معاذ' کہاں غائب ہو اتنے دن سے؟" اسے دیکھتے ہی وہ بیڈ سے اتر آئی۔ چہرے پہ گزشتہ دنوں والی طاری وحشت کا نام و نشان تک نہ تھا۔

"بھابھی آپ کی طبیعت ہی ٹھیک نہیں تھی میں دو تین بار آیا تو تھا' لیکن کھڑے کھڑے واپس ہو گیا۔" وہ معاذ سے تین ساڑھے تین سال چھوٹی تھی' پر وہ انتہائی احترام سے مخاطب کرتا تھا۔ ذیان جواب میں دھیرے سے مسکرا دی' ایسی مسکراہٹ جس میں بے بسی کی آمیزش تھی۔ افشاں بیگم نے معاذ کو فہمائشی انداز میں دیکھا' جیسے کہہ رہی ہوں ذیان کی طبیعت کے حوالے سے کوئی بات مت کرنا۔ وہ ان کی آنکھ کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔

ذیان اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ افشاں بیگم دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہی تھیں۔ ذیان بالکل نارمل اور ٹھیک ٹھاک نظر آرہی تھی' لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی پرانی والی ذیان ہے۔ ایبک کو سامنے دیکھتے ہی جن بے قابو ہو جاتا' ویسے وہ ٹھیک ہی رہتی تھی۔

☆ ☆ ☆

معاذ ساری رونقیں اپنے ساتھ سمیٹ کر لے گیا تھا۔ اس کی موجودگی سے اک تازگی اور زندگی کا احساس تھا۔ سارا دن وہ اودھم مچائے رکھتا' نت نئی شرارتیں کرنا اس کا مشغلہ تھا۔ وہ جب تک ملک محل میں رہا' نمنال اس کی موجودگی سے پریشان ہی رہی۔ بظاہر لاپروا اور شرارتی معاذ در حقیقت بہت حساس تھا۔ قدرت نے اس کو اپنی حساسیت کی بدولت خاص خوبی عطا کی تھی۔ وہ معمولی سے معمولی بات کو بھی فوراً" محسوس کرتا۔ چھوٹی چھوٹی تفصیلات اس کے علم میں آجاتیں۔ دوسرے جن کو نظرانداز کرتے' وہ ان کا جائزہ لیتا۔ اکثر ایسی باتیں وقوع پذیر ہوتیں جن کو وہ گہرائی میں جا کر محسوس کرتا۔ وہ اس بار ملک محل میں زیادہ عرصہ نہیں رہا تھا۔ پر نمنال کے بارے میں اس کی رائے اوروں سے مختلف تھی۔ ایبک بھائی کی شادی کے دوران اس نے دوبار نمنال کی نگاہوں کی چوری پکڑی تھی۔ ایک بار اپنے تئیں وہ سب سے چھپ کر ذیان کو نفرت سے گھور رہی تھی' جبکہ ایبک بھائی کے لیے اس کے انداز کچھ اور تھے۔

جانے سے پہلے معاذ کا دل چاہا کہ وہ ایبک بھائی کو اپنے خیالات سے آگاہ کرے۔ پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔ احمد سیال کے گھر میں پائی جانے والی ان کی بیٹی کی تصویریں اور نمنال کی ان کی بیٹی سے مشابہت بھی حیران کن تھی۔ وہ اس کا ذکر بھی ایبک سے کرنا بھول گیا تھا۔ نمنال کی شخصیت خاصی پراسرار اور شک و شبے کے دائرے میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد نمنال کم از کم خوش تھی۔ کیونکہ معاذ کی موجودگی اسے خائف ہی رکھتی تھی۔ ہر پل' ہر لحظہ اسے دھڑکا لگا رہتا جیسے معاذ اس کے بارے میں جانتا ہو۔ جبکہ ملک محل میں آنے اور ملک ایبک کو دیکھنے کے بعد اس کی پوری کوشش تھی کہ اس کی شخصیت کا راز کسی پہ بھی عیاں نہ ہو۔

اس کا احساس زیاں ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ اس کے لیے ملک ایبک کا رشتہ آیا تھا۔ وہ ہمیشہ پہلے نمبر پہ رہے گی۔ وہ خود کو بہلاتی۔ اسے ملک ایبک کو ہر صورت' ہر قیمت پہ حاصل کرنا تھا۔ وہ ذیان سے شادی

کر کے بھی نامراد رہا تھا۔ پر اس کی نامرادی کی عمارت پہ ہی اپنا خوابوں کا محل تعمیر کرنا تھا۔ اس کی دعا تھی کہ وہ کبھی بھی ذیان کے قریب نہ جاسکے۔ رنم کی حسیات ملک ایبک کے معاملے میں بہت شارپ تھیں۔ اسے پتا تھا وہ ذیان کی وجہ سے بہت اداس اور اپ سیٹ ہے۔ اس کے دل کو کچھ ہونے لگتا۔ کاش ایک دن ایسا آئے جب ملک ایبک اس کے لیے پریشان ہو۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی۔ کاش کوئی معجزہ رونما ہو اور ملک ایبک اس کا ہو جائے۔ دل میں شور مچاتے جذبوں پہ بند باندھنا اب اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ ساری عمر اس نے من پسند چیزیں حاصل کی تھیں۔ اسے امید تھی ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ اپنی من پسند مراد آسانی سے پالے گی۔ کسی طرح بھی اسے ملک ایبک کا مزاج آشنا ہونا تھا' اس کا قرب اور اعتبار حاصل کرنا تھا۔

وہ آج کل جن خطوط پہ سوچ رہی تھی' اس کی وجہ سے اس کا نینال والا راز بہت جلدی افشا ہونے کا خطرہ تھا' کیونکہ اب اسے اپنے جذبات پہ قابو نہیں تھا۔ اس کا دل چاہتا ایبک سے روز ملاقات ہو' وہ اسے ڈھیروں باتیں کرے' پہروں تکتی رہے۔

ملک محل میں اور نینال کے روپ میں اس کی خواہش پوری ہونا ناممکن تھا۔ اسے اپنی اصل شخصیت میں رنم کے روپ میں واپس آنا تھا۔ وہ رنم جو احمد سیال کی اکلوتی لاڈلی بیٹی تھی۔ احمد سیال بزنس ٹائیکون دولت جن کے گھر کی لونڈی تھی۔ وہ اسی احمد سیال جیسے بااختیار شخص کی بیٹی تھی۔ احمد سیال' ملک جہانگیر کے گہرے دوست۔ ذیان' ملک ایبک کی زندگی سے باہر ہو جاتی تو اسے ملک ایبک کی زندگی میں آنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا۔ وہ آسیب زدہ لڑکی کسی طرح بھی تو ملک ایبک کے قابل نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

اس نے وارڈ روب کھول کر اپنا نائٹ ڈریس نکالنا چاہا۔ مگر خالی الماری اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ اسے شدید قسم کا غصہ آیا۔ حالانکہ افشاں بیگم نے اس کا ایک اور شب خوابی کا لباس دھو کر استری کروا کے رکھوا دیا تھا۔ وہ اسے آج کا واقعہ بتا چکی تھیں کہ ذیان کے جن نے اس کے تمام کپڑے خراب کر دیے ہیں۔ وارڈ روب کھولتے ہوئے وہ تھوڑی دیر کے لیے یہ بات بھول ہی گیا تھا کہ عزت مآب آتم توش نے اس کے پہنے جانے والے کپڑوں اور دیگر استعمال کی چیزوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ حیرت انگیز طور پر محترم جن نے ذیان کی کسی بھی چیز کو کوئی ہلکا سا بھی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ ذیان کا بھاری عروسی سوٹ سلیقے سے تہ کیا ہوا سب سے اوپری خانے میں پڑا تھا۔ دیگر کپڑوں کا بھی یہ ہی حال تھا۔

ذیان اپنے بیڈ روم میں آکر بالکل پر سکون تھی۔

آزادی اور سرشاری کا انوکھا احساس ہوا تھا۔ وہ شادی کے بعد پہلی مرتبہ یہاں قدم رکھ رہی تھی۔ اس لیے سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا یہ ویسی ہی خوشی تھی جیسی بیاہتا بیٹی کو شادی کے بعد پہلی بار میکے آکر ہوتی ہے۔ وہ لاکھ سب کی محبتوں سے منہ موڑتی مگر دل میں پنپنے والے جذبوں سے دامن نہیں چھڑا سکتی تھی۔ تب ہی تو ملک ارسلان نے گھر آنے پہ میرا بچہ کہہ کر سر پہ ہاتھ پھیرا' ماتھا چوما اور فرط محبت سے اپنے ساتھ لگایا تو دل ہی دل میں کنڈلی مارے بیٹھی شرمندگی نے سر اٹھایا۔

پہلی بار بے ریا ہو کر اس نے ان سے باتیں کیں۔ اس کے دل میں کوئی کڑواہٹ نہیں تھی۔ ملک ارسلان سے تو اسے ویسے بھی کوئی شکایت نہیں تھی کوئی تھی بھی تو اس نے اندر ہی دل میں دفن کر دی تھی۔ کیونکہ ان کا سلوک اتنا اچھا اور محبت بھرا تھا کہ شکوے' شکایتیں خود بخود ختم ہوتے جا رہے تھے۔ وہ اسے ایک بیٹی کی سی ہی اہمیت دیتے تھے۔ زیان خود ہی ان سے دور دور رہتی' لاکھ کوشش کے باوجود بھی زیان نے انہیں بحیثیت باپ خود سے بے تکلف ہونے کا موقع نہ دیا تھا۔

آج جب انہوں نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا تو اسے رونا آنے لگا۔ اسے پھر امیر علی یاد آگئے تھے اور یہ کیسے ممکن تھا' اسے امیر علی کے ساتھ جڑے غم یاد نہ آتے۔ ان غموں کے ساتھ اس کا تکلیف دہ ماضی وابستہ تھا۔ وہ ماضی جسے وہ بھول کر بھی بھول نہ پائی تھی۔ سر جھٹک کر زیان نے تکلیف دہ یادوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ موسم بہت شدت پہ مائل تھا' سخت گرمی اور حبس تھا۔ اس نے شب خوابی کا ہلکا پھلکا سا کاٹن کا لباس نکالا اور شاور لینے لگی۔

بال سلجھاتے ہوئے اس نے میوزک سسٹم آن کر دیا۔ گانے کے ساتھ ساتھ اس کے لب بھی ہل رہے تھے۔ وہ باہر آکر ٹیرس پہ پڑی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ رات کے اس پہر ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ گرمی اور گھٹن کا احساس کچھ کم ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

ملک ایبک نہا کر بیڈ پہ لیٹا ہوا تھا۔ کمرے کے کھڑکیاں دروازے کھلے تھے اور لائٹیں آف تھیں۔ اچانک ہوا کے دوش پہ کچھ آوازیں اس کی سماعتوں پہ دستک دینے لگی۔ ایبک نے کروٹ بدلی تو نظر کھلے دروازے سے باہر سامنے والے ٹیرس کی طرف اٹھ گئی۔ زیان کرسی پہ بیٹھی میوزک سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ رات کے اس سناٹے میں آواز بخوبی ایبک کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا یہ وہی زیان ہے جس پہ آتم توش نامی جن عاشق ہے۔ وہ مکمل ہوش و حواس میں تھی' شب خوابی کے ہلکے سے لبادے میں رات کے اس پہر وہ ترشی ہوئی مورت لگ رہی تھی۔ کتنی قریب اور کتنی دور تھی وہ۔ بیوی ہوتے ہوئے بھی میلوں' صدیوں کے فاصلے تھی۔ ایبک کو اپنی انگلیوں کے پوروں تلے زیان کا لمس ابھی بھی تازہ اور آنچ دیتا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے اٹھ کر پوری قوت سے کمرے کا دروازہ اور سب کھڑکیاں بند کیں۔ یقیناً" زیان نے یہ آوازیں سنی تھیں' تب ہی تو اس نے مڑ کر اس طرف دیکھا تھا۔ کھلا دروازہ اور کھڑکیاں سب بند ہو چکے تھے۔ ایبک نے اے سی فل آن کر کے پہنی گئی ہلکی سی شرٹ اتار کر دور پھینک دی تھی۔ زیان اس ٹائم اس کے سامنے ہوتی تو جانے وہ کیا کر بیٹھتا۔۔۔ شاید اس کا گلا ہی دبا دیتا۔

وہ زیان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ کچھ تو تھا جو اسے محسوس ہوا تھا۔ اس نے سر جھٹکتے ہوئے گویا اس خیال سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔

فاصلے کے معنی کا کیوں فریب کھاتے ہو؟
جتنے دور جاتے ہو' اتنے پاس آتے ہو

(آئندہ ماہ آخری قسط ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

مکمل ناول

نبیلہ ابر راجہ

میں گمان نہیں یقین ہوں

آٹھویں قسط

نمناں خراماں خراماں چلتی گیٹ سے باہر نکلی۔ آج اس کی آنکھ خاصی دیر سے کھلی تھی۔ اچھی خاصی دیر ہو چکی تھی۔ اس وقت تک تو وہ سلائی کڑھائی کے مرکز کے آفس میں بیٹھی ہوتی تھی ناشتا کیے بغیر وہ تیار ہوئی۔ گیٹ سے باہر گارڈ ایک نوجوان کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

"مجھے فوری طور پہ زیان سے ملنا ہے۔ آپ مجھے اندر جانے دیں۔" نوجوان کا انداز بے حد لجاجت بھرا اور التجائیہ تھا۔ نمناں کے قدم وہیں رک گئے۔ وہ غور سے نووارد کو دیکھنے لگی۔ پینٹ شرٹ میں ملبوس وہ نوجوان خاصا معقول اور مہذب نظر آرہا تھا' لیکن نمناں نے پہلے اسے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ گارڈ اسے اندر لے جانے میں متامل نظر آرہا تھا۔ ملک ارسلان کی طرف سے کسی اجنبی کے لیے ملک محل کا گیٹ کھولنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے گارڈ پس و پیش کر رہا تھا پر وہ نوجوان بار بار بے تکلفی سے زیان کا نام لے رہا تھا' یہ بات نمناں کو چونکانے کا باعث بن رہی تھی۔

ملک ایبک تو صبح سویرے ہی شہر کے لیے نکل چکا تھا' ورنہ وہ اس نووارد کو ملک ایبک سے ملنے کا مشورہ دیتی' وہ زیان کا شوہر اس کے جملہ حقوق کا مالک تھا ایک اجنبی نوجوان کے منہ سے زیان کا نام سن کر جانے وہ کیا محسوس کرتا۔

"ملک صاحب کی طرف سے کسی اجنبی کو حویلی میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔" گارڈ کا لہجہ بدستور سخت تھا۔

"زیان میری خالہ کی بیٹی ہے میری منگیتر ہے۔ آخر مجھے سمجھ نہیں آرہا ہے کہ کیوں مجھے ملنے سے روکا جارہا ہے۔" نووارد جو کہ وہاب کے سوا کوئی بھی نہیں تھا جھنجلا سا گیا۔

"خدا بخش گیٹ کھولو میں خود ان کو اندر لے جاتی ہوں۔" وہ یکدم اضطراری انداز میں بولی۔

"لیکن ملک صاحب ناراض تو نہیں ہوں گے۔" گارڈ ابھی تک تذبذب میں تھا۔

"نہیں ناراض ہوتے' میں خود اس کی ذمہ داری لیتی ہوں۔" نمناں نے وہاب کی طرف اشارہ کیا تھا' ناچار اس نے گیٹ کھول کر وہاب کو اندر جانے کی اجازت دے دی۔

چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہاب ادھر ادھر دیکھتا دل ہی دل میں خاصا مرعوب ہو چکا تھا۔ ملک محل کی شان و شوکت کا رعب اس پہ طاری ہو چکا تھا۔

"زیان کی تو شادی ہو چکی ہے ملک ایبک کے ساتھ اس حویلی کے مالک کے ساتھ۔" نمناں نے انکشاف کرتے ہوئے بغور اس کے چہرے کے تاثرات بھی دیکھے۔ وہ ایکدم یوں اچھلا جیسے بچھو نے ڈنگ مارا ہو۔

"یہ کیسے ممکن ہے' ہو ہی نہیں سکتا میں اور زیان ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں وہ بھلا کسی اور سے کیسے شادی کر سکتی ہے۔" وہ سر جھٹکتے ہوئے بول رہا تھا۔ اس دوران وہ دونوں ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ نمناں اسے بٹھانے کے بعد عنیزہ بیگم کو اطلاع کرنے چلی گئی۔

وہاب ڈرائنگ روم میں سجے قیمتی فرنیچر کا جائزہ لینے میں مصروف تھا' جب عنیزہ اندر داخل ہوئیں۔ وہاب انہیں دیکھتے ہی بے اختیار اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ موسم کے لحاظ سے اسکن کلر کے سوتی کپڑوں میں ملبوس چادر لیے وہ بے انتہا بارعب اور خوب صورت نظر آرہی تھیں۔ ان کے نقوش میں نمایاں طور پہ ذیان کی جھلک موجود تھی۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نہناں صوفے کے پیچھے کھڑی باری باری ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"کون ہو تم اور کس لیے یہاں آئے ہو؟" ان کی شخصیت کی طرح آواز میں بھی عجیب سا وقار اور نرمی تھی۔ "میرا نام وہاب ہے' ذیان سے ملنے آیا ہوں۔" وہاب نے اعتماد کی کمزور پڑتی ڈور کو مضبوطی سے تھامنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ عنیزہ کے ماتھے پہ ناگواری کی شکنیں ظاہر ہوئیں جیسے انہیں اس کے منہ سے ذیان کا نام سننا اچھا نہ لگا ہو۔

"تم ہو کون کیا رشتہ ہے تمہارا زیان سے؟"

"زیان میری خالہ زرینہ امیر علی کی بیٹی ہے' میری منگیتر ہے۔ پچھلے چند ماہ سے میں زیان کو پاگلوں کی طرح تلاش کر رہا ہوں۔ خالہ مجھ سے ناراض ہو گئی ہیں اور زیان بھی۔ اس لیے مجھے بتائے بغیر یہاں آپ کے پاس چلی آئی ہے۔ آپ مجھے اس سے ملوادیں میں بہت پریشان ہوں۔" وہاب کے لہجہ میں پریشانی اور اعتماد تھا۔ عنیزہ الجھی نگاہوں سے اسے تکنے لگیں۔

بوا رحمت نے ہی صغریٰ اور نواز کی معرفت ان سے رابطہ کیا تھا۔ پھر عنیزہ کی خود بوا رحمت سے بات ہوئی انہوں نے امیر علی کے انتقال اور زیان کی مشکلات کے حوالے سے کھل کر بات کی تھی۔ زیان کو فوراً" یہاں سے لے جانے کی درخواست کی تھی اور اب یہ وہاب جانے کیوں اس کی پرسکون زندگی میں ہلچل مچانے آیا تھا۔ عنیزہ کی سوچ تیزی سے کام کر رہی تھی۔

اس دوران انہیں نیناں کی یہاں موجودگی کا دھیان ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تجسس آمیز دلچسپی سے وہاب کی سب باتیں سن رہی تھی۔

"زیان کی شادی ہو گئی ہے اور بوا مجھے سب حالات سے آگاہ کر چکی ہیں۔ میں بہت نرمی سے بات کر رہی ہوں۔ عزت سے واپس چلے جاؤ اور آئندہ تمہاری زبان پہ میری بیٹی کا نام نہیں آنا چاہیے۔"

یہ کہتے ہی عنیزہ جھٹکے سے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔ صد شکر اس وقت حویلی میں ملک جہانگیر 'ملک ارسلان یا ملک ایبک میں سے کوئی ایک بھی موجود نہیں تھا۔

عنیزہ دروازے کی طرف مڑیں' نیناں کو وہاں دیکھ کر انہیں پہلی بار اس پہ غصہ آیا مگر وہ مصلحتاً" پی گئیں۔

"تمہیں باہر کا راستہ دکھاؤ۔" وہ تحکم آمیز لہجے میں بولتیں ڈرائنگ روم میں سے باہر نکل گئیں۔

نیناں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ گیٹ تک پہنچتے پہنچتے اس میں اور وہاب میں بہت سی معلومات کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ خاص طور پہ یہ معلومات نیناں کے لیے بہت مفید تھیں۔

☆ ☆ ☆

گھر لوٹتے ہی ملک ارسلان کو کسی غیر معمولی تبدیلی کا احساس ہوا۔ کیونکہ عنیزہ کے چہرے پہ بے پناہ پریشانی چھائی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہوئی ہے میرے پیچھے۔ میں تمہیں اچھا خاصا چھوڑ کر گیا تھا صبح۔"

"واقعی میں بے حد پریشان ہوں آج وہاب آیا تھا زیان سے ملنے۔" وہ دونوں ہاتھ مسل رہی تھیں۔

"کون وہاب؟" فوری طور پہ ملک ارسلان کو یادداشت کا خانہ کھنگالنے کے باوجود بھی وہاب نامی شخص یاد نہ آسکا۔

"آپ کو سب بتایا تھا تو میں نے' جب زیان کو آپ خود جا کر لائے تھے۔ بوا رحمت نے مجھے وہاں کے سب حالات بتائے تھے صغریٰ اور نواز آکر ہم سے ملے تھے آپ کو یاد نہیں ہے؟" وہ اچنبھے سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ ارسلان کو فوری طور پہ سب یاد آگیا۔

"میری بیٹی پہلے ہی ان کے ہاتھوں دکھی ہے اب وہ یہاں بھی پہنچ گیا ہے۔ جہانگیر بھائی اور ایبک کو زیان کے گزشتہ معاملات پتا نہیں ہیں اس لیے مجھے عجیب سا ڈر لگ رہا ہے۔ میں نے وہاب کو فوراً" یہاں سے چلتا کیا ہے اگر اس کی ملاقات میری جگہ جہانگیر بھائی' افشاں بھابھی یا ایبک سے ہو جاتی تو کیا ہوتا۔!! وہ کیا سوچتے زیان کے بارے میں۔ کیونکہ وہ اس کے ماضی سے آگاہ نہیں ہیں اس کی مشکلات کا انہیں اندازہ نہیں ہے جو اپنے سگے باپ کے پاس رہتے ہوئے اس نے برداشت کی ہیں۔ میں پہلے ہی کرائسس میں ہوں ملک صاحب۔ زیان کا علاج کر رہے ہیں جلالی بابا۔ اس مرحلے پہ وہاب والی بات کھلتی ہے تو سوچیں کیا ہوگا۔" عنیزہ رو دینے کو تھیں۔

"سب سے پہلے تم یہ غلط فہمی دور کر لو کہ زیان صرف تمہاری بیٹی ہے۔ وہ اب ہماری بیٹی ہے۔ تمہیں کتنی بار کہا ہے خود کو مجھ سے الگ مت کیا کرو' نہ سمجھا

کرو۔ ہمارے دکھ سکھ ایک ہیں' خوشیاں ساجھی ہیں۔ رہی بات زیان کی تو میں اس کا بال بھی بیکا نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے اپنی بیٹی پہ تم پہ پورا یقین ہے۔"

"زیان بوا رحمت سے بہت اٹیچ ہے اور دل ہی دل میں کافی پریشان بھی ہے' وہ شادی میں بھی تو شریک نہیں ہوئی ہیں۔ آپ بوا رحمت کو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ یہ آپ کا میری ذات پہ ایک اور احسان ہوگا۔ کیونکہ بوا کے مجھ پہ بہت احسانات ہیں۔ میں ان احسانات کا بدلہ چکانا چاہتی ہوں۔" وہ لجاجت سے گویا ہوئیں۔

"بیگم صاحبہ جو آپ کا حکم۔ بندہ انکار کی جرات نہیں کر سکتا۔" وہ انہیں ٹینشن سے نکالنے کے لیے قصدا" ہلکے پھلکے انداز میں بولے۔ وہ اس میں کامیاب رہے۔ کیونکہ عنیزہ مسکرا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہاب نیناں کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ نیناں انڈسٹریل ہوم میں تھی۔ "ملک محل" میں تو وہاب سے ملاقات کرنا مشکل تھا۔ اس لیے اس نے وہاب کو یہاں بلوایا تھا۔ وہ جس طرح مایوس و ناکام ہو کر ملک محل سے نکلا تھا' اس کے بعد نیناں سے ملاقات اس کے لیے امیدوں کا مرکز ثابت ہوئی تھی۔ نیناں اسے کرید کرید کر زیان' امیر علی' زرینہ بیگم اور اس کے بارے میں سوال کر رہی تھی۔ وہاب نے بڑی تفصیل سے زیان کی گزشتہ زندگی کے ابواب ایک ایک کر کے اس کے سامنے کھولے تھے۔ نیناں کو زیان کے بارے میں کار آمد معلومات حاصل ہوئی تھی۔ وہاب سے ملاقات خاصی سود مند ثابت ہوئی تھی۔

"زیان اور میں ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں۔ میری خالہ نے ہمارے بیچ غلط فہمیوں کی دیوار کھڑی کی ہے۔ ایک سازش کے تحت' خالہ نے زیان کو یہاں بھیجا ہے۔ اس کے بعد بوا رحمت کے ساتھ خود بھی روپوش ہو گئی ہیں۔ میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا ہوں۔ زیان کو جب یہاں بھیجا گیا تو تب ہماری شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

یہ انصاف نہیں ہے میری منگیتر کی شادی زبردستی میرے علم میں لائے بغیر کی گئی۔ میں آرام سے نہیں بیٹھوں گا۔ امیر خالو کی مرضی سے سب کچھ ہوا تھا۔ دھوم دھام سے منگنی ہوئی تھی ہم دونوں کی۔" وہاب نے پوری طرح نیناں کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔

"میں تمہاری پوری پوری مدد کروں گی۔ پر اس کے لیے تمہیں میری ہدایات پہ عمل کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔ زیان کو حاصل کرنے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔" وہ جوش سے بولا۔

"اب تم جاؤ کل اس وقت ہم یہاں سے شہر کے لیے روانہ ہوں گے۔ ہم دونوں بہتر طور پہ ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں۔ تمہیں زیان اور میرا ایک مجھے مل جائے گا۔" آخری جملہ نیناں نے دل میں کہا۔

وہاب نے تو اس کی ساری پرابلمز ہی حل کر دی تھیں۔ ورنہ ایک کا حصول اسے دنیا کا ناممکن ترین کام لگ رہا تھا۔ اندرونی ہیجان اور اضطراب سے اس کی رنگت سرخ ہو رہی تھی۔ جانے سے پہلے اسے ایک کو کال کرنی تھی۔ آخر کو اسے وہاب کی آمد کی اطلاع دینی تھی۔ اس کے بعد ملک محل میں رکنا بے کار تھا۔ اسے اب ایک نئے نام اور نئے چہرے کے ساتھ ملک ایک سے ملنا تھا۔ نیناں نامی شخصیت کے ساتھ وہ ایک کو حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا حصول دشوار تھا۔ ہاں رنم کو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ رنم جو خوب صورت دلکش و حسین تھی۔ دولت مند تھی۔ اسے کوئی کافر ہی انکار کر سکتا تھا۔ اسے اب واپس احمد سیال کے پاس جانا تھا۔ اسے دوبارہ اپنے سامنے دیکھ کر انہوں نے اسے یقیناً "معاف کر دینا تھا۔ کیونکہ وہ اس سے ناراض رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ نیناں کے لبادے اور چہرے سے وہ ویسے بھی تنگ آچکی تھی۔ اسے اب نئی شخصیت کے ساتھ ملک محل میں دھوم دھام سے واپس آنا تھا۔ بس رنم کے چہرے کے ساتھ پھر سے ایک کی زندگی میں زور دار انٹری لینی تھی۔ وہاب ملک

محل سے نکل کر اس کے ساتھ ہی یہاں تک آیا تھا۔ اب کل اسے یہاں سے وہاب کے ساتھ ہی روانہ ہونا تھا وہ بہت خوش تھی۔

☼ ☼ ☼

جلالی بابا زیان کے علاج کے لیے کامیابی سے چلہ کاٹ رہے تھے۔ ایبک کے جانے کے بعد سے لے کر اب تک زیان بالکل ٹھیک رہی تھی۔

جلالی بابا کے ٹرانس میں آکر عنیزہ بیگم نے گھریلو باتیں بھی انہیں بتادی تھیں۔ اپنی امیر علی سے شادی کا احوال' زیان کی پیدائش' امیر علی سے علیحدگی' جوان ہونے کے بعد زیان کی خود سے نفرت سب کچھ ہی تو جلالی بابا کے علم میں آچکا تھا۔ جلالی بابا نفسیات انسانی کے ماہر تھے۔

زیان تو سونے کا انڈا دینے والی مرغی ثابت ہوئی تھی۔ چلے کے دوران انہوں نے عنیزہ بیگم کے ساتھ ساتھ افشاں بیگم سے بھی خوب مال پانی بٹورا تھا۔ محل میں آنے کی راہ ہموار ہوئی تھی۔ حالانکہ گھر کے تینوں مردوں کو جلالی بابا کے طریقہ علاج سے اختلاف تھا۔

ملک جہانگیر اور ملک ارسلان دونوں بھائی اپنی اپنی بیویوں کی وجہ سے خاموش تھے اور ملک ایبک افشاں بیگم کی وجہ سے چپ تھا۔ ورنہ اس نے جب رات کو زیان کو جلالی بابا کے کمرے میں دیکھا تھا اس کا جی چاہ رہا تھا کہ مار مار کر بابا کا حلیہ ہی بگاڑ دے۔ بھلا زیان کو تنہائی میں آدھی رات کو بلا کر کون سا علاج ہوتا تھا۔ اس کی حساس حس شامہ نے جلالی بابا کے کمرے میں قدم رکھتے ہی ایک مخصوص بو فوراً" محسوس کی تھی۔ اگرچہ یہ بہت ہی خفیف سی تھی لیکن اس نے جان لیا تھا کہ یہ شراب کی بو ہے۔ جلالی بابا نے قالین کے اس حصے پہ جہاں بوتل ٹوٹی تھی وہاں انگیٹھی کے انگارے پھینکے تھے تاکہ کسی کو شک نہ ہو لیکن اس احتیاط کے باوجود بھی ایبک کو معلوم ہو گیا تھا۔ تب ہی تو اسے شدید غصہ آیا تھا۔ جلالی بابا کی گھبراہٹ اور خوف و ہراس اس نے کمرے میں قدم رکھتے کے ساتھ ہی محسوس کیا تھا بعد

ازاں زیان کے جن کی وجہ سے بابا کو خود کو سنبھالنے کا موقعہ مل گیا۔ ایبک زیان کی طرف سے بے خبر نہیں تھا اس نے حویلی میں کام کرنے والے اپنے ایک اعتماد کے بندے کی ڈیوٹی لگائی۔

ایبک کا یہ ملازم انور بہت سمجھدار تھا۔ وہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر جلالی بابا کی سرگرمیوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ اگر جلالی بابا زیان کو دوبارا تنہائی میں طلب کرتا تو اس موقعہ پہ اسے لازمی اپنی موجودگی ثابت کرنی تھی ایک طرح سے وہ زیان کی حفاظت کر رہا تھا۔

ایبک نے اپنے ایک پولیس ڈپارٹمنٹ میں موجود قریبی دوست کو عامل جلالی بابا کے بارے میں تفصیلات مہیا کردی تھیں اب باقی کام اس کا تھا' بہت جلد اس کے ہاتھ جلالی بابا کی سونی چربیلی گردن کو ناپنے والے تھے۔

☼ ☼ ☼

عامل جلالی بابا زیان کے علاج کے آخری مرحلے میں تھے۔ اس نے شکر ادا کیا تھا کہ بابا جی نے پھر اسے اکیلے اپنی خلوت میں طلب نہیں کیا۔ اس رات زیان نے بابا جی کی آنکھوں میں ناچتی ہوس فوراً" محسوس کرلی تھی۔ بابا جی نے جو مشروب اسے پینے کے لیے دیا تھا وہ اس نے پھینک دیا تھا' بوتل ٹوٹ گئی تھی۔ بابا جی کی نگاہوں کا سحر اسے بے بس کرتا جا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا ذہن عامل جلالی بابا کے قبضے میں جا رہا ہے کیونکہ وہ پلک جھپکائے بغیر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ انہوں نے اس کی چال اس پہ آزمانے کی سعی لاحاصل کی تھی۔ زیان کچھ دیر اور ان کی آنکھوں میں دیکھتی رہتی تو وہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہو چکے ہوتے۔ وہ ویسے بھی انسانی نفسیات اور کمزوریوں سے پوری طرح واقف تھے پہلی بار ہی بھانپ گئے تھے کہ زیان ڈرامہ کر رہی ہے۔

زیان نے وہ بوتل کیا توڑی گویا بابا جی کا ٹرانس توڑ دیا جس نے اس کے ذہن کو اپنے کنٹرول میں لیا ہوا تھا۔ بابا جی کے گال پہ لگنے والا تھپڑ اس بات کا ثبوت تھا کہ

وہ مکمل طور پر ٹرانس سے باہر آچکی ہے۔ اس کی عزت جلالی بابا جیسے لٹیرے سے بچ گئی تھی۔ جلالی بابا نے اس کی عقل کی آنکھیں کھول دی تھی۔ تب ہی تو اس رات ایبک کے سامنا ہونے کے بعد سے اس پہ آتم توش نہیں آیا تھا۔ اس نے آخری بار ملک ایبک کو اپنا رنگ دکھایا تھا۔ عنیزہ بے پناہ خوش تھیں عامل جلالی بابا واقعی بہت پہنچے ہوئے تھے۔ زیان کے جن کو قابو کرلیا تھا۔ وہ اب نارمل طریقے سے معاملات زندگی میں حصہ لے رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

نمناں ملک محل سے غائب ہوگئی تھی۔ اس کے کمرے سے اس کے ہاتھ سے لکھا ہوا پرچہ ملا تھا۔ اس نے بغیر کسی القاب و آداب کے بطور خاص کسی کو بھی مخاطب کیے بغیر لکھا تھا۔

"میں اپنی مرضی سے ملک محل چھوڑ کر جارہی ہوں۔ میں اپنی زندگی اور حالات سے تنگ آچکی ہوں۔ مجھے اب مزید جینے کی تمنا نہیں ہے۔ میں اپنے ہاتھوں زندگی کا خاتمہ کروں گی۔ میں گمنام موت مرنا چاہتی ہوں اس لیے برائے مہانی مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ کیونکہ یہ کوشش بے کار ثابت ہوگی میں یہاں سے نکل کر پہلی فرصت میں اپنی زندگی ختم کروں گی۔"

فقط بدنصیب نمناں۔

خط پڑھ کر عنیزہ کا تو جو حال ہوا سو ہوا زیان بھی پریشان ہوگئی۔ افشاں بیگم بھی روہانسی ہورہی تھیں۔ ملک ارسلان اور ملک جہانگیر نے اسے قریب کے علاقوں میں تلاش کروانے کی ناکام کوشش کی۔ وہ جس طرح ایک دن اچانک ملک محل میں آئی تھی اس طرح اچانک غائب بھی ہوگئی تھی۔ اس کا کوئی اتا پتا کسی کے پاس نہیں تھا۔ اس کی اصل حقیقت اس کی محسن عنیزہ تک کو معلوم نہ تھی جو اسے ہوٹل سے بچاکر اپنے ساتھ لائی تھیں۔ ملک محل میں کئی دن نمناں کے جانے کے بعد سوگواری چھائی رہی۔ عنیزہ تو پورا دن ٹی وی دیکھتیں اخبار پڑھتیں کہ شاید کہیں سے نمناں کی خبر مل جائے۔

☆ ☆ ☆

احمد سیال کو اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آرہا تھا۔ یقین تو رنم کو بھی اپنی آنکھوں پہ نہیں آرہا تھا۔ احمد سیال زندہ سلامت اس کے سامنے موجود تھے اور وہ اپنے گھر میں تھی۔ وہ بھاگ کر پوری شدت سے ان سے لپٹی تھی۔ منظر تو پہلے ہی اس کی آنکھوں میں دھندلا رہا تھا اب یہاں سے گلے مل کر آنسوؤں کو بہنے کا راستہ مل گیا تھا۔ اتنے ماہ کی دوری سخت زندگی اور اپنی ضد کے منفی نتائج نے اس کے سب کس بل نکال دیئے تھے۔ وہ پاپا سے بے حد شرمندہ تھی ان سے نگاہیں تک نہ ملا پارہی تھی۔ وہ اسے لپٹائے اس کا ماتھا ہاتھ بال بار بار چومتے اس کے ہونے کا یقین کرنا چاہ رہے تھے۔ وہ واقعی ان کی لاڈلی رنم تھی ان کا جگر گوشہ، وہ تو تقریباً مایوس ہی ہوچکے تھے۔ اب ان پہ شادی مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ اتنے سارے دنوں کا احوال پل بھر میں معلوم کرلینا چاہ رہے تھے۔

"پاپا میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گی پہلے اپنا گھر تو دیکھ لوں۔ میں نے اپنا گھر بہت مس کیا ہے۔" وہ بھیگی بھیگی آنکھوں سمیت مسکرائی۔ احمد سیال بھی مسکرا رہے تھے۔

"آؤ میں تمہیں گھر دکھاتا ہوں۔ تمہارے بغیر تو میں جیسے مردہ ہوگیا تھا۔" احمد سیال نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ چپہ چپہ گوشہ گوشہ دیکھ رہی تھی۔ خوش ہورہی تھی۔ نمناں بن کر اس نے جو زندگی گزاری تھی وہ بہت قابل رحم اور مشکل تھی۔ وہ سوچ رہی تھی جیسی زندگی اس نے گزاری ہے ویسی زندگی گزارنا وہ بھی نمناں بن کر بہت مشکل ہے۔ جبکہ احمد سیال کی بیٹی کی حیثیت سے اس نے سپر لگژری لائف انجوائے کی تھی وہ اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ ملک محل میں نمناں کی حیثیت سے اس نے اچھی طرح جان لیا تھا۔

پاپا اس کی باتوں میں آکر کسی کے ساتھ اس کی شادی کر بھی دیتے تو یقیناً" اس کا انجام حسرت ناک ہوتا۔ یعنی وہ صرف اس کی سوچ تھی بچکانہ سوچ کہ وہ پاپا سے شادی کے بعد کچھ بھی نہیں لے گی۔ اب سوچتی تو جھرجھری آتی۔ سہولیات اور اختیار کے بغیر بھی زندگی کوئی زندگی ہوتی ہے۔ اور اختیار دولت سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ ملک محل میں خادمہ کی زندگی نہ گزارتی۔ اب وہ بھی ملک محل کے مکینوں کی ہم پلہ ہو گئی تھی۔

احمد سیال کو اس نے حرف بہ حرف سب داستان کہہ سنائی تھی۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ اتنے ماہ وہ ملک جہانگیر کی حویلی میں رہی اور انہیں خبر ہی نہیں ہوئی۔ کاش دوست کی دعوت پہ وہ ایبک کی شادی میں چلے جاتے۔ معاذ کے پاکستان آنے پہ چلے جاتے تو انہیں اتنی اذیت نہ اٹھانا پڑتی۔ رنم ان کے اتنے پاس رہ کر بھی دور رہی تھی۔ وہ انہیں گزرے دنوں کا حسرت ناک احوال سنا رہی تھی۔

"پاپا آپ کی بیٹی نے وہاں خادمہ کی سی زندگی بسر کی ہے۔ ایک آواز پہ بھاگ بھاگ کے کام کیے ہیں۔ ملازموں کی نگرانی کی ہے دیکھ بھال کی ہے۔ پاپا وہ ایک خواب تھا بھیانک خواب۔ میں یہ خواب پھر کبھی نہیں دیکھنا چاہوں گی۔ پاپا یہاں ہمارے گھر میں اتنے ملازم ہیں جبکہ وہاں میں خود نوکرانی تھی۔ پاپا یہاں میں پانی مانگ کر پیتی تھی جبکہ وہاں۔" رندھی ہوئی آواز کی وجہ سے اس سے بات بھی مکمل نہ کی گئی۔ احمد سیال نے اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔ ان کا اپنا دل شدت غم سے پھٹا جا رہا تھا۔

"میرے بچے ملک جہانگیر نے تمہارا رشتہ اپنے بیٹے کے لیے ہی تو مانگا تھا۔ میں تمہیں عزت سے دھوم دھام سے رخصت کر کے ملک محل میں بھیجنا چاہ رہا تھا جبکہ تم ضد میں آکر غلط طریقے سے وہاں پہنچیں۔ ملک ایبک نے کسی بھی قسم کا جہیز نہیں لیا ہم یہی چاہتی تھی ناں کہ تمہیں صرف تمہارے حوالے سے قبول کیا جائے۔ تم ایک بار میری بات مان لیتیں تو ایک مضبوط حوالہ لے کر ملک محل میں جاتیں۔ مگر تم نہماں بن کر گھر سے اپنی ضد کی خاطر نکلیں اور سب کچھ گنوا دیا۔" احمد سیال جیسا مرد بیٹی کا دکھ سہہ نہیں پایا تھا۔ وہ رو رہے تھے۔ رنم بھی تو رو رہی تھی۔ اس کے دل کو جیسے کوئی سینے میں مسل رہا تھا۔ زیان کی جگہ وہ بھی تو ہو سکتی تھی ملک ایبک نے زیان کو ایسے ہی تو قبول کیا تھا۔ وہ بیوی جیسا مضبوط اور باعزت حوالہ لے کر اس کی زندگی میں آئی تھی۔ اور رنم نے پاکر بھی سب کچھ گنوا دیا تھا۔ دونوں باپ بیٹی اپنے نقصان پہ رو رہے تھے۔

بہت دن بعد رنم اپنے بیڈ روم میں گہنے بیڈ پہ تھی۔ اس کا جہازی سائز بیڈ' پردے کارپٹ ڈیکوریشن پیس کھڑکی سے باہر دکھائی دینے والے سرسبز مناظر۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ حتیٰ کہ اپنا سیل فون جو گھر سے جاتے وقت وہ آف کر گئی تھی ویسا ہی پڑا تھا۔ اس نے عنیزہ بیگم کا دیا ہوا سیل فون بیگ سے نکالا۔ سیل فون ہاتھ میں لیتے ہی اس کے لبوں پہ تمسخرانہ مسکراہٹ آئی۔ اس میں ایبک' وہاب' زیان' عنیزہ اور دیگر ملک محل کے مکینوں کے فون نمبر تھے۔ ورنہ وہ یہ کبھی بھی اپنے ساتھ نہ لاتی۔ احمد سیال کی بیٹی کا ذوق ایسا غریبانہ اور تھرڈ کلاس تو ہو نہیں سکتا تھا۔ اس نے نمبر ڈائری میں نوٹ کر کے سیل فون کمرے میں پڑے آرائشی ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ اسے اب اس گھٹیا کم قیمت فون کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

اپنے بیڈ روم میں بیڈ پہ لیٹتے ہی اسے چین آگیا۔ کل تک وہ ملک محل میں تھی سرونٹ کوارٹرز کے ایک کمرے میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ اب وہ اپنے اصل ٹھکانے پہ لوٹ آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

عنیزہ زیان کو لے کر افشاں بیگم کے پاس آئی تھیں۔ زیان نے اتنے ہفتے بعد سسرال میں قدم رکھا تھا وہ بھی بالکل تندرست و توانا ہو کر' وہ آتم توش کی قید

سے آزاد ہو چکی تھی۔ ان کے لیے یہ خوشی بہت بڑی تھی۔ انہوں نے شکرانے کے نوافل ادا کر کے بہو کی نظر اتاری اور صدقے کے بکرے ذبح کروائے۔ زیان بھی سنوری بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ انہوں نے دل کی گہرائیوں سے رب کا شکر ادا کیا تھا۔

زیان سب کے ساتھ ہنس بول رہی تھی۔ گھر واپس آتے ساتھ ہی اس نے اپنے اور ایبک کے مشترکہ بیڈروم کی سیٹنگ تبدیل کروائی۔ اپنے سارے کپڑے الماری میں رکھے۔ زیر لب گنگناتے ہوئے وہ بے حد مسرور تھی۔

افشاں بیگم نے گہری نگاہ سے اس کا جائزہ لیا۔ یہ وہی پہلے والی زیان تھی جسے انہوں نے ایبک کے لیے پسند کیا تھا۔ آتم توش اس کے اور ایبک کے درمیان سے ہٹ چکا تھا۔ دو دن بعد عنیزہ، ملک ارسلان، ملک جہانگیر اور افشاں بیگم کو دوسرے شہر ایک شادی میں جانا تھا۔ انہیں تین چار دن وہاں قیام بھی کرنا تھا۔ پہلے افشاں بیگم تذبذب میں تھیں جائیں کہ نہ جائیں۔ اب زیان ہنسی خوشی اپنے گھر واپس آچکی تھی تو انہوں نے تیاری شروع کر دی۔ ان کے جاتے ہی ایبک نے آجانا تھا اس لیے زیان کو ساتھ لے جانے کے لیے انہوں نے اصرار نہیں کیا۔

☆ ☆ ☆

ملک جہانگیر، ملک ارسلان، افشاں بیگم اور عنیزہ کے ہمراہ تیار ہو کر ملک محل سے جا چکے تھے۔ ملک ارسلان نے اپنے جانے کی اطلاع ملک ایبک کو کر دی تھی۔ اس نے یقین دہانی کروائی تھی کہ رات سے پہلے پہلے گھر زیان کے پاس پہنچ جائے گا۔

ملک ایبک اس پل اس دن اس ساعت کے انتظار میں تھا۔ زیان سے دو دو ہاتھ کرنے کا ٹائم آگیا تھا۔ سب کے سامنے ایبک کو دیکھتے ہی اس کا جن جلال میں آجاتا تھا۔ دوروں میں بھی جان اور شدت بڑھ جاتی۔ وہ زیان کو سب کی موجودگی میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ لیکن آج اکیلے میں یہ کام اس نے آسانی سے انجام دے لینا تھا۔ قدرت نے یہ موقعہ بن مانگے فراہم کر دیا تھا۔ اس موقعے سے فائدہ نہ اٹھانا کفران نعمت کے زمرے میں آتا۔ وہ جلد از جلد ملک محل پہنچنا چاہ رہا تھا۔

آنے سے پہلے اس نے اپنے ہوشیار ملازم انور کو فون کر کے کہا کہ آج رات سب ملازمین کو کسی بہانے رہائشی عمارت سے دور رکھے۔ انور بہت تیز تھا اس نے اسی وقت سوچ لیا کہ یہ کام کس طرح کرنا ہے۔ اس نے بیٹے کا عقیقہ کرنا تھا۔ ملک ارسلان اور ملک جہانگیر خود اس کے گھر جا کر نومولود کو تحفے تحائف دے آئے تھے آج شام کو اس نے خود بھی گاؤں جانا تھا۔ ملک ایبک کی کال آنے سے پہلے وہ چھوٹی بی بی زیان کے پاس اجازت لینے ہی جا رہا تھا۔ اب کال آنے کے بعد اس نے اپنے پروگرام میں تھوڑی سی ترمیم کر لی تھی۔ ملک محل میں کام کرنے والے سب ملازمین کو اس نے اپنے گھر ہونے والی دعوت میں شرکت کی دعوت دی انور کی سب کے ساتھ بہت بنتی تھی۔ اس لیے جب زیان سے اس نے بات کی تو اس نے بخوشی سب ملازمین کو دعوت میں شرکت کے لیے چھٹی دے دی۔ ایک رات ہی کی تو بات تھی۔

گیٹ پہ دو دو گارڈ تھے، خود عنیزہ کی طرف زیبو اور فریدہ تھیں جو گھر کی حفاظت کے نقطہ کے نظر سے انور کی دی جانے والی دعوت میں شریک نہیں ہوئیں۔ عشاء کی نماز کے بعد کھانا کھا کر اوپر بیڈروم میں آگئی تھی۔ زیبو اور فریدہ نے اسے پیش کش کی تھی وہاں اس کے ساتھ رکنے کی مگر اس نے انکار کر دیا کیونکہ گیٹ پہ چاق و چوبند گارڈ موجود تھے۔ فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔

رات دس بجے کا وقت تھا جب ملک محل کے گیٹ کے سامنے ملک ایبک کی گاڑی رکی۔ گیٹ پہ موجود گارڈز نے اسے دیکھ کر زوردار سلام جھاڑا۔ گھر کا مالک آگیا تھا اب وہ دونوں مطمئن تھے۔ ملک ایبک نے گیٹ سے ہی ڈرائیور کو معہ گاڑی سمیت ڈیرے کی طرف روانہ کر دیا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ رہائشی

اندرونی عمارت میں داخل ہوا۔ اس کی چال میں ہمیشہ کی طرح وقار اور اعتماد تھا۔ سب اندرونی لائٹیں آن تھیں۔

دوسری منزل بھی روشن تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر اپنے بیڈ روم کی طرف دیکھا۔ کھڑکیوں پہ پردے گرے ہوئے تھے۔ خوش آئند بات یہ تھی کہ اس کے بیڈ روم کا دروازہ ہلکا سا بھڑا ہوا تھا زیان نے ابھی تک لاک نہیں کیا تھا۔ وہ ابھی تک اندر نہیں گیا تھا۔ اس لیے زیان کی سرگرمیوں سے لاعلم ہی تھا۔

☼ ☼ ☼

ایبک نے بہت آرام سے کوئی آواز پیدا کیے بغیر دروازہ کھولا۔ کمرے میں خوشگوار حرارت پھیلی ہوئی تھی باہر کے مقابلے میں اندر کا درجہ حرارت معتدل تھا۔ زیان بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے لیپ ٹاپ گود میں رکھے مصروف عمل تھی۔ وہ دوپٹے سے بے نیاز بے تکلف آرام دہ حلیے میں تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس وقت ایبک آسکتا ہے۔ اس نے قدم بڑھائے اور اپنے پیچھے ہاتھ مار کر دروازہ بند کیا۔ آہٹ اور دروازہ بند ہونے کی آواز پہ زیان نے نگاہیں اٹھائیں۔

ملک ایبک مضبوط پر اعتماد قدموں سے چلتا اس کی طرف آرہا تھا۔ وہ بے انتہا خوف زدہ ہوگئی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اچانک اس طرح وہ اس کے سامنے ہوگا۔ وہ چیخ مارنا چاہتی تھی پر اسے دیر ہوگئی تھی۔ ایبک اس کے منہ پہ اپنا مضبوط ہاتھ رکھ چکا تھا۔ ایبک کا ایک ہاتھ بازو سمیت اس کے کندھے کے گرد لپٹا ہوا تھا اور دوسرا مضبوط ڈھکن کی مانند اس کے منہ پر جما تھا۔ نہ وہ بھاگ سکتی تھی نہ منہ سے آواز نکال سکتی تھی۔ غنیمت تھا کہ وہ ناک سے سانس لے رہی تھی ایبک کی مضبوط گرفت میں اس کا دم گھٹ رہا تھا اس کا نازک وجود گویا چرمرا کر رہ گیا تھا۔

شاید ایبک اسے مارنے آیا تھا۔ خوف کسمپرسی و بے چارگی درماندگی نے اس کی حالت قابل رحم بنادی تھی۔ اس وقت وہ یہی سوچ سکی تھی یقیناً "سب اس سازش میں شریک تھے تب ہی تو اسے گھر میں اکیلا چھوڑا گیا تھا تاکہ ملک ایبک کو اپنے منصوبے پہ عمل کرنے میں کوئی مشکل نہ ہو۔ اس کی حالت غیر ہورہی تھی۔

"بعد میں جتنا مرضی چاہے چیخ لینا ڈرامہ بازی کرلینا ابھی مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔" ایبک اس کے کانوں کے قریب اپنے ہونٹ لاکر بولا۔ اس کی آواز اور الفاظ میں شدید قسم کا غصہ تھا۔ اسے یقین تھا اب وہ شور نہیں کرے گی کیونکہ ملک ایبک کے الفاظ اور تاثرات نے اسے سمجھادیا تھا کہ اب اداکاری سے کام نہیں چلے گا وہ اس کی ڈرامہ بازی سے واقف تھا۔ ایبک نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹالیا تھا وہ اب اس سے دور بیٹھا تھا۔ اس کے بولنے کے انتظار میں تھا جو اب ہاتھ پاؤں چھوڑ کر مرے مرے انداز میں بیٹھی تھی جیسے اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی معصوم لاچار اور قابل رحم دوسرا نہیں ہے۔ ایبک نے آج سے پہلے اسے تم کہہ کر کبھی بھی مخاطب نہیں کیا تھا آج اس کا ہر انداز بدلا ہوا تھا۔ یقینی طور پر وہ غیض و غضب میں بھرا ہوا آیا تھا۔

"میں وجہ جان سکتا ہوں کہ تم نے یہ سب کیوں کیا۔ کیوں ڈرامہ رچایا۔ ایسی کیا مشکل تھی جو تم نے ہم سب کو ذہنی عذاب میں ڈالا۔" وہ بڑی کوشش کے بعد اپنے لہجہ کو نارمل کرپایا تھا۔ جواباً" وہ خاموش رہی اس کا وہ حال تھا جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ نگاہیں جھکی ہوئی۔ جیسے وہ اس کے بجائے دیواروں سے مخاطب ہو۔

"کچھ بھی کرنے سے پہلے سوچ لینا کہ گھر میں اس وقت باہر گیٹ پہ موجود گارڈز کے علاوہ کوئی نہیں ہے میں نے سب کو چھٹی دے دی ہے۔ اور ویسے بھی تمہارے ڈرامے اور اداکاری سے متاثر ہونے والے یہاں نہیں ہیں۔" اس کا اشارہ افشاں بیگم اور ملک جہانگیر کی طرف تھا۔ زیان کٹ سی گئی۔

"اس لیے سچ بولنا اور کوئی الٹی حرکت مت کرنا۔"

ایک نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی تو اس نے ہراساں رحم طلب نگاہوں سے اس کی سمت دیکھا۔ ایک کی نگاہوں میں ترحم یا ہمدردی کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔

"شاباش بولو جلدی جو بھی ہے۔ میں نے سونا بھی ہے سخت تھکا ہوا ہوں۔" وہ جھنجلایا ہوا تھا۔

"میں نے سب کچھ مما اور آپ کی وجہ سے کیا۔" اس کے حلق سے مری مری آواز برآمد ہوئی۔

"گڈ آگے بولو۔" وہ اس کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔

"مما مجھے چھوڑ کر آگئی تھیں میں نے اپنی عمر کا وہ حصہ بہت کرب اور اذیت میں بسر کیا ہے۔ مجھے مما اور مما سے وابستہ ایک ایک شے 'ایک ایک رشتے سے چڑ تھی جن میں آپ بھی شامل ہیں۔" اب کی بار صاف لگ رہا تھا کہ وہ رو پڑے گی۔

"گڈ اور بھی بتاؤ۔" وہ بالکل نارمل لگ رہا تھا۔

زیان بولتی چلی گئی' بے ربط ٹوٹے پھوٹے فقرے جس کا لب لباب یہی تھا کہ اس نے سب کچھ ماما اور ان کی تمام فیملی کو اذیت دینے کے لیے بدلہ لینے کے لیے انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کر کیا ہے۔ اسے ملک محل کے سب افراد سے مما کی وجہ سے شدید چڑ ہے۔ ظاہر ہے ان میں ملک ایک بھی شامل تھا۔

زیان اپنا پول کھلنے پہ شرمندہ تھی۔ ویسے بھی عامل جلالی بابا کی اندرونی خباثت سے واقف ہونے کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا کہ جلدی اس ڈرامے کا ڈراپ سین کرے گی اور کوئی نیا طریقہ سوچے گی مگر یہ جان کر کہ ایک شروع دن سے ہی واقف تھا وہ اب اس سے نگاہیں تک نہ ملا پا رہی تھی۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی شرمندگی سے اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ زمین میں گھس جائے۔ ملک ایک کی پیشانی پہ لکیروں کا جال سا بنا ہوا تھا' وہ گہری سوچوں میں گم تھا۔ وہ اسے انجان اور بے وقوف اور خود کو بہت بڑی چیز سمجھتی رہی' جو اپنی دانست میں سب کے جذبات سے کھیل کر انہیں بے وقوف بنا رہی تھی اور وہ خود انجانے میں نتائج سے لاپروا ہو کر اتنی بڑی بے وقوفی کر رہی تھی۔

ایک نے بہت دیر بعد سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا وہ اپنی سوچوں کے حصار سے باہر آ کر کسی نتیجے تک پہنچ چکا تھا۔

"زیان" آپ کو اب کوئی بھی ڈرامہ یا الٹی سیدھی حرکت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے میری وجہ سے 'میری فیملی سے چڑ اور نفرت کی وجہ سے یہ سب کیا۔ جس وجہ سے بھی آپ نے یہ سب کیا اب آپ اس وجہ سے پریشان نہیں ہوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ آپ کو مجھ سے بھاگنے کے لیے یا فیملی کو اذیت دینے کے لیے کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ میں اپنے سے وابستہ کسی بھی رشتے یا شخص کو اذیت میں نہیں دیکھ سکتا۔ آپ پہلے بھی اپنی حماقت یا نفرت کی وجہ سے ہم سب کے جذبات سے کافی زیادہ کھیل چکی ہیں۔ میں آپ کو اور اس عمل کی اجازت نہیں دے سکتا۔

باقی' جہاں تک عنیزہ چچی سے نفرت کی بات ہے تو دلوں کے حال اللہ جانتا ہے' لیکن ہم نے شروع سے ہی انہیں اپنی بیٹی کی یاد میں روتے تڑپتے دیکھا۔ انہیں دکھی دیکھ کر ارسلان چچا بھی پریشان ہوتے یہی وجہ ہے کہ جب عنیزہ چچی نے آپ کے بارے میں بات کی تو وہ پوری خوشی اور آمادگی سے خود آپ کو لینے گئے۔

انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ چچی کی دل جوئی کرتے رہے کہ کچھ بھی ہو جائے زندگی میں ایک بار کسی طرح بھی سہی انہیں ان کی بیٹی سے ملا دیں گے۔ قدرت نے خود ہی آپ کو ملک محل میں پہنچا دیا۔ آپ کے آنے سے ہم سب نے سالوں بعد چچی کو خوش دیکھا' مسکراتے دیکھا۔ اس سے پہلے ایسے لگتا تھا جیسے وہ خوش نظر آنے کا ڈرامہ کرتی رہی ہیں۔ ارسلان چچا خوش ہوئے' انہوں نے بہت بار مجھے کہا کہ زیان مجھے اپنی اولاد کی طرح پیاری ہے اگر اللہ مجھے بیٹی دیتا تو وہ زیان جیسی ہوتی۔ یہ دونوں آپ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ان سچے رشتوں کی قدر کیجیے۔ ماضی پہ کڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ نرم دھیمے پھوار برساتے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ ایک ایک لفظ دل پہ اثر کر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں سچائی تھی۔

"باقی میں اپنی اور اپنی فیملی کے حوالے سے کوئی وضاحت نہیں دے سکتا نہ دینا چاہتا ہوں اس لیے میری باتوں کو ذہن میں رکھیے گا۔"

زیان بہت کچھ کہنا چاہتی تھی پر اب اس کی زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی۔ ایک اپنی بات پوری کر کے جس طرح آیا تھا اس طرح جاچکا تھا۔ وہ نڈھال سے انداز میں بیڈ پہ اوندھی ہو کر گر پڑی۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اپنی جیت پہ ہنسے' خوشی منائے یا اپنی ہار پہ سوگ منائے ماتم کرے۔

☆ ☆ ☆

احمد سیال' بیٹی کی پاکستان واپسی پہ سب دوست احباب کو ڈنر پہ انوائیٹ کر رہے تھے۔ انہوں نے اس کی گمشدگی کے دوران بہت کرائسسس کو فیس کیا تھا' خاص طور پہ سب ایک ہی سوال کرتے تھے کہ رنم سیال اچانک کیوں باہر چلی گئی ہے جبکہ ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا اس کا۔ احمد سیال اس دعوت کے ذریعے سب کی تسلی کروانا چاہ رہے تھے۔

یہ آئیڈیا رنم کا تھا۔ وہ ملک ایبک کی پوری فیملی سے ایک نئی حیثیت میں ملاقات کرنا چاہ رہی تھی۔ اس لیے احمد سیال نے جب ملک جہانگیر کو فیملی سمیت انوائیٹ کیا تو انہیں یہ جان کر ازحد خوشی ہوئی کہ احمد کی بیٹی پاکستان واپس آئی ہے۔

رنم نے واپس آکر اپنی ایکٹوٹیز میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اس نے سب سے پہلے بیوٹی سیلون کا رخ کیا تھا۔ ملک محل میں رہتے رہتے اس کی اسکن' ہاتھ پاؤں کی نرمی اور بالوں کا بیڑہ غرق ہو گیا تھا۔ اسے اپنا آپ پرانی کنڈیشن میں واپس لانا تھا۔ بیوٹی سیلون کے بعد اس نے مارکیٹیں اور شاپنگ مالز کا رخ کیا۔ بیوٹی سیلون میں صرف کیا گیا ٹائم اس کے لیے اچھے نتائج لایا۔ وہ پرانی رنم نظر آنے لگی تھی۔ بالوں کی کٹنگ کروا کر اس نے انہیں نئی لک دی تھی۔ یہ اسٹائل پہلے سے بھی زیادہ اس پہ سوٹ کر رہا تھا۔ اس کی نرم چمکدار جلد کی شادابی' گالوں کی سرخی' بالوں کا ریشمی ملائم پن' ہاتھوں پاؤں کی نرمی سب کچھ لوٹ آئی تھی۔

احمد سیال نے ملک جہانگیر کی فیملی کو انوائیٹ کر لیا تھا۔ ان کے بیٹے کی شادی ہو گئی تھی وہ بھی اپنی بیوی کے ساتھ آرہا تھا۔ رنم بے پناہ خوش تھی۔ پاپا نے اس کا ملک محل میں نمناں والا روپ' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں دفن کر دیا تھا۔ یہ حقیقت صرف وہی دونوں جانتے تھے کہ رنم اتنے ماہ کہاں اور کیسے رہی ہے۔ وہ دونوں ہی نمناں نامی باب کو کھولنا نہیں چاہتے تھے۔ احمد سیال کو بس اتنا پتا تھا کہ رنم پڑھنے کے لیے باہر گئی تھی لیکن وہاں پاپا کے بغیر اس کا دل نہیں لگا تو واپس آگئی۔ انہیں رنم سے بڑھ کر دنیا میں کچھ بھی عزیز نہیں تھا۔

اور رنم جانتی تھی دنیا میں اس کے لیے سب سے بڑھ کر قابل اعتماد اور قابل بھروسا رشتہ صرف احمد سیال ہی کا ہے۔ رنم خوش تھی اور خوشی سے دعوت کی تیاری کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

زیان' ملک جہانگیر کے پاس بیٹھی انہیں ایک کتاب سے مختلف اقتباسات پڑھ کر سنا رہی تھی۔ افشاں بیگم زیان کو نثار ہو جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں وہ اندرونی خوشی سے سرشار تھیں۔ اتنے دن سے زیان پہ جن نہیں آیا تھا اور نہ ہی دور دور تک کسی دورے کے آثار تھے۔ اس نے خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا تھا۔ سب سے بڑھ کر اس کی گم صم کیفیت ختم ہو گئی تھی۔ وہ ہنستی بولتی پہلے والی زیان سے الگ ہی لگتی اور تو اور اب وہ نوکرانیوں سے بھی بات چیت کرنے لگی تھی۔

"بابا جان کیا ہو رہا ہے؟" ایک کمرے میں داخل ہوا۔ ملک جہانگیر بستر پہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"پرسکون زندگی سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔" ملک جہانگیر نے مسکرا کر جواب دیا۔

"آپ پہلے سے کافی بہتر لگ رہے ہیں۔" ایک ان کے پاس بیٹھ گیا۔

"میں بس اپنی آنکھوں کی وجہ سے پریشان ہوں ٹھیک طرح سے پڑھ ہی نہیں سکتا ذیان کے ذریعے اپنا شوق پورا کرتا ہوں۔" انہوں نے بہت محبت سے ذیان کی سمت دیکھا تھا۔

"میں آپ کو شہر لے جاؤں گا اچھے ڈاکٹر سے چیک اپ کراؤں گا۔" ایبک نے انہیں تسلی دی۔

"اب ڈاکٹر کیا ٹھیک کریں گے مجھے۔ جب سے آنکھوں میں موتیا اترا ہے' یہ مسائل پیش آرہے ہیں۔ آپریشن کروانے کے باوجود بھی' کبھی کبھی تو سب کے چہرے ہی گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ رشتہ داروں کے علاوہ کسی کی شکل ہی نہیں پہچان پاتا میں۔ خیر بڑھاپے میں یہ سب تو چلتا ہی ہے' میں نے اسے جان کا روگ نہیں بنایا ہے۔ تمہاری شادی کی خوشی میں نے اپنے جیتے جی دیکھ لی ہے اب معاذ کی فکر ہے۔"

"بابا جان معاذ کا آخری سمسٹر ہے وہ جلد ہی آجائے گا۔" ایبک نے نرمی سے ان کے جھریوں بھرے ہاتھ کو تھپکا۔ ملک جہانگیر نے اپنے کڑیل جوان بیٹے کو بڑی محبت سے دیکھا۔

"تم نے ہمیشہ مجھے طاقت دی ہے اور ہاں احمد سیال کے ہاں دعوت پہ بھی جانا ہے۔ اس نے پورے گھر والوں کو بلایا ہے۔ اس کی بیٹی پاکستان واپس جو آگئی ہے۔" ملک جہانگیر نے ایک بار پھر یاددہانی کروائی۔

"ہاں بابا جان میں چلا جاؤں گا۔" وہ سعادت مندی سے بولا۔

"تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ ذیان بھی ساتھ جائے گی اور واپسی پہ تم سیدھے گھر آؤ گے۔ میں نے تم دونوں کو شادی کے بعد ایک بار بھی اکٹھے ہنستے بولتے نہیں دیکھا ہے۔ اب ٹکو کچھ دن گھر میں۔" افشاں بیگم نے ٹوکا تو وہ ہنسنے لگا۔

ذیان نے نظر بچا کر اسے دیکھا۔ کھدر کے کرتے شلوار میں ملبوس ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھے وہ مغرور لگ رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی ذیان کی سمت نہیں دیکھا تھا۔

"امی جان آپ کی بہو پہ اگر جن آگیا تو میرا کیا بنے گا۔" ذیان کو اچھی طرح علم تھا وہ اس پہ طنز کر رہا ہے تب ہی تو اس پہ جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔

"چلو تم دونوں جاؤ اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔" افشاں بیگم نے حاکمانہ انداز میں بول کر بات ختم کرنی چاہی۔ ایبک نے فوراً" سعادت مندی سے سر ہلایا۔ وہ ذیان سے پہلے اٹھ کر گیا۔

ذیان نے مرے مرے قدموں سے بیڈروم کا رخ کیا۔ ایبک بیڈ کے بالکل کونے پہ لیٹا ہوا تھا۔ ذیان کو آتا دیکھ کر اس نے کروٹ بدل کر اس کی طرف پشت کرلی۔ ذیان کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹا تھا۔ ٹوٹی کرچیوں کی چبھن ناقابل برداشت تھی۔ اس کی سسکیوں کی آواز فوراً" ایبک کے کانوں تک پہنچی تھی۔ وہ جو تکیہ منہ پہ لیے لیٹا ہوا تھا۔ تکیہ منہ سے ہٹا کر اس کی طرف آیا جھٹکے سے کمبل اس کے منہ سے سرکایا۔

"اب کیا پرابلم ہے سب کچھ آپ کی مرضی سے ہو رہا ہے' میں آپ پہ کسی قسم کا کوئی شوہرانہ حق بھی نہیں جتا رہا ہوں جو آپ کو اس قسم کے ڈرامے کی ضرورت محسوس ہوئی۔" ایبک کا اشارہ اس کی لال آنکھوں کی طرف تھا۔ ذیان کو اس کی باتیں تیر کی طرح لگیں۔ اس کی باقی سسکیاں سینے میں ہی گھٹ گئیں۔

"میرے سر میں درد ہے اس لیے رونا آگیا تھا۔" اس نے بمشکل خود کو سنبھالا۔

"تو کوئی پین کلر لے لیں یا میری موجودگی کی وجہ سے آپ کو پرابلم ہو رہی ہے۔ بتا دیں میں دوسرے روم میں سو جاؤں گا۔ آپ سے ویسے بھی ڈر لگنے لگا ہے جانے کس وقت آپ پہ جن آجائے اور میرا تماشا بن جائے۔" ایبک کا لہجہ نرم' مگر الفاظ بہت کاٹ دار تھے۔ ایک بار پھر ذیان کا دل چاہا کہ وہ غائب ہو جائے۔

وہ ایبک کی بات کا جواب دیے بغیر کمبل تان کر لیٹ گئی۔ ایبک بھی اپنی طرف آکر لیٹ گیا۔

"میں امی جان کی وجہ سے یہاں آنے اور سونے پہ مجبور ہوں کیونکہ مجھے سب کی نظروں میں موضوع گفتگو بننا پسند نہیں ہے۔ پہلے ہی بہت تماشا اور مذاق

بن چکا ہے میرا۔ آپ کے جن کی وجہ سے۔" اندھیرے میں اس کی آواز برچھی کی مانند اس کے کانوں میں آکر لگی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

☆ ☆ ☆

زیان بنیض احمد فیض کا نسخہ ہائے وفا ہاتھ میں پکڑے بیٹھی تھی۔ فیض کی شاعری اسے حد سے زیادہ پسند تھی۔ وہ کتاب میں پوری طرح کھوئی ہوئی تھی جب پاس پڑا اس کا سیل فون سریلے سر بکھیرنے لگا۔ اس نے نمبر دیکھے بغیر فون آن کر کے کان سے لگالیا۔

"زیان فون بند مت کرنا ورنہ حد سے بھی زیادہ پچھتاؤ گی۔" اس کی ہیلو کی جواب میں دوسری طرف سے وہاب اپنی مخصوص سفاک آواز میں بول رہا تھا۔ زیان کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔

"کیوں کیا ہے فون مجھے تم نے۔" اس نے اپنے لہجہ میں اعتماد سمونے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں تو تمہارے گھر بھی آیا تھا کیا کسی نے بتایا نہیں تمہیں۔ تمہاری ماں سے مل کر گیا ہوں' باتیں کی ہیں ان سے۔ تم یہ سمجھ رہی تھیں کہ گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤ گی تو بچ جاؤ گی مجھ سے۔ میں تمہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالتا۔ تم تو مل گئی ہو اب مجھے زرینہ خالہ کو تلاش کرنا ہے۔ بہت حساب ہیں تم دونوں کی طرف۔" حیرتوں کے بہت سے پہاڑ اکٹھے زیان کے سر پہ ٹوٹے تھے۔ وہاب یہاں ملک محل میں آیا تھا اور اسے پتا بھی نہیں چلا۔ وہ مما سے ملا اور انہوں نے بھی اس سے یہ بات چھپائی۔

وہ ملک محل میں کیسے پہنچا؟ کس نے اسے یہاں کا پتا دیا تھا؟ اس کا پرسنل نمبر وہاب تک کیسے پہنچا۔۔۔؟ اور اب وہ کس برتے پہ اسے اتنی بڑی بڑی دھمکیاں دے رہا تھا۔۔۔؟ وہ ملک محل میں آگیا اور اسے ذرا بھی ڈر نہیں لگا۔ گارڈ تو کسی اجنبی شخص کو ملک محل کے گیٹ سے اندر تک نہیں داخل ہونے دیتے اور اس نے عنیزہ سے ملاقات بھی کرلی۔ وہ ان سوالوں کے جواب اپنے ذہن اور سوچ کے مطابق حاصل کرنے کی تگ و دو کررہی تھی۔

"آئندہ مجھے فون کرنے کی کوشش مت کرنا۔" زیان نے کمزور لہجہ میں اسے دھمکی دینے کی کوشش کی جیسے واقعی وہ ڈر جائے گا۔ اس کی توقع کے برخلاف وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی آج سے پہلے اسے کبھی اتنی مکروہ نہیں لگی تھی۔

"تمہیں فون کرنا کیسے چھوڑ دوں۔ تم میری زندگی کی ضمانت ہو' میری محبت ہو۔ کتنی مشکل سے تو تمہارا سراغ پایا ہے اور تم کہتی ہو کہ مجھے فون ہی نہ کرو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے ٹوٹ کر محبت کی ہے تم سے زیان۔ اور تم میری محبت' چاہت' وفا سب کچھ ٹھکرا کر مجھ سے دور یہاں آگئیں۔ تم سوچتی ہو گی کہ میں کبھی بھی تم تک نہیں پہنچ پاؤں گا' لیکن دنیا گول ہے اور میرے لیے اتنی بڑی نہیں ہوئی ہے کہ تمہیں تلاش نہ کر سکوں۔" اس بار وہ بڑی ملائمت سے بولا تھا۔

"دیکھو مجھ سے ایسی باتیں مت کرو۔ میری شادی ہو گئی ہے۔ میرے گھر میں سے کسی کو پتا چل گیا تو بہت برا ہو گا۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ وہ وہاب کے ساتھ بات کرتے ہوئے پوری طرح چوکنا تھی اور ادھر ادھر بھی دیکھ رہی تھی۔ کوئی آتا تو اسے فوراً" پتا چل جاتا۔ وہاب لمبی بات کرنے کے موڈ میں تھا۔ زیان نے اچانک لائن کاٹ کر اپنا سیل فون ہی آف کر دیا۔

سیل فون آف کر کے زیان' عنیزہ کی طرف چلی آئی۔ وہ عصر کی نماز میں مصروف تھیں۔ اس نے نوکرانی سے مما کے بارے میں پوچھا تھا۔ زیبو نے انہیں بتایا تھا اس لیے وہ فوراً" اس کی طرف آئیں۔ جہاں وہ بے قراری سے چکر کاٹ رہی تھی۔ زیان کے چہرے پہ پریشانی اور اضطراب تھا۔ عنیزہ کے دل میں خدشات سر اٹھانے لگے کہیں اس کے اور ایبک کے مابین کوئی جھگڑا یا تلخی تو نہیں ہو گئی ہے۔

"کیا بات ہے بیٹا۔ آؤ میری پاس بیٹھو۔" انہوں نے محبت سے اپنی طرف بلایا۔ خلاف توقع وہ اعتراض اور انکار کیے بغیر ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ ورنہ جب

سے زیان نے انہیں اپنی نفرت سے آگاہ کیا تھا اس کے بعد سے ان دونوں میں شاذو نادر ہی بات ہوتی تھی۔ ضرور کوئی نہ کوئی ایسی بات تھی جس نے زیان کی نفرت بھی بھلادی تھی۔

"مما یہاں وہاب آیا تھا؟" اس نے انگلیاں باہم ایک دوسرے میں پھنسائی ہوئی تھیں۔ وہ امید افزا نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی جیسے وہ انکار کردیں گی۔ پر ان کا سر اثبات میں ہلا جو اس کے خوف کو کئی گنا بڑھا گیا۔

"تمہیں کس نے بتایا ہے؟" انہوں نے فوراً پوچھا۔

"میں نے تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ جلالی بابا تمہارا علاج کررہے تھے۔ میں بے حد پریشان ہوگئی تھی۔ تمہیں اپنے ساتھ پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ بتاؤ تمہیں کس نے بتایا ہے۔ میرے علاوہ کوئی اس کا نام نہیں جانتا بلکہ ملک محل میں کوئی بھی اسے نہیں جانتا۔"

"مما ابھی اس کا فون آیا تھا۔"

"کیا۔۔۔!" عنیزہ شاکڈ تھیں۔

"کیسے فون آیا اس کا؟" وہ بدحواس ہوگئی تھیں۔

"مما میرے سیل فون پہ ابھی ابھی اس کی کال آئی تھی۔"

"تمہارا نمبر کس نے دیا ہے اسے؟"

"مما مجھے نہیں معلوم۔ میرا پرسنل نمبر کیسے اس کے پاس پہنچا۔ ملک محل سے باہر میرا نمبر کسی کے پاس نہیں ہے۔ یہاں تک کہ میرا یہ نمبر لوارحمت کے پاس بھی نہیں ہے۔" وہ بکھرے لہجے میں بولی۔

"پھر تمہارا نمبر اس نے کہاں سے لیا۔ پہلے وہ یہاں تک پہنچا پھر تمہارا نمبر حاصل کیا۔۔۔ پر یہ کیسے ہوا سب؟" عنیزہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑلیا۔

"مما مجھے نہیں معلوم یہ سب۔ اسی لیے تو آپ کے پاس آئی ہوں۔" پریشانی سے اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

"تم نے کسی اور سے تو بات نہیں کی۔"

"نہیں مما میں سیل فون آف کرکے آپ کے پاس آگئی ہوں۔"

"کسی سے فی الحال بات مت کرنا۔"

"مما وہاب یہاں آیا تھا یہ بات کس کس کو پتا ہے۔" اس نے رک رک کر پوچھا۔

"میں نے یہ بات صرف ملک صاحب کو بتائی ہے۔ ہم دونوں کے علاوہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔"

"مما یہ بات ایبک کو تو معلوم نہیں ہے نا؟" اس بار اس نے مما سے نظر چرائی تھی۔

"نہیں اسے یہ بات معلوم نہیں ہے اور نہ ہی جہانگیر بھائی کو۔ یہ مصیبت بھی تم پہ میری وجہ سے آئی ہے میرے ماضی کی وجہ سے آئی ہے۔ تمہاری نفرت میں کئی گنا اضافہ ہوچکا ہوگا۔" عنیزہ دل گرفتگی سے گویا ہوئیں تو زیان ان کی طرف بس دیکھ کررہ گئی۔

"آج تک تم نے جو دیکھا سنا وہ ایک طرف کا موقف تھا۔ میں مانتی ہوں برسوں کی دوری نے بہت کچھ بدل دیا ہے، لیکن میں چاہتی ہوں تم ایک بار مجھ سے بھی حقیقت کے بارے میں جان لو پھر تمہیں نتیجہ اخذ کرنے میں آسانی ہوگی۔"

عنیزہ کے چہرے پہ امید و بیم کی ملی جلی کیفیت تھی جیسے وہ آج ان کی بات سن لے گی۔ زیان ان کی بات کے جواب میں کچھ بھی نہیں بولی تھی۔ اس کی خاموشی کو عنیزہ نے اس کا اثبات تصور کیا اور تکلیف دہ ماضی کی طرف کھلنے والے دریچے نیم وا کردیے۔

☼ ☼ ☼
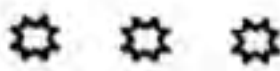
عنیزہ طلاق لے کر ابو کے پاس لوٹ آئی تھی۔ امیر علی نے بچی اس سے چھین لی تھی۔ انہوں نے امیر علی کے خاندان کے بڑوں کو درمیان میں ڈال کر مصالحت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی کہ وہ بچی عنیزہ کے سپرد کردے۔ پر امیر علی نے سب کو ٹکا سا جواب دیا۔ وہ تو بچی کی شکل تک ماں کو دکھانے کا روادار نہ تھا کجا کہ اس کے حوالے کردیتا۔ اسے عنیزہ سے شدید قسم کی نفرت تھی اس نفرت کا نشانہ زیان اور عنیزہ

دونوں ہی بنی تھیں۔ دونوں کو جیتے جی ایک دوسرے سے الگ کردیا تھا۔

عنیزہ کے سامنے عدالت سے مدد لینے کا راستہ بھی موجود تھا۔ پر ابو نے یہ تجویز مسترد کردی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے اگر انہوں نے بچی کی کسٹڈی کا کیس دائر کیا بھی تو جیت امیر علی کی ہوگی۔ اس کے پاس پیسے تھے وہ وکیل کو خرید سکتا تھا جھوٹے گواہ پیش کر سکتا تھا۔ ان کی رہی سہی عزت کو سرعام نیلام کروا سکتا تھا۔ وہ باپ بیٹی امیر علی کے مقابلے میں کمزور تھے۔ اس لیے چپ سادھ لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ عنیزہ کی مسلسل خاموشی قاسم صاحب کے دل پہ قیامت ڈھانے لگی۔ وہ خود کو بیٹی کا مجرم تصور کرنے لگے۔ انہوں نے ہی تو شادی کروائی تھی ایک بار بھی اس کی مرضی یا رضامندی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چپ چاپ ان کے فیصلے کی بھینٹ چڑھ گئی پر اس قربانی کا کوئی فائدہ نہیں ہوا سب رائیگاں ہوگیا۔

راحت نے ملک ارسلان کو اس سانحے کی خبر کردی تھی۔ اس کے بجھے بجھے بے رونق چہرے پہ پھر سے خوشی نمودار ہونے لگی تھی۔ ادھر ملک جہانگیر کو بھی عنیزہ کے حالات سے آگاہی ہوگئی تھی۔ وہ پہلی بار جاکر قاسم صاحب اور عنیزہ سے ملے۔ ان کا چھوٹا سا گھر ایک عام متوسط علاقے میں تھا۔ مالی طور پہ وہ کسی طرح بھی ملک خاندان کے ہم پلہ نہیں تھے۔ پر یہاں ان کے چھوٹے بھائی کا دل اٹکا ہوا تھا اس کی خوشی اس چھوٹے سے گھر میں ہی موجود تھی۔ انہوں نے قاسم صاحب سے عنیزہ کا رشتہ اپنے چھوٹے بھائی کے لیے مانگا۔ خلاف توقع عنیزہ نے سختی سے انکار کردیا۔ وہ کسی صورت بھی دوسری شادی کے حق میں نہیں تھی وہ اس امید پہ بیٹھی تھی کہ امیر علی ذیان کو اس کے سپرد کردے گا۔ وہ باقی زندگی اپنی بیٹی کے ساتھ گزار سکتی تھی۔ اس کے انکار نے ملک ارسلان کو پھر سے مایوسی کے اتھاہ غار میں دھکیل دیا۔

امیر علی نے دھوم دھام سے دوسری شادی کرلی۔ عنیزہ نے قاسم صاحب کے ذریعے اپنی فریاد ایک بار پھر امیر علی تک پہنچانے کی کوشش کی۔ پر وہ ٹس سے مس نہ ہوا بلکہ الٹا اس نے دھمکی دی کہ تم باپ بیٹی میں سے کوئی میرے گھر کے آس پاس بھی نظر آیا تو میں دونوں پہ جھوٹا مقدمہ بنوادوں گا۔

اسی غم میں قاسم صاحب نے ایک رات خاموشی سے آنکھیں موند لیں۔ اب اس اکیلے گھر میں صرف عنیزہ اور اس کی تنہائی تھی۔ محلے والوں نے کچھ عرصہ ساتھ دیا' لیکن کوئی کب تک خبر گیری کر سکتا تھا۔ سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ اس کے سامنے تنہائی اور پہاڑ سی زندگی تھی۔ ملک جہانگیر ایک بار پھر اس کے پاس آئے۔ اس بار ان کے سمجھانے بجھانے پہ عنیزہ نے خاموشی سے ان کی بات مان لی۔ اس کے سوا اب کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

ملک محل میں سب نے کھلے دل سے اسے خوش آمدید کہا۔ ملک ایبک اور ملک معاذ چھوٹے چھوٹے تھے۔ انہیں دیکھ کر عنیزہ کو ذیان یاد آنے لگتی۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر اس نے ایک بار پھر اسے ملنے کی سعی کی۔ اس مقصد کے لیے اس نے بوا رحمت کو خط لکھا اور ذیان سے کسی بھی طرح چھپ کر ملاقات کروانے کو کہا۔ اس خط کے مندرجات الفاظ دل ہلا دینے والے تھے یہ صرف ایک خط نہیں تھا ماں کے دکھی دل کی فریاد تھی۔ اس نے جس جتن سے یہ خط بوا کو بھیجا یہ وہی جانتی تھی پر اسے خط کا کوئی جواب نہیں ملا۔

ملک ارسلان اس کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتے۔ وہ اسے گھمانے پھرانے کے لیے ورلڈ ٹور پہ لے گئے۔ پر عنیزہ کے دل کی بے کلی ختم نہ ہوئی۔ وہ کافی عرصہ نفسیاتی معالج کے زیر علاج رہیں' لیکن دل سے بیٹی کی یاد کو نہ نکال سکیں۔ ملک ارسلان نے انہیں اندھیری راتوں میں سب سے چھپ کر اللہ کے سامنے فریاد کرتے روتے گڑگڑاتے دعائیں مانگتے دیکھا۔ عنیزہ کی دعاؤں کی قبولیت میں سالوں لگ گئے۔ پھر ایک دن وہ معجزہ ہوگیا جس کی توقع وہ جانے کب سے کر رہی تھیں۔ بوا رحمت نے خود ان سے رابطہ کیا اور ذیان کو

اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کہا۔ اٹھارہ برس بعد یہ انہونی ہوئی تھی۔ خوشی سے ان کے ہاتھ پاؤں پھولے جارہے تھے۔ ملک ارسلان عنیزہ کو خوش دیکھ کر خود بھی شادماں تھے۔ وہ بذات خود جاکر زیان کو لے کر آئے۔ عنیزہ جس بیٹی سے ملنے کی تمنا میں برسوں سے تڑپ رہی تھی یہ وہ نہیں تھی۔ زیان تو ان کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

"بس یہ تھی میری زندگی کی کہانی اور سچائی۔" عنیزہ ماضی کا سفر کرکے حال میں لوٹ آئی تھیں۔ انہوں نے زیان کی طرف دیکھا دونوں بغیر پلک جھپکائے ایک دوسرے کی سمت دیکھ رہی تھیں۔ اچانک زیان اپنی جگہ سے اٹھی اور بھاگ کر ان کے گلے سے آلگی۔ آنسوؤں کی جھڑی اس کی آنکھوں سے بہہ رہی تھی۔ اپنی غلط فہمیوں غلط سوچوں پہ وہ جی بھر کر شرمندہ تھی۔ اپنی ماں کی مجبوریوں کا ادراک اسے اب آکر ہوا تھا۔

زیان نے انہیں ہمیشہ انہیں قصوروار اور مستوجب سزا ہی تصور کیا' کتنا برا کرتی آئی تھی وہ ان کے ساتھ۔ پھر انہوں نے اپنی تکلیف کا اظہار کبھی بھی نہیں کیا۔ ذہنی اذیت' کرب' آنسو جو وہ انہیں دے چکی تھی کچھ بھی تو بھولنے کے قابل نہ تھا۔ زیان اپنی گزشتہ زندگی اور رشتوں سے بدگمان ہی رہی۔ امیر علی کی کمزوری اور نفرت کی بدولت زرینہ بیگم کے ہاتھ مضبوط ہوئے جس کی وجہ سے وہ زیان کو اذیت دیتی رہیں۔ امیر علی گھر کے سکون کو خراب ہونے سے بچانے کی خاطر خاموش رہے ان کی یہی خاموشی اور چشم پوشی زیان کو اذیت پرستی اور خود اذیتی کے گہرے اندھیروں میں لے جانے کا باعث بنی۔ وہ خود سے وابستہ خود سے چاہنے والوں کو اذیت دینے کی عادی ہوتی گئی۔

یہ بات بھی قابل غور تھی کہ وہ خود سے وابستہ بہت قریبی رشتوں کو ہی اذیت دیتی آئی تھی سب سے پہلے امیر علی ہی اس کا نشانہ بنے تھے نفرت کا جو بیج انہوں نے بویا تھا اب زیان کی صورت کاٹنا تو تھا۔ اسے انہیں بے سکون کرکے نظر انداز کرکے عجیب سے خوشی ملتی۔ امیر علی کے بعد عنیزہ اور پھر ایبک کا نام اس فہرست میں تھا۔ وہ ملک ارسلان سے بھی برگشتہ رہی تھی اس کے خیال میں وہ بھی برابر کے قصوروار تھے۔ اب وہ عنیزہ کی گود میں سر رکھے رو رہی تھی۔

ملک ارسلان اچانک اس طرف آئے تھے۔ دونوں ماں بیٹی کو دھواں دھار روتے دیکھ کر وہ بغیر کچھ پوچھے ہی سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے ہی دونوں کو چپ کروایا۔ عنیزہ کے آنسو اب بھی نہیں رک رہے تھے۔ ملک ارسلان کا ایک ہاتھ زیان کے سر پہ تھا وہ اسے تسلی دے رہے تھے وہ ننھے بچے کی طرح ہمک کر ان کے دائیں بازو سے آلگی۔

"بابا۔ آئی ایم سوری بابا! میں آپ دونوں کو غلط سمجھتی رہی۔" ندامت سے اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ ملک ارسلان نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ عنیزہ' زیان اور ارسلان۔ تینوں ایک ساتھ۔ روتی آنکھوں کے ساتھ چہرے پہ مسکراہٹ لیے یہ تصویر اب مکمل تھی۔

☆ ☆ ☆

احمد سیال کی طرف سے دی گئی دعوت میں ملک جہانگیر' افشاں بیگم ملک ایبک اور زیان چاروں ہی آئے تھے۔ زیان کا اس قسم کی دعوت میں آنے کا پہلا اتفاق تھا۔ احمد سیال کا تعلق بزنس کلاس سے تھا ان کے مدعو کیے گئے مہمان' اکثر ان کے سوشل سرکل سے تعلق رکھتے تھے۔

احمد سیال نے بڑی گرمجوشی سے ان سب کی اور خاص طور پہ زیان کی خیر خیریت دریافت کی تھی۔ اسے ایک ثانیے کے لیے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے انہوں نے اسے گہری نگاہ سے دیکھا ہو۔ بعد میں یہ احساس پوری تقریب کے دوران اس پہ حاوی رہا۔ احمد سیال نے اپنی اکلوتی صاحبزادی سے ان کا تعارف کروایا۔ ریڈ کلر کے

ماڈرن ڈریس میں ان کی بیٹی شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھی۔ زیان بھی ڈیپ ریڈ کلر کے کامدار سوٹ میں ملبوس تھی، مگر نہ جانے احمد سیال کی بیٹی سے تعارف حاصل کرنے کے بعد زیان کو اپنی تیاری، اپنا قیمتی ڈریس، میچنگ جیولری نفاست سے کیا گیا میک اپ سب کا سب ہی انتہائی فضول لگنے لگا۔ احمد سیال کی لاڈلی بیٹی پوری محفل پہ چھائی ہوئی تھی۔

زیان اسے دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ وہ احمد سیال کے گھر میں ان کی بیٹی کے روپ میں اس حلیے میں اسے نہ ملتی تو وہ کبھی بھی اسے رنم سیال ماننے پہ آمادہ نہ ہوتی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے یہ نمل کی شباہت لیے رنم سیال ہے، لیکن یہ سو فی صد احمد سیال کی بیٹی رنم تھی بھلا کہاں نمل، ایک عام سی لڑکی اور کہاں رنم سیال، ایک بزنس ٹائیکون کی ماڈرن بیٹی جو پڑھنے کی غرض سے پاکستان سے باہر گئی ہوئی تھی۔

کچھ ایسا ہی حال ملک ایبک کا بھی تھا جب احمد سیال نے رنم کا تعارف ملک فیملی سے کروایا۔ وہ بے یقینی سے رنم سیال کو دیکھ رہا تھا جس کے ریڈ لپ اسٹک سے سجے ہونٹ بہت خوب صورتی سے مسکرا رہے تھے۔ اس نے انتہائی گرم جوشی سے ملک ایبک سے ہاتھ ملایا۔ خیر مقدمی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے جدا ہی نہیں ہو رہی تھی۔ ایبک بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا جبکہ رنم کی آنکھوں میں شناسائی کی کوئی رمق تک نہ تھی۔

ایبک اور زیان تو اسے دیکھ کر چونک گئے تھے جبکہ افشاں بیگم کا رویہ نارمل رہا۔ کیوں کہ رنم سیال کی پوری لک ہی چینج تھی صرف ہلکی پھلکی نقوش کی مشابہت سے کیا ہوتا تھا۔ رہ گئے جہانگیر تو ملک محل میں بہت کم ان کا سامنا نمل سے ہوا تھا اور انہوں نے اس پہ خاص توجہ ہی نہیں دی تھی۔ ویسے بھی موتیے کے آپریشن کے بعد ان کے ساتھ بصارت کے مسائل ہو رہے تھے۔ ایبک اور زیان دونوں رنم سیال کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ اس کا ہر انداز نمل سے مختلف تھا۔

ڈنر کے بعد گاؤں واپسی کے لیے ٹائم نہیں رہا تھا۔ احمد سیال نے بڑی محبت کے ساتھ انہیں رکنے کی پیش کش کی۔ تقریب ختم ہو چکی تھی ان کے سوا باقی سب مہمان واپس جا چکے تھے۔ رنم نے اپنے کلاس فیلوز میں سے کسی کو بھی مدعو نہیں کیا تھا۔ انہیں اس کے آنے کی ابھی تک خبر بھی نہیں ملی تھی۔ وہ دل ہی دل میں ان سے ناراض تھی، خاص طور پہ کومل اور فراز سے تو وہ انتہائی بدگمان اور برگشتہ تھی۔ اس لیے تو اس نے ان دونوں کو ابھی تک اپنی واپسی کا بھی نہیں بتایا تھا۔

رنم بہت خوش تھی ایبک پہلی بار اسے ملا تھا وہ رنم سیال کے چہرے کے ساتھ تھی اس کی حیرت دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ الجھن تھی۔ یہی حال زیان کا بھی تھا، پر رنم نے اسے خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کی پوری توجہ ملک ایبک کی طرف تھی۔ ملک جہانگیر، افشاں بیگم، احمد سیال اور زیان ایک ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے بلکہ زیان صرف سامع کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ جبکہ رنم ایک الگ صوفے پہ ملک ایبک کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے چکر میں تھی۔

"اچھا آپ شہر کے ساتھ ساتھ گاؤں میں بھی پراجیکٹ پہ کام کر رہے ہیں واؤ گریٹ۔" رنم نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔

"جی ہاں میں ایک اسکول بھی بنوا رہا ہوں تعمیر کے مراحل میں ہے وہ۔ اور انڈسٹریل ہوم مکمل ہو کر کام شروع کر چکا ہے۔"

"میں آپ کے گاؤں آؤں گی۔ اسکول اور انڈسٹریل ہوم دیکھنے۔ مجھے بھی گائیڈ لائن چاہیے جس پہ کام شروع کر سکوں۔"

"آپ آئیے گا میں آپ کا انتظار کروں گا۔" ملک ایبک بہت خوش ہوا۔ اس ماڈرن لڑکی کے منہ سے غریب اور غریب لوگوں کے مسائل سن کر اسے بہت اچھا محسوس ہوا۔

آہستہ آہستہ سب ہی سونے کے لیے جا چکے تھے

صرف ایبک اور رنم ہی وہاں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ باتوں کے دوران انہیں تیزی سے گزرتے وقت کا احساس تک نہ ہوا۔ اچانک وال کلاک پہ ایبک کی نظر پڑی جو ڈھائی بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ تب ایبک اسے گڈ نائٹ کہہ کر اٹھا۔

زیان صوفے پہ سکڑی سمٹی لیٹی ہوئی تھی پر وہ سو نہیں رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پہ اس نے بے اختیار گردن موڑ کر دیکھا۔ دوسری نظر اس نے وال کلاک پہ ڈالی۔ عام طور پہ وہ اتنی رات گئے جاگنے کا عادی نہیں تھا کیوں کہ اس کا پورا دن مصروف گزرتا تھا اس لیے وہ رات جلدی سے سوتا اور صبح جلدی بیدار ہوتا تھا' آج وہ اپنے معمول سے کافی لیٹ تھا۔ زیان کو نئی جگہ اور رنم سیال کی وجہ سے نیند نہیں آرہی تھی۔ رنم سیال بالکل نہناں کی ہم شکل تھی۔ نہناں کی پراسرار گمشدگی اور رنم کا اسے مشابہت رکھنا دونوں باتیں اسے ناقابل یقین لگ رہی تھیں جتنا سوچتی الجھتی جاتی۔

"کیا بات ہے ابھی تک آپ سوئی نہیں ہیں؟" ایبک نے ایک دوستانہ نظر اس پہ ڈالی۔ ورنہ تنہائی میں وہ کم ہی اس سے مخاطب ہوتا۔ وہ شہر میں کافی مصروف ہو گیا تھا' ہفتے میں دو چکر گاؤں کے لگتے اور تب بھی وہ مصروف ہی ہوتا۔ سارا دن گھر سے باہر رہتا رات کو آتا تو پڑ کے سو جاتا۔

اس دن کے بعد سے وہ تو زیان کے لیے جیسے بالکل ہی اجنبی ہو گیا تھا۔ افشاں بیگم نے اس کی بے تحاشہ مصروفیت کی وجہ سے گھر میں ٹک کر بیٹھنے اور رہنے کی پابندی لگا دی تھی۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی مصروفیت کی وجہ سے زیان نظر انداز ہو رہی ہو۔ تب ہی انہوں نے کہا کہ کچھ دن گھر میں رہو زیان کو گھمانے پھرانے لے جاؤ اسے ٹائم دو۔ جواب میں اس نے نہ انکار کیا نہ اقرار۔

ملک ارسلان نے ایبک کا مصروف ترین شیڈول دیکھتے ہوئے زیان کو آگے اپنی تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ گھر میں کسی کو بھی اعتراض نہیں تھا۔ وہ اپنا تعلیمی سلسلہ شروع کرتی تو لامحالہ اسے شہر میں رہنا پڑتا۔ اور شہر میں ملک ایبک کے پاس اپنی رہائش تھی اس صورت میں دونوں زیادہ سے زیادہ اکٹھے رہ سکتے تھے۔ کیوں کہ ملک ایبک کا زیادہ وقت شہر میں ہی گزرتا تھا آج کل وہ گاؤں میں بھی مصروف تھا۔

"جی نیند نہیں آرہی ہے۔" زیان نے اس کی طرف حیرانی سے دیکھا کیوں کہ ایبک نے اسے خود سے مخاطب کیا تھا۔ وہ صوفے پہ بیٹھ کر شوز اتار رہا تھا۔ زیان نے دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اب ایبک پاؤں میں پہنی گئی جرابیں اتار رہا تھا۔ اس کے پاؤں بالکل صاف ستھرے ناخن شیپ میں تراشے ہوئے تھے اس کے پاؤں کی انگلیوں پہ ہلکے ہلکے بال موجود تھے جو بہت بھلے لگ رہے تھے۔ اب وہ اپنی شرٹ کے اوپری دو بٹن کھول رہا تھا کوٹ اس نے پہلے ہی اتار کر صوفے کی بیک پہ ڈال دیا تھا۔ اس کی شرٹ کی آستینیں فولڈ تھیں جو صوفے پہ بیٹھے بیٹھے اس نے ابھی ابھی کی تھیں۔ اس کی ہاتھ کی پشت اور بازوؤں پہ بھی گھنے بال تھے وہ غور سے دیکھ رہی تھی۔

"میرا خیال ہے آپ کا جائزہ مکمل ہو چکا ہے' میں چینج کرلوں ذرا۔" ایبک نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا وہ باتھ روم کی طرف جا رہا تھا۔ زیان اس کی بات پہ جھینپ سی گئی۔ اس نے زیان کی نگاہوں کی چوری پکڑلی تھی۔ اسے شرمندگی ہونے لگی۔ اس نے منہ کمبل کے اندر کرلیا۔ ایبک شاور لے کر آیا تو وہ کمبل میں سر سے پاؤں تک ملفوف تھی یہاں تک کہ اس کی ایک انگلی یا بال تک بھی نظر نہ آرہا تھا۔ ایبک لائٹ بند کر کے بیڈ پہ آگیا۔ وہ اب فارغ تھا۔ زیان کی طرح وہ بھی نہناں اور رنم کی حیرت انگیز مشابہت پہ حیران تھا' لیکن اپنی حیرانی اس نے رنم سیال پہ ظاہر نہیں کی۔

☼ ☼ ☼

گھر لوٹتے پہ زیان سب سے پہلے عنزہ کی طرف گئی۔ وہ انہیں کچھ جتانے کے لیے بے چین تھی۔ عنزہ لان میں بیٹھی خوش گوار دھوپ سے لطف اندوز

ہو رہی تھیں۔ زیان بھاگنے والے انداز میں ان کے پاس آکر بیٹھی تھی۔ وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔ زیان کے چہرے پہ جوش جھلک رہا تھا۔

"مما۔۔۔ مما میں نے نمناں سے ملتی جلتی لڑکی دیکھی ہے۔" اس نے دانستہ طور پہ اپنے لہجہ میں سسپنس سمویا تھا۔

"کہاں دیکھی ہے؟" عنیزہ فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

"مما ہم جن کے گھر دعوت میں گئے تھے ان کی بیٹی بالکل نمناں کی ہم شکل ہے۔ وہ پاکستان سے باہر تھی حال ہی میں وہ واپس آئی ہے۔"

"اوہ تو تم سب جہانگیر کے دوست احمد سیال کی طرف گئے تھے۔" عنیزہ نے پرسکون سانس لی۔

"آپ کو جہانگیر انکل نے بتایا تو تھا کہ ہم سب ان کی طرف انوائٹڈ ہیں۔"

"ہاں میرے ذہن سے یہ بات نکل ہی گئی تھی۔ جہانگیر بھائی کو اپنے اس دوست کی بیٹی بہت پسند تھی ایبک کے لیے، جا کر دیکھ بھی آئے تھے۔ ہم سب نے بھی احمد سیال کی بیٹی دیکھنے کے لیے جانا تھا لیکن پھر بعد میں پتا چلا کہ وہ پڑھنے کے لیے باہر چلی گئی ہے یوں بات آگے بڑھے بغیر ہی ختم ہو گئی۔" عنیزہ نے اپنی دھن میں بے ساختہ اسے بتایا۔ زیان کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ اس سے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ اس سے پہلے بھی ایبک کے لیے کسی کو پسند کیا گیا ہے۔ ابھی مما کی زبانی اسے علم ہوا تھا اور جانے کیوں اسے یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔ بات مکمل کر کے عنیزہ نے اس کی طرف دیکھا تو انہیں اداسی نظر آئی۔ انہوں نے جیسے اس کا چہرہ اور نگاہیں پڑھ لی تھیں۔

"دراصل میں احمد سیال کی بیٹی جہانگیر بھائی کو معاذ کے لیے پسند تھی پر اس نے کہا کہ میں لڑکی دیکھے بغیر شادی نہیں کروں گا تو اس نے جہانگیر بھائی کو ٹال دیا تھا۔ معاذ نے کہا میں تو ابھی شادی کروں گا نہیں' آپ کو اپنے دوست کی بیٹی اتنی ہی پسند ہے تو آپ ایبک بھائی کے لیے بات چلائیں۔ یہ بات جہانگیر بھائی کے ذہن میں بیٹھ گئی۔ حالانکہ افشاں بھابھی اس کے لیے قطعی طور پہ راضی نہیں تھیں اور ایبک بھی خاموش خاموش سا رہنے لگا تھا۔ پھر بعد میں خود بہ خود ہی بات ختم ہو گئی۔ تم یہاں آئیں تو افشاں بھابھی کو پہلی نظر میں ہی بھا گئیں۔ جہانگیر بھائی کا بھی یہی حال تھا اور رہا ایبک تو اسے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا اس نے خوشی سے تمہارے ساتھ شادی کے لیے رضامندی دی تھی۔"

عنیزہ کو ٹوٹ کر زیان پہ پیار آیا اس وقت وہ چھوٹی سی بچی لگ رہی تھی۔

نہ جانے کیوں اسے رنم سیال سے حسد محسوس ہو رہا تھا اپنا آپ اسے کمتر لگ رہا تھا وہ اپنا اور اس کا موازنہ کر رہی تھی۔ رنم سیال ایک امیر باپ کی بیٹی تھی جبکہ وہ کرب ناک حالات سے گزر کر حویلی پہنچی تھی۔ رنم سیال کے ساتھ شادی کی صورت میں ایبک کو بے پناہ مالی فوائد حاصل ہوتے' لیکن اس نے زیان کو بغیر کسی لالچ کے اور جہیز کے اپنی زندگی میں شامل کیا تھا۔ جوں جوں وہ سوچتی جا رہی تھی احساس کمتری کے گہرے غار میں اترتی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"پاپا مجھے گاؤں جانا ہے' ایبک کے ساتھ مجھے بھی وہاں ایک پراجیکٹ شروع کرنا ہے۔" وہ انہیں مطلع کر رہی تھی۔

احمد سیال نے اسے بے بسی سے دیکھا۔ وہ اس کی رگ رگ سے واقف تھے۔ جس طرح وہ ایبک میں کھلے عام دلچسپی لے رہی تھی وہ انہیں بہت کچھ بتانے کے لیے کافی تھا۔ جب وہ آئی تھی اس نے تفصیل سے پاپا کو ایک ایک بات سے مطلع کیا تھا۔ ایبک سے اپنا لگاؤ اور پسندیدگی ظاہر کرنے میں اسے کسی بھی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ ایبک شادی شدہ ہے۔ وہ اسے بری طرح بھا گیا تھا۔ احمد سیال نے صرف اس کی خواہش پہ ملک جہانگیر کی فیملی کی خاطر اتنی بڑی تقریب منعقد کی تھی۔ وہ اس کی کوئی بات بھی نہیں ٹال سکتے

تھے۔ وہ ضدی تھی اس نے روتے ہوئے پاپا سے التجا کی تھی کہ وہ اسے کسی بھی طرح ایبک سے ملوادیں شادی کروادیں۔ وہ رو رہی تھی اور ان کا دل کٹ رہا تھا۔ پہلے بھی اپنی بات نہ ماننے پہ وہ گھر چھوڑ گئی تھی اس بار وہ کوئی انتہائی قدم اٹھالیتی تو وہ کیا کرتے۔ انہوں نے اس کی آنکھوں میں ایک نیا رنگ دیکھا تھا یہ جنون کا وحشت کا رنگ تھا۔

وہ ملک ایبک پہ صرف اور صرف اپنا حق سمجھ رہی تھی کیوں کہ ایبک کا رشتہ پہلے اسی کے لیے ہی تو آیا تھا۔ وہ گھر چھوڑ کر نہ جاتی تو آج ایبک کی بیوی بن کر ملک محل میں بیٹھی ہوتی۔ اس کی محبتوں پہ بلا شرکت غیرے صرف اور صرف اسی کا حق ہوتا۔ کاش یہ بات اسے ملک محل میں رہتے ہوئے ہی معلوم ہو جاتی تو وہ کسی صورت بھی ایبک اور زیان کی شادی نہ ہونے دیتی۔ بھلا زیان ہوتی کون ہے ایبک کی زندگی میں آنے والی۔ جہانگیر انکل نے اسے اپنے بیٹے کے لیے پسند کیا تھا۔ ایبک صرف اسی کا ہے۔

وہ گاؤں میں ایبک کے قریب رہنے کے لیے پلاننگ کر رہی تھی۔ احمد سیال نے اس مقصد کے لیے بھاری رقم اس کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروادی تھی۔

رنم سیال ملک محل آرہی تھی۔ ملک جہانگیر اس کے لیے گیسٹ روم از سر نو ڈیکوریٹ کروا رہے تھے۔ ملک جہانگیر، رنم سیال کی آمد پہ خوش تھے وہیں پہ زیان پریشان تھی۔ ایبک کے ساتھ صرف ایک ملاقات کے بعد ہی اس نے گاؤں آنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا جواباً ملک ایبک نے بڑے خلوص سے اسے گاؤں آنے کی دعوت دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"معاذ ہم ان کے گھر گئے تھے دعوت پہ۔ یقین کرو وہ بالکل نمناں جیسی ہے۔ میں تو اسے دیکھ کر چونک گئی تھی وہ ہو بہو نمناں جیسی تھی شکل و صورت میں، صرف ڈریسنگ کا فرق تھا۔ حیرت انگیز مشابہت دیکھی ہے میں نے تو پہلی بار۔" وہ معاذ کے ساتھ اسکائپ پہ بات کرتے ہوئے جوش و خروش سے احمد سیال کے گھر جانے اور ان کی بیٹی سے ملنے کا احوال بتا رہی تھی۔ معاذ کو کچھ دن پہلے ہی نمناں کی گمشدگی کے بارے میں علم ہوا تھا۔ وہ اپنی پڑھائی کی وجہ سے مصروف تھا اس لیے اتنی توجہ نہ دے سکا تھا۔ آج فرصت سے زیان سے بات ہو رہی تھی تو وہ اسے نئی نئی باتیں بتا رہی تھی۔

"تو آپ سب سے وہ کیسے ملی؟" معاذ اندر سے چونک گیا تھا، لیکن زیان کے سامنے اس نے اظہار نہیں کیا۔

"ہم سب سے تو اچھے طریقے سے ملی تمہارے بھائی جان کو تو اس نے خاص طور پہ کمپنی دی ہے۔ پہلی ملاقات میں ہی بے تکلف ہو گئی اور اب وہ ہمارے گھر بھی آرہی ہے گیسٹ روم تیار ہے اس کے لیے۔" آخر میں زیان جل کر بولی تو معاذ ہنسنے لگا۔

"وہ ہمارے گھر کیوں آرہی ہے؟"

"گاؤں دیکھنے آرہی ہے اور کچھ سوشل ورک کرنے۔" زیان نے سادگی سے بتایا۔

"سوشل ورک کے لیے اسے شہر میں کچھ نظر نہیں آیا جو گاؤں آرہی ہیں وہ۔ اتنی دور۔" معاذ دل میں کچھ سوچ رہا تھا۔

وہ اسے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ رنم کی طرف سے ہوشیار ہو جائیں۔ زیان پریشان ہو جاتی۔ احمد سیال کے گھر جب اس نے ان کی بیٹی کے فوٹو دیکھے تو نہ جانے کیوں آپ ہی آپ اس کی سوچوں کا دھارا نمناں کے گرد مڑ گیا تھا۔ معاذ اسے جان کر تنگ کرتا تھا۔ بہت سے مواقع پہ معاذ کو ایسا محسوس ہوا کہ نمناں اصل میں وہ ہے نہیں، جو وہ خود کو ظاہر کرتی ہے اگرچہ اس نے خود کو ملک محل کے رنگ میں ڈھالنے کی پوری پوری کوشش کی تھی پھر بھی معاذ کی حساس اور زیرک نگاہ کو کسی گڑبڑ کا احساس ہوتا رہا۔ وہ معاذ کے سوالوں سے ڈر جاتی۔ اس کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش کرتی۔

احمد سیال کی بیٹی اب اچانک بیرون ملک سے واپس آگئی تھی، جس طرح اچانک گئی تھی۔ نمناں غائب ہوئی

تو وہ منظر عام پہ آگئی۔ جانے کیا گورکھ دھندا تھا۔ پہلی ملاقات میں ہی ایبک سے بے تکلفی بھی معنی خیز تھی۔ معاذ اس کے بارے میں شاید کبھی بھی ایسے تجسس کا شکار نہ ہوتا اگر وہ اسے اتفاقاً" زیان بھابھی کی طرف عجیب حسد سے بھری نفرت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے نہ پکڑ لیتا۔ وہ کیسی عجیب مبہم نگاہیں تھیں جن کی نفرت کا جواز پیش کرنا مشکل تھا۔

معاذ کو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے نمنال اور اب رنم سیال ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں۔ اس نے اپنے اندازے اور محسوسات سے زیان کو لاعلم ہی رکھا تھا۔ وہ بے پناہ حساس طبیعت کی مالک تھی پریشان ہو جاتی۔

☼ ☼ ☼
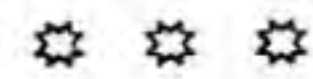
ملک ایبک تیار ہو کر پرفیوم اسپرے کر رہا تھا۔ سلمیٰ ادھر ہی پاس بیٹھی اس کے جوتے پالش کر رہی تھی۔ زیان سیل فون ہاتھ میں تھامے خوامخواہ ہی مصروف نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایبک پرفیوم اسپرے کر کے بیٹھ گیا تھا۔ زیان نے گردن موڑ کر ایبک کی طرف دیکھا وہ صاف دھلی ہوئی جرابیں پہن رہا تھا۔ اس کی ظاہری حالت بھی بہت منظم تھی اس کی شخصیت کی طرح۔ وہ اسے مجبور کر رہا تھا کہ زیان اس کی طرف دیکھے کچھ ایسا سحر تھا اس کی شخصیت میں۔ سلمیٰ نے آخری بار اپنے دوپٹے کے کونے سے ایبک کے شوز پہ لگی نادیدہ گرد جھاڑی۔ اس سے اس کی نگاہوں میں ایبک کے لیے خاموش سی عقیدت تھی کیوں کہ وہ بغیر اس کے کہے اس کی ضرورتوں کو سمجھ کر اکثر و بیشتر اس کی مدد کرتا تھا اس لیے وہ اس کا بے پناہ ادب کرتی تھی۔ زیان کے اندر تک جلن اور کڑواہٹ پھیلی تھی۔

"سلمیٰ جاؤ میرے لیے پانی لے کر آؤ۔" اس کی آواز اس سے غراہٹ سے مشابہ تھی۔ سلمیٰ نے دہل کر چھوٹی بی بی کی طرف دیکھا۔ وہ بہت تیزی سے وہاں سے بھاگی۔ چھوٹی بی بی کے جن سے وہ بھی ڈرتی تھی۔

"آپ سلمیٰ سے آرام سے بھی یہ بات کہہ سکتی تھی۔" ایبک نے خاصے رسان سے زیان کو اس کے رویے کی بدصورتی کا احساس دلایا تھا۔

"میں نے کیا کیا ہے؟" زیان کے انداز میں حیرت آمیز رنج تھا جیسے اسے ایبک کی بات سے تکلیف پہنچی ہو۔

"سلمیٰ کو ہم نے کبھی بھی نوکر نہیں سمجھا ہے۔ ان لوگوں کی بھی عزت نفس ہوتی ہے آپ نرمی سے تحمل سے بات کیا کریں سب کو وہم ہی رہتا ہے آپ کے بارے میں... نہ جانے آپ بول رہی ہیں یا آپ کا جن...!" وہ مسکراہٹ لبوں میں دبا گیا تھا۔ وہ آرام سے بول کر اس کے پاس گزرتا جا چکا تھا۔ زیان کو شدید غصہ آرہا تھا' لیکن وہ ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے جن کی آڑ میں وہ خوب چیخ چلا سکتی تھی' لیکن ایبک جن کی حقیقت سے واقف ہو چکا تھا اب وہ صبر اور جبر ہی کر سکتی تھی خود پہ۔

☼ ☼ ☼

رنم سیال ملک محل آگئی تھی۔ نوکرانیاں اسے دیکھ کر ششدر تھیں ایسے لگ رہا تھا نمنال کپڑے بدل کر ماڈرن سوانگ بھر کر پھر سے آگئی ہے۔ حیرت انگیز مشابہت تھی دونوں کی۔ عنیزہ بھی اسے دیکھ کر چونک گئی تھیں پر رنم سیال کی نگاہوں میں شناسائی کی کوئی بھی رمق نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا ملک محل میں اسے ایسے رد عمل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے اس لیے وہ ذہنی طور پہ خود کو سمجھا بجھا کر لائی تھی۔ اپنی اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب تھی۔ کیونکہ نوکرانیاں اور ملک محل میں رہنے بسنے والے اللہ کی شان کے گن گا رہے تھے وہ چاہے تو کیا نہیں بنا سکتا پھر ایک جیسی شکل کے دو انسان کیوں نہیں بنا سکتا۔

عنیزہ' افشاں بیگم خاصی محبت سے ملی تھیں اس سے۔ ایبک اسکول کی طرف تھا۔ وہ بھی رنم سیال کی وجہ سے جلدی گھر آگیا تھا۔ کھانے میں خاصا اہتمام تھا۔ ڈائننگ ہال میں سب کے ساتھ کھانا کھا کر رنم کو اپنی انا اور عزت نفس کے سرخرو ہونے کا احساس

ہوا۔ اس ملک محل میں وہ نمناں کی عام حیثیت میں رہی تھی اب رنم سیال کی حیثیت میں سب کیسی عزت اور وقار کے ساتھ پیش آ رہے تھے۔ اس کے جلتے دل پہ پھوار پڑ رہی تھی۔

کھانے کے بعد وہ آرام کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ جھٹ ملک ایبک سے اسکول اور انڈسٹریل ہوم دیکھنے کی فرمائش کر دی۔ ایبک اسے اپنی گاڑی میں پہلے انڈسٹریل ہوم دکھانے لایا۔ یہاں آ کر رنم کو طاقت اور اختیار کا احساس ہوا۔ یہاں وہ میڈم کی حیثیت میں بیٹھا کرتی تھی۔ چھٹی ہو چکی تھی ورنہ سب عورتیں اسے دیکھ کر حیران ہوتیں۔ اس نے اشتیاق سے ایک ایک حصہ دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ یہاں اچھا خاصا ٹائم لگ گیا تھا۔ اسکول دیکھتے جاتے تو رات کا اندھیرا پھیل جاتا۔ سو ایبک نے اسے واپسی کا کہا۔ اس نے فوراً "مان لیا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ کافی دیر ایبک کے ساتھ سٹنگ ایریا میں بیٹھی رہی۔

زیان 'بیڈروم میں معاذ کے ساتھ بات کرتے ہوئے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کر رہی تھی۔ ایبک اٹھ کر آیا تو زیان اور معاذ میں رنم سیال کی باتیں چھڑی ہوئی تھیں۔ ایبک کے آتے ہی زیان نے فوراً" موضوع تبدیل کر دیا۔ ویب کیم میں معاذ ایبک کو دیکھ کر اس تبدیلی کی وجہ جان چکا تھا۔ زیان نے جلدی بات ختم کر دی۔ وہ نہا کر آیا تو زیان کمرے میں نہیں تھی۔ ایبک نے تولیے سے بال خشک کرتے ہوئے دروازے سے باہر نظر دوڑائی وہ سخت سردی میں ٹیرس کی دیوار پہ کہنیاں ٹکائے کھڑی تھی۔

"باہر ٹھنڈ ہے زیان آپ بیڈروم میں آجائیں۔" وہ اس کے پیچھے پیچھے آگیا تھا۔ ایبک ہلکی سی شرٹ میں بغیر کسی گرم کپڑے کے تھا۔

"میں چاند کو دیکھ رہی ہوں " آجاؤں گی۔" وہ قدرے رکھائی سے بولی تو ایبک سرہلاتا پلٹ گیا۔ اس نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا نے اندر کی حرارت کو سردپنے میں تبدیل کر دیا تھا گو کہ زیان نے ہیٹر بھی آن نہیں کیا تھا۔ ایبک نے ہیٹر آن کیا اور بک شیلف سے ایک کتاب نکال کر بیڈ پہ آگیا۔ آدھے گھنٹے بعد زیان بھی آگئی۔ دروازہ بند کر کے اس نے اپنا کمبل اٹھایا اور صوفے پہ لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایبک نے اس کی طرف دیکھا وہ سو چکی تھی۔ اس نے کتاب رکھ دی۔

آج سردی کافی زیادہ تھی اس نے فالتو کمبل لا کر صوفے پہ دراز زیان کے اوپر ڈالا۔ کچھ بھی سہی وہ اس کی ذمہ داری تھی۔ زیان ہلکی نیند میں تھی۔ ایبک نے اس کے اوپر کمبل ڈالا تو وہ پوری طرح بے دار ہوئی۔ ایبک اس پہ کمبل ڈال کر جا چکا تھا۔ وہ اس دن کے بعد سے بیڈ پہ نہیں سوئی تھی "آخر کو وہ بھی عزت نفس رکھتی تھی۔ اتنی گری پڑی نہیں تھی۔ جب وہ اسے اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھا تو اسے بھی زبردستی پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سوچوں سے پیچھا چھڑاتے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

(آئندہ ماہ آخری قسط ملاحظہ فرمائیں)

مکمل ناول

نبیلہ ابر راجہ

میں گمان نہیں یقین ہوں

نویں اور آخری قسط

"رنم سیال' ملک ایبک کے ساتھ اس کی جاگیر دیکھنے جارہی تھی۔ گاڑی نہر والی سڑک کے ساتھ ساتھ ہموار رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ کھلے شیشے سے ہوا کے ٹھنڈے جھونکے رنم کے بالوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کررہے تھے۔ اس کے بال بار بار اڑ کر ایبک کے کندھے سے ٹکرا رہے تھے اس کے دل میں گدگدی سی ہورہی تھی۔ ایبک کی توجہ ڈرائیونگ کی طرف تھی۔ رنم سیال نے دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر میوزک پلیئر آن کردیا۔ تب ایبک چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ دھیرے سے مسکرادی۔

بن پوچھے میرا نام پتا
رسموں کو رکھ کے پرے
چار قدم بس چار قدم چل دو ناں ساتھ میرے
بن کچھ کہے
بن کچھ سنے
ہاتھوں میں ہاتھ لیے
چار قدم بس چار قدم
چل دو ناں ساتھ میرے

رنم اسٹیئرنگ ویل پہ جمے ایبک کے مضبوط مردانہ ہاتھوں کو دیکھے جارہی تھی۔ اس کی نظروں کے ارتکاز سے ایبک کی توجہ ایک ثانیے کے لیے تقسیم ہوئی۔ رنم کی آنکھیں لودیتے جذبوں سے دہک رہی تھیں نگاہیں ملنے پہ اس نے چرانے کی یا چہرہ موڑنے کی کوشش نہیں کی۔ گانے کے بول اس کے دلی جذبوں کے عکاس تھے۔ ایبک جزبز ہورہا تھا۔ رنم سیال' بہت تیزی سے اس سے بے تکلف ہوئی تھی۔ اس میں صاف گوئی اور بے باکی تھی۔ بہت آرام سے ہر بات کرلیتی۔ پہلی ملاقات میں ہی اس نے ایبک سے اس کے گاؤں آنے کی بات کی تھی بقول اس کے ایبک کی طرح اسے بھی سوشل ورک سے دلچسپی ہے۔ حالانکہ اسے دور دور تک سوشل ورک سے واسطہ نہیں تھا۔

اپنے علاوہ وہ کسی کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ دوران تعلیم اسے سب دوستوں میں نمایاں رہنے کا جنون تھا اس کی گاڑی' ڈریسنگ مہنگی برانڈڈ اشیا کا استعمال' فراخدلی سے پیسے کا استعمال اس کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اس کے قریبی دوست اس بات سے آگاہ ہوجاتے کہ وہ گاؤں میں عام لوگوں کی بھلائی کے لیے کچھ پراجیکٹ شروع کرنے لگی ہے تو اس کا یا پلٹ پہ ضرور حیران ہوتے۔ ملک ایبک کی قربت حاصل کرنے' اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کے لیے وہ کچھ بھی کرسکتی تھی۔

اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے دل کی بات کرنے کے لیے اس کے پاس وقت کم ہے۔ وہ گزرتے وقت کی تیز رفتاری سے خائف تھی۔ اس کے دلی جذبے اس کی نگاہوں سے جھلکنے لگے تھے۔ ملک ایبک نے سر جھٹک کر جیسے اس کی طرف سے دھیان ہٹایا۔

"آپ اپنی وائف کو بھی ساتھ لے آتے۔" رنم نے پھر خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی جو اچانک ان کے درمیان در آئی تھی۔ وہ فقط سر ہلا کر رہ گیا۔ حالانکہ وہ ایبک سے تفصیلی جواب سننے کی متمنی تھی۔

"میں آپ کے ساتھ اس طرح گھومتی پھرتی ہوں

زیان کو اعتراض تو نہیں ہوتا؟ آخر کو آپ کی نئی نئی شادی ہے۔" اس نے کرید جاری رکھی۔

"نہیں زیان کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔" ایبک نے مختصراً جواب دیا۔

"مجھے کئی بار فیل ہوا ہے کہ آپ دونوں میں کچھ۔" رنم نے بولتے بولتے بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ اپنی بات کا تاثر اس کے چہرے پہ دیکھنا چاہ رہی تھی۔ ایبک اور وہ دونوں اس وقت کھیتوں کے درمیان بنی پگڈنڈی سے گزر رہے تھے۔ ایبک اپنی جگہ رک گیا تھا۔

"آپ کو برا تو نہیں لگا۔" رنم نے اس کی خاموشی سے کچھ اخذ کرنے کی کوشش کی تھی۔

"اصل میں میں نے زیان کے رویے سے اندازہ لگایا ہے کہ اسے آپ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" رنم

نے صاف گوئی سے کہا۔ ایک کا دل لمحہ بھر کے لیے سکڑا۔ اتنے برے حالات ہو گئے تھے کہ ان دونوں کے درمیان جو سرد خلیج حائل ہو گئی تھی یہ اجنبی نو وارد لڑکی کتنی جلدی اس کی تہ تک پہنچ گئی تھی۔ رنم کا ملک محل سے کوئی تعلق نہیں تھا اسے آئے ایک ہفتہ ہی تو ہوا تھا اور۔۔۔

صرف چند دنوں میں ان دونوں کے مابین تعلقات کی نوعیت سے واقف ہو گئی تھی۔ ایک اب آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کی خاموشی اس بات کا ثبوت تھی کہ رنم کے اندازے بالکل درست تھے۔ وہ سرمستی سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی عین اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وقت ہوا سانسیں تھم گئی ہوں اور وہ صدیوں سے اس کے پیچھے پیچھے چل رہی ہو آنکھیں بند کیے خود فراموشی کے عالم میں۔ ایک اس کے سوالوں اور اندازوں کی درستی سے خائف ہو رہا تھا۔ اس لیے تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ٹیبل پہ بہت سے پیپرز پھیلائے ایک اور رنم سیال اسکول کی تعمیر اور دیگر پراجیکٹ کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں پین تھا وہ اسے بتانے کے لیے پیپرز پہ نشاندہی کر رہا تھا۔ ایک اور وہ کرسی جوڑے پاس پاس بیٹھے تھے۔ ایک کے مردانہ پرفیوم کی مہک رنم بڑی وضاحت کے ساتھ محسوس کر رہی تھی۔ اس کی توجہ ایک کی بتائی جانے والی تفصیلات کی طرف چنداں نہیں تھی۔ بلکہ وہ ایک کی طرف متوجہ تھی۔ زیان تین چار بار وہاں سے گزری اور تین چار بار ہی انہیں مگن پایا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ اس طرف نہیں آئی۔ وہاں ایک اور رنم کے علاوہ کوئی بھی نہیں تھا۔ زیان خود کو مصروف رکھنے کے لیے کچن میں آ گئی۔

ایک اور رنم جہاں بیٹھے تھے وہاں سے کچن کافی قریب تھا۔ زیان کو کچن میں گئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ وہاں سے زور زور سے رونے کی آواز آنے لگی سو فیصد یہ آواز زیان کی تھی۔ ایک نے محسوس کر لیا تھا۔ وہ اور رنم ایک ساتھ وہاں پہنچے تھے۔ گھر میں کام کرنے والی دیگر ملازمائیں بھی صورت حال سے آگاہ ہونے پر بھاگی بھاگی آئیں پر ایک نے سب کو وہاں سے ہٹا دیا۔ رنم نے معنی خیز نگاہوں سے ایک کی سمت دیکھا۔ زیان کی نظر بہت حساس تھی اور ابھی تو ویسے بھی اس کی سب حسیات ان دونوں کی طرف متوجہ تھیں۔ کچن میں آ کر اس نے سبزی کاٹنے کی کوشش کی تھی۔ دھیان سارا ایک اور رنم کی طرف تھا اس لیے سبزی کاٹتے کاٹتے اس کے ہاتھ پہ چھری سے اچھا خاصا گہرا کٹ لگ گیا تھا۔ جس سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ اس بہتے خون کو دیکھ کر وہ زور زور سے رو رہی تھی۔ ایک کو پہلے غصہ آیا پر اس کے ہاتھ سے بہتے خون کو دیکھ کر دھیما پڑ گیا۔ افشاں بیگم بھی وہاں پہنچ گئی تھیں۔ وہ زیان پہ خفا ہو رہی تھیں۔ اس کا رونا دھونا اسی طرح جاری و ساری تھا۔

ایک نہ تو اس کے قریب گیا نہ کسی ہمدردی کا اظہار کیا بس دیکھ کر پلٹ گیا۔ وہ پھر سے رنم اور پیپرز کے ساتھ مصروف عمل تھا۔ زیان ہاتھ پہ بینڈیج کروا کر اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ سلمیٰ نے ٹنکچر آیوڈین سے خون صاف کر کے اس کے ہاتھ پہ پٹی لپیٹی تھی۔

رنم سیال کی نگاہ اس کے دل میں خنجر کی طرح اتری تھی۔ اوپر سے ایک کا رویہ۔ وہ بولنا چاہ رہی تھی، احتجاج کرنا چاہ رہی تھی پر ازلی خودسری اور ضد نے زیان کے منہ پہ تالے ڈال دیے تھے۔ وہ کیوں ایک کے سامنے اپنی زبان کھولے وہ اتنا زیرک، باشعور اور سمجھدار ہے اس کی ذرا سی حرکت اور تاثرات سے اس کے محسوسات کی تہ تک پہنچ جاتا ہے پھر اس بار وہ کیوں نہیں سمجھ پا رہا ہے۔ اور رنم سیال جانے کیا بلا ہے۔ جو ایک پہ قابض ہونے کی کوشش کر رہی ہے اسے پھانس رہی ہے۔ اس کے گھر میں بیٹھ کر اسے

جلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ ہوتی کون ہے۔ زیان روتے روتے خود سے لڑ رہی تھی۔

اس کی مخصوص حس نے رنم سیال کے بارے میں مخصوص اشارہ دے دیا تھا۔ پر وہ جان کر بھی انجان بننے کی کوشش کر رہی تھی ہم اسے خود سے اقرار کرتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اسے ماننے میں 'قبول کرنے میں' خود کو سمجھانے میں کوئی مشکل نہیں آتی اگر وہ رنم کی نگاہوں میں وہی تحریر نہ پڑھ لیتی جو اس کے اپنے دل پہ لکھی تھی۔ رنم کی نگاہوں میں محبت جیسا طاقت ور جذبہ پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

✡ ✡ ✡
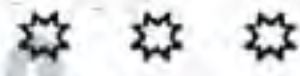
زیان کو اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آ رہا تھا کہ بوا رحمت اس کے سامنے بیٹھی ہیں۔ زندہ سلامت جیتی جاگتی۔ زیان بھاگ کر ان سے لپٹی تھی۔ انہیں چومتے ہوئے وہ روئے جا رہی تھی۔

"بوا آپ کہاں چلی گئی تھیں میری شادی پہ بھی نہیں آئیں۔" وہ روتے روتے نروٹھے پن سے گویا ہوئی۔ بوا کے لیے زیان کی شادی خوش گوار سرپرائز سے کم نہ تھی۔

نواز انہیں ملک محل پہنچا کر واپس جا چکا تھا۔ زیان جلد از جلد سب کچھ جان لینا چاہتی تھی۔ اس کے چہرے پہ سچی مسکراہٹ تھی۔ عنیزہ ان سے بے پناہ محبت اور احترام سے ملی تھیں۔ اب زیان انہیں گھیرے بیٹھی تھی۔ وہ محل نما گھر دیکھ کر مرعوب ہو رہی تھیں یہ بات ان کے لیے اطمینان کا باعث تھی کہ زیان اس محل نما گھر کی مالکہ بن گئی ہے۔ وہ دل میں اللہ کی شکر گزار تھیں۔

نئے گھر' نئی جگہ میں وہ سب پر سکون زندگی گزار رہے تھے۔ تینوں بچوں کا داخلہ بھی اچھے تعلیمی ادارے میں ہو گیا تھا' ساتھ یہ علاقہ ہر طرح سے محفوظ تھا اس کی اپنی سیکورٹی تھی کوئی انجان شخص تصدیق کروائے بغیر یہاں قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ اب وہاب کی طرف سے کوئی خوف نہ تھا۔ بوا کو زیان کی یاد ستا رہی تھی۔ زرینہ بیگم سے اجازت لے کر وہ نواز کے ساتھ یہاں تک پہنچی تھیں۔

عنیزہ' بوا سے برسوں بعد ملی تھیں۔ دونوں کھل مل کر باتیں کر رہی تھیں۔ زیان کی خوشی دیکھنے والی تھی وہ بوا کو اپنے گھر لے آئی انہیں سب سے ملوایا۔ ایک زیان کے شوہر کی حیثیت سے ملا انہوں نے گہری نگاہ سے اسے دیکھا پھر دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے۔ بوا زیان کے بارے میں گزرے لمحوں کا احوال بتا رہی تھیں جس میں تعریفی پہلو نمایاں تھا۔ رنم غور سے ان کا جائزہ لے رہی تھی۔ واضح طور پہ اسے زیان کی بوا پسند نہیں آئی تھیں کیونکہ انہوں نے ہی زیان کو پالا پوسا تھا وہ اس کی زندگی کے اتار چڑھاؤ سے واقف تھیں۔ جو منصوبہ وہاب کی آمد سے اس نے تیار کیا تھا بوا کے منظر عام پہ آنے کے بعد اس منصوبے کی ناکامی کا امکان تھا لیکن رسک تو ہر حال میں لینا تھا۔

افشاں بیگم بوا کی باتیں بہت دلچسپی سے سن رہی تھیں۔

"اتنی سی تھی زیان۔ میں اسے تیار کر کے اسکول بھیجا کرتی تھی۔" بوا نے ہاتھ سے زیان کا سائز بتایا تو ایبک کے لبوں پہ مسکراہٹ آ گئی۔ "پڑھائی میں بہت تیز تھی میری بچی۔ ذرا سا دھیان دینے سے ہی اچھے

نمبر لیتی تھی۔ کبھی اس نے مجھے تنگ نہیں کیا۔ آج کل کی لڑکیوں والے چھل فریب ناز و انداز کچھ بھی نہیں ہے میری بچی میں۔ بہت رشتے آئے میری بچی کے اچھے اچھے گھرانوں سے۔ لیکن امیر میاں نے کہا ذیان ابھی بیس کی بھی نہیں ہوئی ہے میں اتنی جلدی شادی نہیں کروں گا۔ ساتھ ذیان کو پڑھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ شادی کا نام سنتے ہی غصے میں آجاتی شور کرتی کہ میں نے شادی نہیں کرنی۔" بوا مسکراتے ہوئے بتا رہی تھیں۔ ذیان مرکز نگاہ' موضوع گفتگو بنی ہوئی تھی۔ رنم سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ یہ بڑھیا اپنی سادگی میں ہر بات جتاتی جارہی تھی۔

"ایبک اسکول کی تعمیر کب تک مکمل ہوگی؟" رنم نے ایبک کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔

"ہونہہ۔" وہ عدم توجہ سے بولا۔ رنم نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔ اتنے میں ذیان کا سیل فون بجنے لگا۔ وہ اس کے سامنے ٹیبل پہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اٹھایا۔ وہاب کی کال آرہی تھی۔ ایک دم اس کے چہرے کی رنگت بدلی اور اس نے کال منقطع کردی۔ وہ پھر کال کررہا تھا۔ ذیان نے سیل فون ہی آف کردیا۔ اس کی حالت بری ہورہی تھی۔ وہ بہانہ کرکے سب کے درمیان سے اٹھ آئی۔ اب ایبک کا فون بج رہا تھا۔ وہ معذرت کرکے کال سنتے باہر آگیا۔

"مسٹر ایبک آپ کی وائف نے تو سیل فون آف کردیا ہے۔ اس لیے آپ سے رابطہ کیا ہے۔"

اس کے پہلے جملے نے ہی ایبک کو جلتے توے پہ بٹھلا دیا۔ وہ اس کی بیوی کا ذکر کررہا تھا۔

"کون ہو تم اور کال کرنے کا مقصد؟" اس نے غصے پہ قابو پاکر معتدل انداز میں کہا۔

"میں وہاب ہوں۔ آپ کے دولت خانے پہ پہلے بھی حاضری دے چکا ہوں۔ یقین نہ آئے تو اپنی ساس سے پوچھ لیں۔" وہ جو کوئی بھی تھا اسے پریشانی میں ڈال چکا تھا۔

"اب کیا ہے یہ بتاؤ۔"

"میں آپ سے ملاقات کرکے کچھ حقائق آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے ٹائم دیں میں ملنے حاضر ہو جاؤں گا۔" وہ بہت مہذب انداز میں بات کررہا تھا۔

"او کے وہاب کل کسی بھی وقت آجاؤ۔" ایبک نے بات کرکے فون بند کردیا۔ حویلی سے جاتے وقت نینال نے بھی اس سے بات کی تھی اور کسی اجنبی نوجوان کی آمد کا ذکر کیا تھا۔ وہ گاؤں آیا تو مصروفیات میں اس غیر اہم بات کو بھول بھال گیا۔ ذیان کے سیل فون پہ اس کے سامنے ہی تو کال آئی تھی اس نے سنے بغیر رابطہ ہی منقطع کردیا تھا بعد میں بہانے سے اٹھ گئی تھی۔ جانے یہ وہاب نامی شخص کون تھا اور کون سے حقائق اس کے علم میں لانا چاہ رہا تھا۔ ذیان کو عنیزہ بچی کو وہ کیسے جانتا تھا۔

فون سننے کے بعد وہ دوبارہ بوا کے پاس آکر بیٹھا تو اس کا چہرا سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس کے تاثرات سے رنم کو اندازہ ہوا کہ وہاب نے منصوبے کے پہلے حصے پہ عمل کردیا ہے۔ کیونکہ ذیان بھی وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ بوا اس کی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھیں۔ رنم دل ہی دل میں استہزائیہ مسکرا رہی تھی۔ ذیان کی کہانی کا بہت جلدی دی اینڈ ہونے والا تھا۔ وہاب آہستہ آہستہ کامیابی کی طرف بڑھتا جارہا تھا۔ وہاب اس کے لیے امداد غیبی تھا ورنہ وہ کبھی بھی اپنے منصوبے پہ عمل نہ کرسکتی تھی۔ بوا رحمت جو ذیان کی تعریفیں کرکے رنم کا دل جلا رہی تھیں ان کا بھانڈا پھوٹنے والا تھا۔

✡ ✡ ✡

"ملک صاحب مجھے یہ آپ کے دوست کی بیٹی کچھ خاص پسند نہیں آئی ہے۔" ملک جہانگیر کے گرد لحاف درست کرتے ہوئے افشاں بیگم نروٹھے پن سے گویا ہوئیں۔

"کیوں کیا ہوا ملکانی! کیوں پسند نہیں آئی؟" ملک جہانگیر موڈ میں تھے اس لیے ان کی بات کا برا نہیں مانا۔

"جب سے آئی ہے ایبک کو لے کر نکل جاتی ہے

کبھی کہتی ہے مجھے گاؤں دکھاؤ تو کبھی اسکول۔ ہر وقت اس کے پاس بیٹھی رہتی ہے۔ ایک ایک بار بھی اس کے ساتھ زبان کو لے کر نہیں گیا۔"

"ارے اس کے دل میں انسانیت کا درد ہے غریبوں کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہے وہ تب ہی تو گاؤں آئی ہے۔" ملک جہانگیر رسان سے بولے۔

"آپ نہیں جانتے ملک صاحب میں نے جو دیکھا اور محسوس کیا ہے اس کی آنکھوں کا رنگ وہ نہیں ہے جو عام عورت کا ہوتا ہے۔ وہ ہمارے ایبک میں کچھ اور طرح کی دلچسپی لے رہی ہے۔ صرف ایک ملاقات میں ہی اتنی بے تکلف ہوئی کہ یہاں ہمارے گھر پہنچ گئی۔ ٹھیک ہے آپ کے دوست کی بیٹی ہے لیکن مجھے اس کے عادات و اطوار کچھ بھائے نہیں ہیں۔"

"ارے تمہارا وہم ہوگا' یہ کہ وہ ایبک میں خاص دلچسپی لے رہی ہے۔ وہ شادی شدہ بیوی والا ہے۔" ملک جہانگیر چنداں ان کی بات کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ افشاں بیگم غصے سے ان کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

"کرتی ہوں میں ایبک سے بات' چلتا کرے اسے یہاں سے۔ شہر میں انسانیت کا درد جگائے اپنے تنگ اور چھوٹے چھوٹے کپڑے پہن کر۔" افشاں بیگم نے پہلی نظر میں ہی رنم کو ناپسند کردیا تھا۔ اس کا جدید اسٹائلش پہناوا انہیں بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ وہ شکر کررہی تھیں کہ معاذ نے انکار کردیا تھا اور ایبک کی بار خود احمد سیال کی بیٹی باہر چلی گئی تھی۔ شکر ہے ان کے دونوں بیٹے بچ گئے تھے ورنہ ملک جہانگیر کو اپنے دوست کی بیٹی بہت پسند تھی۔

ملک جہانگیر کا خاندان روایات اور پرانی قدروں کی پاسداری کرنے والا خاندان تھا۔ نوجوان نسل جدید قدیم قدروں کا مرکب تھی انہیں کھلا ڈلا ماحول اور بے جا آزادی پسند نہیں تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ ان کے ہاں عورت کو کمتر یا بے زبان مخلوق سمجھا جاتا ہو۔ جائز حد میں ہر طرح کی آزادی دی گئی تھی مگر بے باکی کو پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ اور یہ بے باکی رنم میں بدرجہ اتم

موجود تھی۔

وہ بغیر دوپٹے کے سلیولیس ٹاپ میں ایبک کے ساتھ گھومتی پھرتی رات دیر تک اس کے پاس پاس بیٹھی رہتی۔ ان کے ہاں کی عورتیں ایسی نہیں تھیں۔ خود زیان شادی سے پہلے ایبک کے ساتھ لیے دیے رہتی۔ انہوں نے کبھی اسے ایبک کے ساتھ ہنستے بولتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ روایتی عورت کے نسوانی غرور سے مالا مال تھی۔ خود افشاں بیگم بھی ایسی تھیں اس لیے رنم انہیں ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہاب' ملک ایبک کے سامنے ان کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ اس کے پاس تکلیف دہ انکشافات کا خزانہ تھا۔

"زیان اور میں شروع سے ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جی رہے تھے ہم۔ امیر خالو کی مرضی سے ہمارا رشتہ طے ہوا۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ زیان کے گریجویشن کرلینے کے بعد ہماری شادی ہونی تھی۔ پر زرینہ خالہ کو کسی صورت ہماری خوشی منظور نہیں تھی۔ انہیں شروع سے ہی زیان سے چڑ تھی کیونکہ وہ ان کی سوکن کی بیٹی تھی۔ ساری عمر انہوں نے زیان سے نفرت کی۔ میری امی کو زیان پسند تھی۔ میں اسے اس نفرت بھرے ماحول سے نکالنا چاہتا تھا۔ بظاہر خالہ نے ہنسی خوشی سب قبول کرلیا تھا۔ امیر خالو کے مرتے ہی انہوں نے میری اور زیان کی شادی کرنے سے انکار کردیا۔ انہیں خوف تھا کہ اس شادی کی صورت میں زیان کو اس کے باپ کے ترکے میں حصہ دینا پڑے گا کیونکہ میں نے خالہ کو صاف صاف کہا تھا کہ میں زیان کے ساتھ مزید کوئی ناانصافی برداشت نہیں کروں گا۔

خالہ نے سازش تیار کی اور خالو کا گھر بیچ کر غائب ہوگئیں۔ خود انہوں نے زیان کو زبردستی یہاں پہنچادیا۔ میری محبت کو قتل کردیا۔ مجھے کچھ دن قبل ہی اطلاع ملی کہ میری محبت تو کسی اور کی زوجیت میں ہے۔ وہ اپنی خوشی سے اپنی مرضی سے یہاں نہیں آئی ہے' ظالم دنیا نے ہمیں ایک دوسرے سے الگ کردیا ہے۔ زیان کچھ دن اور وہاں رک جاتی تو ہم کورٹ میرج کرکے اب تک ایک ہوجاتے۔ وہ میری محبت ہے۔ میں کتنی مشکلات سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ میرے لیے خوشی کا پہلو یہ ہے کہ زیان نے میری محبت کو اب تک سینے سے لگا کر رکھا ہوا ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے اپنی محبت' اپنا وجود اب تک کسی کو نہیں سونپا ہے۔ میں اس اعتماد کے سہارے یہاں تک پہنچا ہوں۔

آپ میرے ساتھ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ چاہیں تو مجھے دھکے دے کر نامراد کرکے ذلیل و خوار کرکے یہاں سے نکال دیں' چاہیں تو میری محبت میری جھولی میں ڈال کر مجھے بامراد کردیں' سب آپ پہ ہے ملک ایبک۔" وہ بات کے اختتام پہ اچانک اس کے پاؤں پہ جھک گیا۔ اور اس کے دونوں پاؤں پکڑ لیے۔ ملک ایبک بھونچکا ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بمشکل اپنے پاؤں اسے چھڑائے۔ وہاب کی اداکاری بے حد غضب کی اور جان دار تھی۔ دھڑ دھڑ ساتوں آسمان اس کے سر پر گرے تھے۔ اپنی گفتگو میں وہاب نے جس طرف اشارہ کیا تھا ملک ایبک بخوبی اس کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔

زیان نے پہلی رات ہی آتم توش والا ڈرامہ کرکے ایبک کو خود سے دور رہنے پر مجبور کردیا تھا۔ شادی سے پہلے ہی وہ اس سے کتراتی اور گریزپا رہتی۔ جیسے یہ شادی اس کی مرضی کے بغیر زبردستی ہورہی ہے۔ گویا اس کا چپ چپ رہنا' گریزپائی کس کے قریب نہ ہونا سب کچھ وہاب کی محبت کی وجہ سے تھا۔ اسے وہاب سے ملنے سے پہلے اس بات کا علم نہیں تھا کہ زیان کن حالات میں ملک محل تک پہنچی ہے۔ گویا اس کی سوتیلی ماں نے اسے اور وہاب کو دور کرنے کے لیے یہاں بھیجا تھا۔

جب وہ شادی کا کارڈ دینے کے لیے شہر امیر علی کے گھر گئے تو ان کی بیوہ وہ گھر چھوڑ کر کسی نامعلوم مقام پہ

رہائش اختیار کر چکی تھیں گویا وہاب اپنی بات میں سچا تھا۔ ذیان کے اور اس کے مابین کیسے تعلقات ہیں اس کا علم ان دونوں کے سوا صرف اللہ کو تھا مگر وہاب بھی ان کے تعلقات کی ذاتی نوعیت سے آگاہ تھا ظاہر ہے اسے بتانے والی ذیان تھی۔ اس کی بیوی۔ اس کے ماں باپ کی من چاہی لاڈلی بہو۔ من میں کسی اور کی چاہت کے دیپ جلائے دلہن بن کر ایبک کے گھر میں آئی تھی۔ جس طرح وہاب نے اسے ایک ایک بات سے آگاہ کر دیا تھا ایسے ذیان اسے بتا دیتی تو وہ کبھی بھی اس کے ساتھ شادی نہ کرتا۔ وہاب اپنی محبت اور جذبوں میں سچا تھا تب ہی تو اس کے پاؤں میں جھک گیا تھا۔ اس کے آنسو مگرمچھ کے تو نہیں تھے۔ اس کا دل دکھا تھا اس کی محبت چھن گئی تھی اس کے ارمانوں کا خون ہوا تھا۔ اس لیے وہ مرد ہو کر بھی رو رہا تھا۔

دکھ، اذیت و کرب کیا ہوتا ہے کوئی اس وقت ایبک سے پوچھتا۔ وہاب کا ایک ایک جملہ اس کے ذہن پہ ہتھوڑے برسا رہا تھا ایسے لگ رہا تھا اس کا وجود روح میں ڈھل گیا ہو اور اس کی روح کو کانٹوں پہ گھسیٹا جا رہا ہو۔ وہ اپنے ہمزاد کو مجسم اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھ سکتا تھا۔ اس کا ہمزاد تکلیف میں تھا شدید تکلیف میں۔ وہ تکلیف میں بھی ہنس رہا تھا ایبک پہ۔ ایبک اس سے چھپ رہا تھا چرا چھپا رہا تھا۔ وہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

"ملک ایبک تم نے کتنا بڑا دھوکا کھایا ہے۔ تم اس لڑکی کو دلہن بنا کر لائے ہو جو کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ اور تم بھی تو اسے پسند کرتے ہو محبت کرتے ہو جو وہاب کو چاہتی ہے۔" وہ اسے آئینہ دکھا رہا تھا۔

ملک ایبک کے چہرے پہ اذیت رقم تھی۔ وہ کوشش کے باوجود بھی وہاب سے ایک لفظ بھی نہ کہہ پایا تھا۔ اس نے جواب میں وہاب سے اتنا بھی نہیں کہا کہ جو اتنے بڑے بڑے دعوے کر رہے ہو تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت بھی ہے کہ نہیں۔ وہاب اس کی مسلسل خاموشی سے اپنے من پسند نتائج اخذ کر چکا تھا۔

"آپ بس مجھ پہ ایک احسان اور کرنا۔" وہاب نے التجائیہ انداز میں ایبک کی سمت دیکھا۔ ایبک نے شکست خوردہ آنکھیں اس پہ جما دیں۔

"میری آمد کی اطلاع کسی کو نہیں ہونی چاہیے۔"

"کیوں" ایبک پہلی بار بولا۔

"ذیان پاگل ہے۔ ایسا نہ ہو کچھ الٹا سیدھا کر بیٹھے۔" وہاب کی طرف سے عجیب جواب موصول ہوا۔ مرد کبھی عورت پہ کھل کر اعتبار نہیں کرتا خاص طور پر اس عورت پہ جو اس کی بیوی بھی ہو۔ اپنی شریک حیات کے بارے میں چھوٹی سی ذرا سی بات اسے بدگمان کر سکتی ہے چاہے لمحہ بھر کے لیے ہی سہی وہ برگشتہ ضرور ہوتا ہے۔ تصدیق اور تحقیق کی ضرورت تو بعد میں پڑتی ہے پہلا مرحلہ شک اور بدگمانی سے بچنے کا ہوتا ہے اور وہ عورت خوش قسمت ہوتی ہے جس کا شوہر اس کی طرف سے لمحہ بھر کی بدگمانی کا بھی شکار نہ ہو۔

ایبک ذیان سے محبت کرتا تھا۔ اسے نکاح کے بندھن میں باندھنے کے بعد ایبک نے بہت سے خواب بھی آنکھوں میں سجا لیے تھے۔ اور وہاب ان خوابوں کو کرچی کرچی کرنے چلا آیا تھا۔ آتم توش والا قصہ کھلنے کے بعد ایبک ذیان کو سنبھلنے کا اپنی محبت کو پہچاننے کا موقع اور وقت دے رہا تھا، تاکہ وہ اس کے جذبوں کی سچائی سے واقف ہو کر خود اپنی محبت کا اقرار کرے اور اس کے بعد اس میں تبدیلی کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ اس کی خاموشی ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے ملک محل کو اپنا گھر تسلیم کر لیا تھا۔

بابا جان اور امی اس سے خوش تھے خاص طور پہ بابا جان اسے بہت پیار کرتے تھے تو افشاں بیگم واری صدقے جاتیں، رہ گیا معاذ تو وہ ذیان کا دوست تھا۔ ذیان نے سب سچائیوں کو تسلیم کر لیا تھا۔ ماضی کی تلخیوں اور کڑواہٹ کو فراموش کر کے وہ حال میں جینا شروع کر چکی تھی۔ ایبک صرف اس کی انا کی شکست کا انتظار کر رہا تھا کیوں کہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ ذیان کو اس کا رویہ ہرٹ کرنے لگا ہے۔ وہ اسے شکوہ کناں نگاہوں

سے دیکھتی ہے بولتی کچھ نہیں ہے۔ صرف ایک بار اسے بول دے کہ "ایبک میں تمہاری محبت پہ ایمان لے آئی ہوں۔" ایبک کو محسوس ہو رہا تھا اس کا انتظار زیادہ طول نہیں پکڑے گا زیان کی توانائی اور حوصلہ کمزور پڑتا جا رہا تھا جہاں وہ تھک کر گر پڑتی ایبک اسے اٹھا کر سینے میں چھپا لیتا۔ اس کا انتظار جوں کا توں تھا کہ اب وہاب اس کی جنت کو دوزخ بنانے چلا آیا تھا۔

وہ اس کی جنت میں آگ لگانے آیا تھا اور اپنا کام مکمل کر کے گیا۔ ملک ایبک کسی کو بتائے بغیر شہر آ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کی شکست خوردگی کا تماشا دیکھے اسے اپنے آپ کو خود ہی سنبھالنا تھا حوصلہ دینا تھا اپنے آنسو خود صاف کرنے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ہاہاہا زیان میں ہار کر بھی جیت گیا ہوں۔ تم یہاں آ کر یہ سمجھتی تھیں کہ مجھ سے محفوظ ہو گئی ہو۔ یہ تمہاری بھول تھی۔ اب تم ایبک کی طرف سے طلاق نامے کا انتظار کرو۔" وہ فون پہ بات کرتے ہوئے اونچی آواز میں قہقہے لگا رہا تھا۔

"بکواس بند کرو اپنی۔ ایبک محبت کرتے ہیں مجھ سے۔ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔" وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ایسا بہت جلد ہونے والا ہے اور جب تمہیں طلاق مل جائے تو سیدھی میرے پاس چلی آنا میرے دل کے دروازے کھلے ہیں تمہارے لیے۔ ویسے میں ملک ایبک کے پاس آیا تھا تمہارے ڈرائنگ روم میں تمہارے شوہر کی میزبانی سے مستفید ہو کر گیا ہوں۔" وہ اسے ترنگ میں آ کر بتا رہا تھا۔

"وہاب تم نے یہ سب اچھا نہیں کیا ہے۔ ایبک سمیت کوئی بھی تمہاری بات کا اعتبار نہیں کرے گا۔ تم جھوٹ بولتے ہو بکواس کرتے ہو۔" وہ مسلسل اسے جھٹلا رہی تھی۔

"میرا تو فائدہ ہی فائدہ ہے ایک طرف سے پیسے ملے ہیں تو دوسری طرف سے تم ملی ہو۔ ہاہاہا۔" کامیابی کے نشے میں سرشار وہاب نے ایک اور اہم بات کا انکشاف کیا۔

"کس نے دیے ہیں پیسے تمہیں؟" وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

"اسی نے جو آج کل ایبک کے پیچھے پاگل ہے۔" وہ اسی انداز میں بولا تو زیان کے ذہن میں تارے کی مانند ایک نام چمکا۔ زیان کی طرف سے مسلسل خاموشی پہ وہاب کو محسوس ہوا جیسے اس نے بہت بڑی غلطی کر دی ہے۔ زیان فون بند کر چکی تھی۔ اب وہ ریسیو کرنے والی نہیں تھی۔

زیان نے اسی ٹائم معاذ سے رابطہ کیا۔ معاذ ہمیشہ اسے اچھے مشورے دیتا تھا۔ بیل جا رہی تھی پر وہ فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ زیان نے مایوسی سے ہاتھ میں پکڑے سیل فون کو دیکھا۔ وہ ایک بار پھر معاذ کا نمبر ڈائل کرنے جا رہی تھی کہ اچانک اس سے فون گیلری کھل گئی۔ اس میں وہاب کی اس کال کی ریکارڈنگ موجود تھی جو وہاب نے اسے ابھی ابھی کی تھی۔ وہاب کی یہ کال اس نے کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ریکارڈ نہیں کی تھی بس اتفاقاً" اس نے کر لی تھی۔ اب وہ یہ ریکارڈنگ معاذ کو سنوانا چاہ رہی تھی۔ پر وہ کال ہی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ زیان نے غیر ارادی طور پہ ملک ایبک کو کال کی پر اس نے بھی ریسیو نہیں کی۔

☼ ☼ ☼

معاذ اسکائپ پہ آن لائن تھا اس نے زیان کی کال کی جانے والی ریکارڈنگ سن لی تھی۔ حقیقی معنوں میں آج وہ پریشان ہوا تھا۔ وہاب نے جب اسے پہلی بار کال کی تھی تو تب ہی سے زیان نے اسے شریک راز کر لیا تھا۔ وہ اس کی گزشتہ زندگی سے واقف تھا۔

"بھابھی' بھائی کہاں ہیں؟" اس نے پریشانی چھپاتے ہوئے دریافت کیا۔

"وہ کل بتائے بغیر اچانک شہر چلے گئے ہیں۔ میں نے کال کی وہ بھی نہیں اٹھائی۔"

"آپ اب انہیں کال مت کرنا اور وہاب کی کوئی

کال آئے تو اسے بھی ریکارڈ کر لیتا' لیکن اسے احساس نہ ہونے پائے اور آپ رنم سیال کی طرف سے محتاط رہیں۔

آپ ایسا کریں جا کر ارسلان چچا کو یہ سب بتا دیں۔ فون ریکارڈنگ بھی سنوا دیں' اور میرے ساتھ رابطے میں رہیں۔" وہ جلدی جلدی بول رہا تھا۔ زیان ہر بات پہ سعادت مندی سے سر ہلا رہی تھی۔ معاذ خود بے حد پریشان تھا' مگر زیان کے سامنے نارمل پوز کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ترک محبت کر بیٹھے ہم ضبط محبت اور بھی ہے
ایک قیامت بیت چکی ہے ایک قیامت اور بھی ہے
ہم نے اس کے درد سے اپنے سانس کا رشتہ جوڑ لیا
ورنہ شہر میں زندہ رہنے کی ایک صورت اور بھی ہے
ڈوبتا سورج دیکھ کر خوش ہو رہنا کس کو راس آیا ہے
دن کا دکھ سہ جانے والو رات کی وحشت اور بھی ہے
میری بھیگی پلکوں پہ جب اس نے دونوں ہاتھ رکھے
پھر یہ بھید کھلا ان اشکوں کی قیمت اور بھی ہے
اسے گنوا کے محسن اس کے درد کا قرض چکانا ہے
ایک اذیت ماند پڑی ہے ایک اذیت اور بھی ہے

دوسرے دن کا سورج بھی ڈھل چکا تھا۔ ایبک کمرا بند کیے پڑا تھا۔ اس کا سیل فون بج بج کر خاموش ہو چکا تھا۔ وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا کہ کسی سے بات کرے۔ اس نے سیل فون لے کر کال ریکارڈ چیک کیا۔ سب سے آخری کال زیان کی تھی اور دو دن میں اس کی یہ واحد کال تھی۔ باقی ایک سو بیس کالز رنم سیال کی تھیں۔ اس کا ان باکس رنم کے پیغامات سے بھرا ہوا تھا۔

"ایبک آپ میری کال ریسیو کیوں نہیں کر رہے ہو۔ پلیز مجھے اپنی خیریت بتا دو۔ میں بہت پریشان ہوں۔" رنم سیال کی طرف سے ملنے والا یہ میسج چند منٹ پہلے کا تھا۔ پھر رنم سیال کالنگ کے الفاظ جگمگائے تو اس نے غیر ارادی طور پہ کال ریسیو کر لی۔ لاشعوری طور پہ وہ اپنا درد بانٹنا چاہ رہا تھا۔ رنم تو جیسے درد کا درماں بن کر آئی تھی۔ ایبک سب کچھ بتاتا جا رہا تھا۔ رنم سیال یہی تو چاہتی تھی کہ وہ بولے اور خوب کھل کر بولے۔ جب وہ دل کی بھڑاس نکال لے پھر رنم سیال اس کے دکھتے دل پہ اپنی ہمدردی کے پھاہے رکھے۔ اسے احساس دلائے کہ وہ اس کے لیے بہت اہم ہے۔ وہ پھر کھل کر جذبات کا اظہار کرے۔

"ایبک انسان زندگی میں شادی ایک بار کرتا ہے اور یہ کام اسے سوچ کر دیکھ بھال کر کرنا چاہیے۔ ورنہ آپ کی طرح انسان ہاتھ ملتا ہے۔ آپ کے رشتے کی ایتار ملیٹی میں نے چند دن میں ہی فیل کر لی ہے اور آپ خود اس چھوٹی سی بات کو بھی نہ سمجھ سکے کہ زیان کے دل میں آپ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

اس نے مارے باندھے شادی تو کر لی ہے' مگر تمام عمر اس رشتے کو تسلیم نہیں کرے گی اس کے دل میں آپ سے پہلے ہی کوئی اور بستا ہے وہ اسے دل سے کبھی نہیں نکالے گی۔ یعنی دوہری زندگی گزارتی رہے گی۔"

رنم سیال کی باتیں بجائے اسے تسلی دینے کے اور بھی پریشان کر رہی تھیں' لیکن یہ بات تو طے شدہ تھی کہ وہ اس کے اس طرح یہاں آنے پر پریشان تھی۔ ڈھیروں مسڈ کالز اس کا ثبوت تھیں جبکہ زیان نے صرف ایک کال کی تھی ان باکس میں کوئی پیغام نہیں تھا اس کا۔

"مجھے گھر جا کر زیان سے اس معاملے پہ بات کرنی چاہیے۔ میں یہاں کیا اکیلا اپنی ہی آگ میں جل رہا ہوں۔ مجھے بات کرنی چاہیے سب صاف کرنا چاہیے۔" عقل نے اسے راستہ دکھایا تھا۔ اس نے اٹھ کر کپڑے تبدیل کیے اور تیار ہو کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے مطلوبہ وقت سے آدھے گھنٹے پہلے ہی حویلی پہنچ گیا تھا۔ صد شکر کہ کسی سے اس کا سامنا نہیں ہوا ورنہ اس کا چہرہ بہت کچھ بتانے کے لیے کافی تھا۔ وہ زیان کو ڈھونڈتا سٹنگ روم میں آیا۔ وہاں زیان تو نہیں البتہ رنم سیال بیٹھی کسی سے فون پہ بات کر رہی تھی۔

"ایبک آپ آ گئے تھینکس گاڈ۔ میں بہت اپ

سیٹ رہی ہوں۔ مجھے انفارم تو کردیتے۔" اس نے ایک کو دیکھ کر فون بند کردیا تھا۔ اس کے لہجے میں بے پناہ اپنائیت تھی۔

"مجھے اچانک جانا پڑ گیا تھا۔" اس نے سرسری انداز میں وضاحت کی۔

"مجھے پتا ہے آپ بہت اپ سیٹ ہو، لیکن ڈونٹ وری۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم اکیلے نہیں ہو۔" بلا کی بے تکلفی تھی اس کے لہجے میں۔ ایک آپ سے تم ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی پریشانی میں رغم کی بے تکلفی نظرانداز کردی تھی۔

"میں جارہا ہوں بیڈ روم میں، آپ انجوائے کریں امی جان کے پاس بیٹھیں۔" ایک لمبے لمبے ڈگ بھرتا اوپر آگیا۔

زیان بیڈ روم میں موجود تھی۔ ایک اچانک کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ کوئی نہ کوئی طوفان آنے والا ہے۔ وہ بے پناہ سنجیدہ لگ رہا تھا۔

"زیان بیٹھو مجھے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی بیٹھ گیا۔ اس نے خود کو پرسکون کرنے کے لیے پانی پیا اور بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ زیان سمجھ گئی تھی کہ اس نے کیا بات کرنی ہے۔

"مجھے معلوم ہے میرا آپ کے ساتھ شادی کا فیصلہ غلط ہے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ رشتہ طے کرتے وقت آپ کی مرضی معلوم نہیں کی گئی یہ بڑی غلطی تھی، مگر نہ جانے رشتہ ہونے سے لے کر شادی کے درمیانی عرصے تک میں یہی سمجھتا رہا کہ آپ مجھے پسند کرتی ہیں۔ ورنہ پہلے میں نے سوچ رکھا تھا آپ کو سوچنے کا ٹائم دوں گا شادی لیٹ کروں گا تاکہ آپ ذہنی اور جذباتی طور پہ آمادہ ہوجائیں، لیکن وہ میری غلطی تھی، میں مانتا ہوں اور شادی کے دن ہی میں نے آپ کا رویہ محسوس کرلیا تھا۔ میں آپ کے کہے بغیر جان گیا آپ کو کم سے کم مجھے تو بتانا چاہیے تھا کہ شادی میں آپ کی رضامندی شامل نہیں ہے۔

آپ کسی اور کے ساتھ وابستہ رہیں کچھ دن پہلے تک ہرگز مجھے علم نہیں تھا۔ آپ صرف ایک بار مجھے بتا دیتیں تو میں آپ کو، آپ کے گھر واپس بھجوا دیتا، لیکن ابھی بھی دیر نہیں ہوئی ہے وہاب آپ کا انتظار کررہا ہے۔" زیان بڑے تحمل سے اس کی ایک ایک بات، ایک ایک لفظ، ایک ایک فقرہ سن رہی تھی آخر میں اسے رہا نہیں گیا وہ بول ہی پڑی۔

"آپ میرے مستقبل کا فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں اور میں اپنے گھر میں ہی ہوں۔ مجھے اور کہیں نہیں جانا۔ مجھے کیا کرنا ہے، میں جانتی ہوں میں کوئی مٹی کا کھلونا نہیں ہوں جسے آپ اپنی مرضی کا روپ دینے پہ تل گئے ہیں۔ میری ایک اپنی شخصیت ہے، اپنا نام ہے، میں اپنے فیصلے خود کرتی ہوں۔ کون میرا انتظار کررہا ہے، کون نہیں، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ مجھے اپنی ذات سے غرض ہے بس۔ باقی دنیا کا ٹھیکا میرے ذمے نہیں ہے۔" وہ بری طرح بپھری ہوئی تھی۔ ایک جو یہ سوچ کر آیا تھا کہ وہاں روتی دھوتی، صفائیاں دیتی زیان ملے گی اس کی جگہ آگ بگولا بنی حسینہ سے ملاقات ہوئی تھی، وہ بھی حسینہ ایٹم بم سے۔

"میں تمہارے اور وہاب کے راستے سے ہٹ جاؤں گا۔"

"بڑی خوشی سے۔ لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ میں کسی وہاب کو نہیں جانتی۔ ایک وہاب تھا روبینہ آنٹی کا بیٹا، لیکن مجھے کبھی بھی اس سے دلچسپی نہیں رہی اور نہ ہے۔ آپ چاہیں تو بوا اور زرینہ آنٹی سے تصدیق کرسکتے ہیں وہ آپ کو سب کچھ بتائیں گی، لیکن خدارا مجھے میری نظروں میں مت گرائیں، میں نے صاف ستھری لائف گزاری ہے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔ سر اٹھا کر۔

اور میرا یہ اٹھا سر کوئی نہیں جھکا سکتا ایک چھوڑ دس وہاب آجائیں۔ آپ کو ہیرو بننے کا شوق ہے تو شوق سے فضول قربانیاں دیں، لیکن مجھے کسی کے ساتھ انوالومت کریں۔" زیان کا غصہ بولتے بولتے کافی کم ہوگیا تھا۔

ایبک نے مکمل توجہ کے ساتھ اسے گرجتے برستے دیکھا۔ یہ انداز محبت میں چوٹ کھائی ہوئی زبردستی شادی کی جانے والی لڑکی کا تو نہیں تھا۔ یہ تو اپنی انا اور عزت نفس کو بچانے والی عزیز رکھنے والی کا تھا۔ جس کے لیے اس کا پندار اور نسوانی غرور سب سے بڑھ کر تھا۔ اس کے بعد ایبک کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔

☆ ☆ ☆

زیان نے آنا" فانا" بوا کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی ایک ہی رٹ تھی مجھے کچھ دن کے لیے بوا کے ساتھ جانا ہے۔ عنیزہ اسے بوا کے ساتھ بھیجنے کے حق میں نہیں تھیں۔ پہلے ہی وہ اس گھر سے بہت دکھ اٹھا چکی تھی۔ عنیزہ وہاب کی طرف سے بھی ڈری ہوئی تھیں اور سب سے بڑھ کر بوا اسے ساتھ نہیں لے جانا چاہ رہی تھیں۔

"تم اب شادی شدہ شوہر والی ہو۔ اپنے گھر میں رہو ہنسی خوشی۔" انہوں نے رسان سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"بوا میں تو صرف کچھ دن کے لیے آپ کے ساتھ جا کر رہنا چاہ رہی تھی۔" وہ روٹھے پن سے گویا ہوئی۔

"بوا کو بہت جلدی ہم یہاں لے آئیں گے کیوں بوا؟" عنیزہ نے تائید چاہنے والے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

"میں چھوٹی دلہن کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی نا اور زیان بھی بہت پیاری ہے مجھے۔ میں مہینے دو مہینے میں ملنے آجایا کروں گی۔ ناراض مت ہونا۔" زیان کو بوا کی وفاداری پہ پیار آگیا کون کسی کے ساتھ اتنا مخلص ہو سکتا تھا جتنی بوا ان کے خاندان کے ساتھ تھیں۔

"ٹھیک ہے بوا جیسی آپ کی خوشی۔ ورنہ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ رہیں اور باقی زندگی آرام سے گزاریں؟"

"میں بہت خوش باش ہوں وہاں سب کے ساتھ۔" بوا نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔

"بوا میں کچھ دن کے بعد آؤں گی آپ سے ملنے۔"

"ہاں اپنے شوہر کے ساتھ آنا۔" جاتے جاتے انہوں نے پھر نصیحت کی تو زیان بے بس سی ہنس دی۔

☆ ☆ ☆

زیان نے براہ راست ملک جہانگیر سے بات کی۔ وہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا چاہ رہی تھی۔ داخلے کی آخری تاریخ میں چند روز ہی باقی تھے۔ ملک جہانگیر نے اسے بخوشی اجازت دے دی تھی، لیکن افشاں بیگم کو دال میں کچھ کالا لگ رہا تھا۔ ایبک شہر میں تھا۔ رنم بھی اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔ وہ دعا کر رہی تھیں کہ اب وہ ان کے گھر میں واپس نہ آئے، لیکن حیرت انگیز طور پہ خلاف توقع وہ ایبک کے ساتھ تیسرے دن ہی لوٹ آئی۔ وہ سارا سارا دن ایبک کے ساتھ مصروف رہتی۔ وہ یہاں ایک چھوٹا سا اسپتال بنوانا چاہ رہی تھی۔ ملک ایبک نے اسپتال کے لیے اسے مفت زمین اپنے پاس سے دی تھی۔ اب وہ دونوں دن رات اسی میں لگے ہوئے تھے جبکہ زیان یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے پہ تل گئی تھی۔ ملک ارسلان ایڈمیشن فارم لے کر جمع بھی کروا آئے تھے کیوں کہ ایبک ان دنوں بہت مصروف تھا۔

ایبک کو تو زیان کی سرگرمیوں کی فکر ہی نہیں تھی۔ ادھر وہاب نے بھی کچھ دنوں سے چپ سادھ رکھی تھی۔ اس نے رنم کو یہ نہیں بتایا تھا کہ ترنگ میں اس نے زیان کے سامنے کیا کچھ اگل دیا ہے ورنہ اپنے وعدے کے مطابق وہ باقی پیسے اسے ہرگز نہ دیتی۔ جب ایبک طلاق نامہ سائن کر کے زیان کے حوالے کر دیتا تو رنم اسے باقی پیسے بھی دے دیتی۔ وہاب اس کی جذباتی کمزوری سے خوب فائدہ اٹھا رہا تھا، لیکن وہ اب چڑنے لگی تھی۔ وہاب کے ساتھ ملک ایبک کی ملاقات کو اتنے دن ہو گئے تھے، لیکن ابھی تک اس ملاقات کے ویسے نتائج سامنے نہیں آئے تھے جیسے وہ توقع کر رہی تھی۔

اس نے اسپتال کا نقشہ بھی منظور کروالیا تھا۔ ایک کے ساتھ باہر دھوپ میں گھوم گھوم کر اس کی سرخ و سفید رنگت جھلسنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کے شوق میں وہ اس کے ساتھ گھنٹوں دھوپ میں جلتی۔ وہ روز اسکول کی تعمیر کا جائزہ لینے آتا۔ ٹھیکے دار اور مستریوں کے ساتھ مغز ماری کرتا پھر وہ انڈسٹریل ہوم کا بھی چکر لگاتا۔ کبھی تعمیراتی سامان آرہا ہے تو وہ بھاگ بھاگ کر ادھر جارہا ہے۔ کوئی چیز کم پڑ گئی ہے تو وہ بھی اس کی دردسری۔

رنم سیال تو مرجھا کر رہ گئی تھی۔ اس تگ و دو کا پھل یا صلہ اسے ابھی تک ملا نہیں تھا۔ کیوں کہ وہ ایبک تک نہ تو حال دل پہنچاپائی تھی اور نہ ہی اس کے منصوبے کے مطابق اس نے زیان کو طلاق دی تھی اگرچہ دونوں میں تعلقات سردمہری کا شکار تھے۔ کیوں کہ ایبک کے منہ سے کوئی نہ کوئی ایسی بات اس کے سوال کے جواب میں منہ سے نکل ہی جاتی تھی جس سے وہ واقف ہونے کے چکر میں مری جاتی۔ وہ بس اس کے ساتھ ہوتا تو ہر ٹائم اپنے پراجیکٹس کی باتیں کرتا۔ جیتی جاگتی رنم گویا اسے نظر ہی نہ آتی۔

☆ ☆ ☆

اب ہم نے کسی سے کچھ نہیں کہنا ہے
بھلے ہمیں زخم لگ جائے
بھلے وہ عمر بھر سِل نہیں پائے
ہمیں خاموش رہنا ہے
اب ہمیں کسی سے کچھ نہیں کہنا ہے
ہم نے رو کے دیکھا ہے
ہم نے شور مچا کے دیکھا ہے
اپنے زخم دکھا کے دیکھا ہے
پر ہوا کچھ نہیں حاصل
اب ہمیں کسی سے کچھ نہیں کہنا ہے
تمہیں گر یاد ہو تو
ہم نے تمہیں قصہ سنایا تھا
اپنا درد بتایا تھا
تم ہی تو بس
عمر کے کرب کے مداوا بنے تھے
جلتے زخموں کی دوا بنے تھے
اور پھر!!!
ذرا جو وقت گزرا تو
زمانے کے چلن میں ڈھل گئے تم بھی
وقت کے ساتھ بدل گئے تم بھی
تمہیں تو بہت
زمانہ شناسی کا دعوا ہے
پھر کیوں نہ پہچان پائے تم
ہمیں کیوں نہ جان پائے تم
اب ہمیں تم سے کچھ نہیں کہنا ہے
ہمیں خاموش رہنا ہے
سب آنسو پی کے
سب زخم سی کے

زیان کا ایڈمیشن ہوگیا تھا۔ اس کی رہائش یونیورسٹی ہوسٹل میں ہی تھی زیان جارہی تھی۔ افشاں بیگم بری طرح تپی ہوئی تھیں۔ وہ دندناتی ہوئی غصے میں عنزہ کے پاس آئیں۔ انہوں نے غالباً" پہلی بار افشاں بھابھی کو اس طرح غصے میں دیکھا تھا۔

"بھابھی کیا بات ہے کیا ہوا ہے؟" انہوں نے ہولتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

"ہونا کیا ہے میرے بیٹے کو سوشل ورک سے فرصت نہیں اور زیان گھر سے ہی جارہی ہے۔ کسی کو کوئی فکر ہی نہیں ہے سب آنکھیں بند کرکے بیٹھے ہیں اور وہ جو موئی رنم میرے گھر میں ڈیرا ڈال کر بیٹھ گئی ہے کوئی پروا نہیں کسی کو۔ ارے میرا گھر اجڑ رہا ہے۔"

"اللہ نہ کرے بھابھی کہ آپ کا گھر اجڑے۔ آپ بیٹھیں میں پانی دیتی ہوں آپ کو۔" عنزہ نے ہاتھ کا دباؤ ڈال کر انہیں پاس پڑے صوفے پہ بٹھادیا۔ پانی پی کر ان کے حواس تھوڑے بحال ہوئے۔

"جب سے رنم یہاں آئی ہے میرے گھر کا سکون غارت ہوگیا ہے۔ ملک صاحب سے کچھ کہتی ہوں تو وہ

میری بات کو مذاق میں اڑا دیتے ہیں۔ ایبک سارا دن اس پر کٹی لومڑی کے ساتھ غائب رہتا ہے اور زیان اسے پوچھتی ہی نہیں۔" پر کٹی لومڑی کی اصطلاح پہ عنیزہ کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

"وہ اس کے لیے میدان کھلا چھوڑ کر خود بھاگ رہی ہے یونیورسٹی۔ آجائے معاذ اس سے بات کرتی ہوں۔ وہی میرا دکھ سمجھتا ہے۔ باقی سب اندھے گونگے اور بہرے بنے ہوئے ہیں۔" افشاں بیگم ایک بار پھر اشتعال میں آرہی تھیں۔

"بھابھی زیان اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہے باقی باتیں پریشان کن ہیں۔ آپ ایبک سے خود بات کریں یا میں ارسلان صاحب سے کہوں گی۔" عنیزہ کو زیان نے یہی بتایا تھا کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہے۔ باقی اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ عنیزہ نے اسی حوالے سے بات کی تھی۔ باقی قصے کا انہیں علم ہی نہیں تھا۔ افشاں بیگم جوں جوں بتاتی جارہی تھیں توں توں ان کی فکر بڑھتی جارہی تھی۔ زیان نے ان تمام باتوں کی انہیں ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔

انہوں نے اپنے تئیں فرض کرلیا تھا کہ وہاب والا قصہ بھی دفن ہوچکا ہے۔ زیان کس عذاب سے گزر رہی ہے اس کا احوال اس کے چہرے اور آنکھوں میں رقم نہیں تھا۔

"مجھے رنم سیال کو اپنے گھر سے دفعان کرنا ہے۔ نوکرانیاں تک اس کے کرتوت سے واقف ہوگئی ہیں آنکھوں آنکھوں میں میرے بچے کو کھانا چاہتی ہے۔" رنم سیال محویت سے ایبک کو تکتی تھی جسے افشاں بیگم نے آنکھوں آنکھوں میں کھانے سے تشبیہ دی تھی۔

"زیان سے کہو ایبک کو ڈھیلا مت چھوڑے۔" عنیزہ سر ہلا کر رہ گئیں۔

ساتھ والے روم میں موجود زیان ان دونوں کی گفتگو کا ایک ایک لفظ سن چکی تھی۔ ایبک کو تو بس اس پہ فرد جرم عائد کرنی تھی اس کے بعد اس کی بلا سے وہ جو چاہے کرتی پھرے۔ ملک ارسلان نے یونیورسٹی میں اس کا ایڈمیشن کروایا تھا۔

وہ تیاری مکمل کرکے گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ ادھر اس کی گاڑی گیٹ سے باہر نکلی۔ ادھر ایبک کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ ایبک اسے دیکھ چکا تھا۔ ایبک کے ساتھ بیٹھی رنم سیال کو بھی زیان نے جی بھر کر دیکھا تھا۔ کس استحقاق اور دھڑلے سے وہ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ زیان کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ اس نے چاہنے کے باوجود پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

ایبک کے ساتھ ایک گھر میں ایک چھت تلے رہتے ہوئے اس درد کو برداشت کرنا کتنا مشکل تھا جو آج کل وہ سہہ رہی تھی۔ رنم سیال کی نگاہیں والہانہ ایبک کا طواف کرتیں وہ صبح سے شام تک باہر اس کے ساتھ رہتی۔ گھر آکر بھی وہ ایبک کے ساتھ لگی رہتی۔ ادھر وہاب نے اسے طلاق کی خوش خبری سنائی تھی۔ معاذ اور وہ دونوں کسی نتیجے پہ پہنچنے کے انتظار میں تھے۔ آج کل معاذ کے ساتھ بھی اس کا رابطہ کم کم تھا۔

☼ ☼ ☼

گاڑی رکتے ہی ملک ایبک لمبے لمبے ڈگ بھرتا افشاں بیگم کی طرف آیا۔ اس نے زیان کو گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔ ایسے تو وہ کہیں بھی نہیں جاتی تھی ہمیشہ گھر کے افراد میں سے کوئی نہ کوئی اس کے ساتھ ہوتا۔

"امی جان زیان کہاں گئی ہیں؟" اس کے لہجہ میں بے قراری تھی۔

"بیوی تمہاری ہے وہ اور پوچھ مجھ سے رہے ہو۔ ویسے آج اس کا خیال کیسے آگیا ہے تمہیں۔ تم سوشل ورک کرو۔ انسانیت کے درد بانٹو اور وہ یونیورسٹی میں پڑھنے جائے۔" افشاں بیگم نے اپنی توپوں کا رخ سیدھے سیدھے اس کی طرف کیا تو وہ بوکھلا سا گیا۔

"اپنے گھر کی خبر لو۔ تمہیں ہوش ہو تب نا۔" اس کے پیچھے آتی رنم پہ انہوں نے ترچھی نگاہ ڈالی اور مڑ کر چلتی بنیں۔ ایبک بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ رنم سیال نے اس کے کندھے پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

"تمہاری وائف تمہیں بتائے بغیر چلی گئی۔ ویٹس امیزنگ۔ دس از ناٹ فیئر۔" اس کے لہجہ میں مصنوعی تاسف تھا جبکہ اندر سے اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ ایبک نے اپنے کندھے پہ رکھے اس کے ہاتھ کو ہٹا دیا۔ ایک ثانیے کے لیے وہ شرمندہ ہوئی پھر نارمل ہوگئی۔

"ایبک چلو شہر چلیں۔ کسی اچھے ریسٹورنٹ میں لنچ کریں گے۔ رات میں بھی پاپا کے پاس رکوں گی کل آجائیں گے۔"

"نہیں نہیں جاسکتا بزی ہوں۔" ایبک نے کنپٹی مسلتے ہوئے کہا۔ اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔

"اوکے تم ریسٹ کرو۔" اس نے فراخدلی سے کہا۔

☼ ☼ ☼

وہ ریسٹ کرنے کے لیے لیٹا تھا کہ شاید لحہ بہ لحہ بڑھتے سر درد سے نجات مل جائے' مگر درد اور سوچیں بڑھتی جارہی تھیں۔ زیان نے اسے بتائے بغیر یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا کم از کم وہ اسے بتاتی تو سہی۔ وہ خود اسے ساتھ لے جاتا ایڈمیشن کرواتا۔ وہ ضدی اور خود سر لڑکی اس کی مانتی کہاں تھی۔ اوپر سے امی جان نے بھی اس پہ چڑھائی کردی تھی۔ ایبک کو نیند ہی نہیں آرہی تھی۔ کچھ منٹ کے لیے اس کی آنکھ لگی تھی کہ باہر سے آتی تیز تیز آوازوں سے کھل گئی۔ وہ اٹھ کر ٹیرس کی طرف آیا اور نیچے آواز کے مرکز کی طرف دیکھا۔ وہاں معاذ موجود تھا حسب معمول شور مچاتا ہنستا مسکراتا۔ وہ امی جان اور بابا سے مل رہا تھا پاس ہی بیگز اور سوٹ کیس پڑے تھے وہ یقیناً ابھی ابھی آیا تھا۔ ایبک نیچے اتر آیا۔

"تم نے اپنے آنے کی اطلاع ہی نہیں دی میں خود ایئرپورٹ پہ ریسیو کرتا تمہیں۔" اس سے گلے ملتے ایبک نے شکوہ کیا۔

"سنا ہے لوگ آج کل اپنے مہمان کے ساتھ بہت بزی ہیں' اس لیے میں نے سوچا آپ کو اپنے مہمان کی ناز برداری میں مگن رہنے دوں۔" معاذ نے انتہائی لطیف انداز میں اس پہ چوٹ کی ایبک کچھ بول ہی نہ پایا۔ پہلے امی جان اور اب یہ معاذ۔۔۔ معاذ امی جان کو بازو کے گھیرے میں لیے آگے کی طرف جا رہا تھا جب اچانک ایک کمرے سے رنم برآمد ہوئی۔

معاذ افشاں بیگم کے کندھے پہ رکھا ہاتھ ہٹاتا بڑے پرجوش انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

"واؤ مس نینال۔ یہ آپ ہیں میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ آپ اتنی زیادہ چینج ہوگئی ہیں کمیض شلوار سے ٹاپ اور ٹراؤزر پہ آگئی ہیں۔ سبحان اللہ! کیا ترقی کی ہے آپ نے۔ دوپٹا بھی غائب کردیا ہے۔" رنم اس کے پے درپے جملوں سے بوکھلائی جارہی تھی۔

"معاذ یہ نینال نہیں' رنم سیال ہیں ابو کے دوست احمد انکل کی بیٹی۔" ایبک نے معاذ کو ٹوکتے ہوئے اس کا تعارف کروایا تو رنم کی جان میں جان آئی۔

"کیوں مذاق کر رہے ہیں آپ۔ یہ نینال ہیں مس نینال۔ لباس بدلنے سے شخصیت بدل نہیں جاتی۔"

پے درپے جملوں سے رنم کا اعتماد خوف بن کر ڈھے گیا تھا۔ نینال کہہ کر مخاطب کیے جانے پہ معاذ نے اس کا رکنا اور چونکنا واضح طور پہ محسوس کیا تھا۔ معاذ سے وہ ویسے بھی خائف رہتی تھی وہ رنگ میں بھنگ ڈالنے پھر آپہنچا تھا۔

ملک ایبک چھوٹے بھائی کو رنم سیال کے بارے میں بتا رہا تھا۔ معاذ کو دیکھ کر رنم کمرے میں جاچکی تھی۔ اس کا سامنا کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ مستقل طور پہ واپس آگیا تھا۔ رات کے کھانے کے لیے نوکرانی اسے بلانے آئی تو رنم نے بھوک نہ ہونے کا عذر کر کے دروازہ بند کرلیا۔

☼ ☼ ☼

معاذ کھانے کے بعد دیر تک ایبک کے پاس بیٹھا رہا۔ زیان نے یونیورسٹی میں ایبک کو بتائے بغیر ایڈمیشن لیا تھا اس کے اس اقدام سے معاذ کو اس کی بے وقوفی پہ تاؤ آیا تھا۔ معاذ زیان اور ایبک کی وجہ سے بغیر بتائے اچانک واپس آیا تھا۔ اس معاملے میں خود کو' جان کر

بھی مزید لاعلم رکھنا حماقت کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اس نے براہ راست بھائی سے اس موضوع پہ بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

معاذ نے سب سے پہلے اسے وہاب کی کال ریکارڈنگ سنوائی۔ سنتے سنتے ایبک کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔

"یہ تم تک کیسے پہنچی؟"

"زیان بھابھی کی مہربانی سے۔ اب آپ خود فیصلہ کریں کہ یہ کیا گورکھ دھندا ہے۔ میں بابا جان کے ساتھ احمد انکل کے گھر گیا تو وہاں ان کی بیٹی کے فوٹو گرافس دیکھ کر چونک گیا۔ ملک محل میں آ کر میں نے اشاروں سے جب نہناں سے کسی لڑکی کی مشابہت کا ذکر کیا تو وہ چونک گئی۔ میں نے بہت سے مواقع پہ اس کی گھبراہٹ نوٹ کی۔ میں نے اسے عنیزہ چچی اور ارسلان چچا کی باتیں چھپ چھپ کر سنتے دیکھا۔ زیان بھابھی کے لیے اس کی نفرت نوٹ کی۔ پھر اس کی پراسرار گمشدگی اور وہاب کا ٹپکنا۔ احمد انکل کی بیٹی کا حویلی میں نزول۔ ایک ہی سلسلے کی کڑیاں نہیں ہیں۔" وہ تائید چاہ رہا تھا۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔"

"بھائی جان کامن سینس کی بات ہے کوئی آپ کو اور بھابھی کو کیوں الگ کروانا چاہ رہا ہے۔ کس نے وہاب کو پیسے دیے ہیں وعدے پہ۔ نہناں اور رنم کا راز کیا ہے۔ اس سے کون پردہ اٹھا سکتا ہے' میں ان سب سوالوں کے جواب جان کر رہوں گا۔"

"تم کیا کرو گے؟"

"میں احمد انکل کے پاس جاؤں گا۔ ان سے پوچھوں گا اور آپ نے بھابھی کو کیوں جانے دیا۔ آپ ان کی طرف سے اتنے لاپروا ہو گئے ہیں۔" وہ پھر سے زیان کے ایڈیشن والے واقعے کی طرف آ گیا تھا۔

"معاذ وہاب نامی یہ شخص یہاں مجھ سے بھی ملنے آیا تھا۔ اس نے زیان کے ماضی کے حوالے سے بہت سی باتیں کیں۔ وقتی طور پہ میں تھوڑی دیر کے لیے منفی انداز میں سوچنے لگا تھا' لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں نے کوئی منفی قدم نہیں اٹھایا۔"

"بھائی جان ہر رشتہ اعتبار مانگتا ہے۔ جب اعتماد اور اعتبار دم توڑ جائے تو رشتہ بھی دم توڑ جاتا ہے۔ انسان دل میں ہی رشتوں کا قبرستان بنا لیتا ہے۔ زیان بھابھی نے اپنے فادر کے گھر سوتیلی ماں کے ساتھ بہت مشکل میں زندگی گزاری ہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور خواہشات تھیں جو باوجود کوشش کے بھی پوری نہ ہو سکیں۔ لاشعور میں دبی لاحاصل تمناؤں نے انہیں اذیت پرست بنا ڈالا' وہ تلخ ہوتی گئیں۔ ان کے دل میں بہت سی غلط فہمیاں تھیں جو یہاں آنے کے بعد آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئیں۔

بھابھی بہت زود رنج اور حساس ہیں' آپ کو اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ زیان بھابھی اور میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ وہ ایک قریبی دوست کی طرح مجھ سے سب کچھ شیئر کرتی ہیں۔ ان کی نظر میں' میں نے یہ اعتبار محنت سے قائم کیا ہے ورنہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو آسانی سے اپنی ذات کے اندر کسی کو جھانکنے تک نہیں دیتے۔ اس لحاظ سے میں خود کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں۔"

"واقعی معاذ تم خوش قسمت ہو۔ میں اس کے ساتھ اتنے قریبی رشتے میں منسلک ہوتے ہوئے بھی وہ کچھ نہ جان سکا جو مجھے جاننے کا حق تھا۔ اس نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔" وہ احساس زیاں میں گھرا ہوا تھا۔

"بھائی جان وہ کھونے کے احساس سے ڈرتی ہیں۔" معاذ نے بہت گہری بات کی۔

"معاذ اس طرح کے حالات میں کوئی بھی مزید بدگمانی کا شکار ہو سکتا ہے۔ میں انسان ہوں کوئی فرشتہ نہیں ہوں عام سا آدمی ہوں۔ میں نے جب اس سے بات کی تو وہ مجھے وضاحت دے سکتی تھی سب کچھ کلیئر کر سکتی تھی۔"

"بھائی جان جہاں محبت ہوتی ہے وہاں وضاحت کی کیا ضرورت۔ وہ سمجھتی ہیں کہ چونکہ وہ آپ سے محبت کرتی ہیں اس لیے انہیں کسی وضاحت یا صفائی کی

ضرورت نہیں۔"

ایبک کے لیے یہ انکشاف حیران کن تھا کہ وہ اسے محبت کرتی ہے۔ اس نے اپنے کسی عمل سے آج تک اظہار نہیں کیا تھا کہ وہ اس کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتی ہے۔ کتنی گہری تھی وہ۔ اور ایبک یہی سمجھتا رہا کہ زیان نے بحالت مجبوری اس کے ساتھ شادی کی ہے۔

"آپ محترمہ رنم صاحبہ کا بوریا بستر گول کریں۔ میں اپنی بھابھی کو اداس یا مایوس نہیں دیکھ سکتا۔ آپ وہاب پہ تھوڑا کام کریں، بہت سے باتیں اگلوا سکتے ہیں اس سے۔" معاذ نے مشورہ دیا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"میں ذرا بابا جان کے پاس جا رہا ہوں ان کے علم میں یہ باتیں لانا ضروری ہیں۔"

ایبک نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ خوب صورت خیالوں کی رو میں بہتا ہوا بہت دور تک جا چکا تھا۔ یہ احساس ہی کیسا خوش کن اور جانفزا تھا کہ زیان اس سے محبت کرتی ہے۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں احمد کے پاس جانے یا پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ رنم جب گاؤں دیکھنے کے بہانے دوسری بار "ملک محل" میں آئی تو احمد نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں اسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتا۔ کیوں کہ اس نے مجھے سب بتا کر پیشگی معذرت کرلی تھی۔ رنم ضد میں اپنی بات نہ ماننے جانے پہ گھر سے نکلی تھی کہ ایک اتفاق کے تحت وہ ہوٹل میں ارسلان اور عنیزہ سے ٹکرائی وہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ یہاں کی مشکل زندگی اور بدلی ہوئی شخصیت کے ساتھ جینا رنم کو بہت دشوار لگا اور وہ لوٹ گئی۔

اس نے تسلیم کرلیا کہ وہ غلطی پہ تھی اس کے جذبات میں وقتی طور پہ ابال اٹھا تھا وہ ایسے نوجوان سے شادی کرے جو اسے بغیر جہیز اور مال و دولت کے قبول کرے۔ وہ سہولیات کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ لیکن احمد نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ رنم ایبک کو پسند کرنے لگی ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے چالیں چل رہی ہے۔ تمہاری ماں نے کتنی بار شکایت کی، لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس کا شک درست ہو سکتا ہے۔" بابا جان نے اس کی بہت بڑی پریشانی بیٹھے بٹھائے حل کر دی ہے۔ وہ اسی لیے اطمینان سے بیٹھے تھے کہ احمد انکل نے انہیں سب بتا دیا تھا سوائے ایک بات کے۔ وہ باپ تھے اپنے منہ سے کیسے بتاتے کہ رنم ایبک کو پسند کرنے لگی ہے اسے حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ان کی خوش فہمی میں حالات اس نہج تک جا پہنچے تھے اور انہیں خبر ہی نہیں تھی۔

"بابا جان اس مسئلے کو کیسے حل کرنا ہے؟" معاذ امید افزا نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"دیکھو معاذ! احمد سیال میرا بہت اچھا دوست ہے، میں اس کی بیٹی کو براہ راست کچھ نہیں کہہ سکتا ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ایبک خود رنم کی حوصلہ شکنی کرے۔ وہ ضدی اور جذباتی لڑکی ہے ایسا نہ ہو کچھ الٹا سیدھا کر بیٹھے۔ ویسے میں احمد کو شرمندہ نہیں کر سکتا۔ اللہ بھی تو عیب چھپانے والوں کو پسند کرتا ہے۔ باقی میں اس گھر کا سربراہ ہوں۔ میرے جیتے جی زیان کو کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ وہ میری آنے والی نسلوں کی وارث ہے میری بہو ہے اسے کوئی ٹیڑھی نگاہ سے بھی دیکھے میں برداشت نہیں کروں گا۔" ملک جہانگیر کے انداز میں عزم تھا۔ معاذ نے ہولے سے سر ہلایا۔

☼ ☼ ☼

معاذ اسے لینے کے لیے پہنچا ہوا تھا۔ پہلے تو وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئی پھر اس کے ساتھ لے جانے کے مطالبے پہ ناراض ہو گئی۔

"میں فی الحال گھر نہیں جا سکتی۔ میری پڑھائی ابھی ابھی اسٹارٹ ہوئی ہے سمسٹر کے اینڈ پہ چھٹیاں ہوں گی تو میں آجاؤں گی۔" اس نے روکھائی سے جواب دیا۔

"آپ یہاں پڑھائی کے چکر میں بیٹھی رہیں اور ادھر وہ آپ کے شوہر نامدار کو لے اڑے گی اس کے

ارادے بہت خطرناک ہیں۔" معاذ نے اسے ڈرانا چاہا پر وہ ذرا بھی مرعوب نہ ہوئی۔

"جو چیز آپ کے نصیب میں نہ ہو" آپ کچھ بھی کرلو آپ کو نہیں مل سکتی۔ تمہارے بھائی نے مجھے کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا اور فیصلہ سنا دیا۔ میں اس کے نکاح میں ہوں اور وہ مجھے کسی بے جان گڑیا کی مانند وہاب کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ میں اپنی قسمت کا فیصلہ خود کروں گی تم جاؤ اپنا وقت ضائع مت کرو۔" صاف لگ رہا تھا وہ اس کی بات نہیں مانے گی۔ واپسی کے لیے مڑتے معاذ کے قدم بہت مایوس اور ست تھے۔

✡ ✡ ✡

ایبک نے گھر سے غائب رہنا شروع کردیا تھا۔ رنم کال کرتی تو وہ ریسیو نہ کرتا۔ اب کسی جگہ وہ اسے ساتھ لے جانے سے احتراز کرتا۔ ہفتے بھر میں ہی رنم بور ہوگئی۔ اور پاپا کے پاس آگئی۔ وہ اسے دیکھ کر کھل اٹھے۔

"اب میرے پاس رہو۔ مجھے تمہاری کمپنی چاہیے۔ بوڑھا آدمی ہوں۔ جانے کب بلاوا آجائے۔"

"پاپا پلیز ایسی باتیں مت کریں مجھے ڈر لگتا ہے۔" وہ ناراض ہوگئی۔

"اپنا بچھڑنا زندگی کا حصہ ہے یہ حقیقت ہے۔"

"پاپا مجھے آپ سے نہیں بچھڑنا۔" وہ ضدی بچگانہ لہجہ میں گویا ہوئی۔

"ارے ہاں یاد آیا فراز تین چار بار تمہارا پوچھنے آچکا ہے۔"

"کیوں آیا ہے وہ یہاں؟" وہ غصے سے بولی۔

"ارے ملنا چاہ رہا تھا تم سے۔ تم لوگ اچھے دوست رہ چکے ہو۔" انہوں نے اسے کچھ یاد کروانے کی کوشش کی۔

"پاپا میں جب اس سے ہیلپ مانگنے اس کے پاس گئی تو اس نے میرے ساتھ بلف کیا۔ فوراً" آپ کو کال کرکے بتادیا کہ میں اس کے گھر میں ہوں۔" وہ ابھی تک پرانی ناراضی دل میں رکھے بیٹھی تھی۔

"اس نے تمہارے ساتھ بلف نہیں کیا بلکہ بھلائی کرنے کی کوشش کی تھی۔ تم ہمیشہ سے بے وقوف رہی ہو۔"

"ہاں پاپا آپ نے میری ذہانت کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔" اس نے منہ بسورا۔

"اور تمہارا کمپلیکشن ——— کتنا ڈارک اور ڈل ہو رہا ہے بالوں کا بھی یہی حال ہے میرے بچے۔" احمد سیال نے اسے غور سے دیکھا تو اس کے سراپے میں آنے والی تبدیلیاں فوراً" نوٹ کرلیں۔

"پاپا میں دھوپ میں گھومتی پھرتی رہی ہوں نا اس لیے۔"

"تم گھر بیٹھو ایڈمیشن لو اپنی پڑھائی اسٹارٹ کرو۔ یہ گاؤں میں سوشل ورک کرنا تمہاری صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔ دیکھو آئینے میں خود کو۔" پاپا نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کر شیشے کے سامنے کھڑا کردیا۔ وہ کتنی کمزور اور روکھی پھیکی سی لگ رہی تھی۔ جلد بھی عجیب بدرنگ اور ڈل نظر آرہی تھی۔ وہ خود کو غور سے دیکھ کر ڈر سی گئی۔

"میں آج ہی سیلون جاتی ہوں۔" اس نے فوراً" پروگرام بنایا۔

رنم نے پورا ہفتہ پارلر میں اپنا حلیہ اسکن اور بال ٹھیک کروانے میں لگایا تھا۔ اسے واپس آئے چوتھا دن تھا جب فراز سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ برابر اسے ملنے کے لیے آرہا تھا پر وہ گھر نہیں ہوتی تھی آج شومئی قسمت اس کی شکل دیکھنے کو ملی تھی۔ فراز اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔

"رنم یہ تم ہی ہو یا تمہاری فوٹو کاپی ہے۔"

"کیا ہوا ہے مجھے؟" اس نے ایک دم اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیرا تھا۔ اس وقت وہ بھول بیٹھی تھی کہ وہ فراز سے ناراض ہے۔

"تم ایک دم تبدیل ہوگئی ہو۔ کہاں گئی وہ لڑکی جو محفلوں اور پارٹیز کی جان تھی اتنی ڈل اور اوڈ لگ رہی

ہوئی سنائی دیتی سی۔ "فراز نے اسے چھیڑا تو وہ بدک گئی۔

"میں گاؤں میں سوشل ورک کر رہی ہوں نا۔" اس نے جیسے خود کو بہلایا۔

"سوشل ورک کرنا ہے تو اپنے شہر میں کرو۔ گاؤں میں مارے مارے پھرنے کی کیا ضرورت ہے۔ دیکھو تو اپنا حلیہ۔ بالکل مڈل کلاس کی عورت لگ رہی ہو۔"

اف یہ طعنہ اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وہ تو ایبک کی خاطر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر شہر سے گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ وہاب کو پیسے دے کر ایبک کو زیان کی طرف سے بدگمان کروا کے طلاق دلوا دے گی اور پھر آرام سے اس کی شادی ایبک کے ساتھ ہو جائے گی' لیکن یہ تو بہت مشکل تھا وہ ایبک کے طلاق دینے تک گاؤں میں رکتی تو اس اسٹائلش پرسنالٹی کا کباڑا ہو جاتا جیسے ابھی ہو رہا تھا۔

رنم نے اس دن فراز کے ساتھ اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ سے ڈنر کیا بعدازاں وہ اسے لانگ ڈرائیو پہ لے گیا۔ وہ بہت آرام سے گاڑی چلا رہا تھا۔

"رنم میں تم سے آج کچھ کہنا چاہتا ہوں اسے پہلے کہ دیر ہو جائے۔" فراز کا انداز بہت خاص تھا۔ رنم جو شیشے سے باہر دیکھ رہی تھی ایک دم رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں بولو۔"

"رنم آئی لو یو۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جب تم مدد مانگنے میرے پاس آئی تھیں تو میں اسی وقت تم سے یہ بات کہنا چاہتا تھا' لیکن میری بزدلی نے اجازت ہی نہیں دی۔ تم جس نوجوان کو ڈھونڈ رہی تھی وہ میں بھی تو ہو سکتا ہوں۔ میں تمہیں بغیر جہیز کے تمہارے پاپا کی حیثیت کے بغیر قبول کر سکتا ہوں میرے کہنے کا مطلب ہے کہ تم کچھ بھی مت لے کر آنا پھر بھی میں تم سے شادی کر لوں گا۔" رنم کی آنکھوں میں اچانک آنسو آ گئے تھے۔

"فراز تم یہ بات اس وقت بھی تو بول سکتے تھے نا جب میں گھر چھوڑ کر تمہارے پاس آئی تھی۔ تمہیں پتا بھی نہیں ہوگا کہ میں نے گاؤں میں کیسی زندگی گزاری ہے۔ یہ چند ماہ جو میں نے پاپا سے تم سب سے دور رہ کر گزارے کتنے ہارڈ تھے تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہاں مجھے بے آسرا بے سہارا لڑکی کا ٹائٹل ملا تھا۔ میری قسمت اچھی تھی جو اللہ نے مجھے اچھے لوگوں سے ملوایا۔ تمہیں پتا ہے میں جہانگیر انکل کے گھر رہی ہوں وہی پاپا کے دوست۔" وہ روتے روتے بتا رہی تھی۔ فراز نے گاڑی ایک ذیلی سڑک پہ موڑتے ہوئے روک دی تھی اس نے ٹشو پیپر باکس سے ٹشو پیپرز نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

"ہاں احمد انکل مجھے بتا چکے ہیں۔ سوری میں نے تمہیں ہرٹ کیا۔" فراز نے معذرت کی۔

"تو تم مجھے آفیشلی پروپوز کر رہے ہو؟" اس نے بے یقینی سے فراز کو دیکھا۔

"ہاں! میں تمہیں پروپوز کر رہا ہوں۔ تمہیں اعتراض نہ ہو تو میری فیملی تمہارے گھر آئے؟"

"ہاں میں سوچوں گی۔" وہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں اس کا فیصلہ چھپا ہوا تھا۔ فراز کے اظہار نے اسے شانت کر دیا تھا۔

گھر جا کر اس نے پاپا کو بڑی بے تکلفی سے فراز کے ساتھ ہونے والی باتیں بتائیں۔ وہ خوش نظر آ رہی تھی۔ یعنی اس نے فراز کو قبول کر لیا تھا۔ احمد سیال کو اچھی طرح علم تھا کہ وہ تھوڑے دن میں ہی گاؤں سے اکتا جائے گی۔ اس لیے انہوں نے اسے اجازت دے دی تھی۔ وہ ایبک پہ اپنا حق جتا رہی تھی انہیں علم تھا کہ یہ سب وقتی ہے کیوں کہ وہ مشکلات برداشت کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔ کہاں وہ ایبک کی حصول کے لیے مری جا رہی تھی اور اب فراز کے پروپوزل کے آگے ڈھیر ہو گئی تھی۔ رنم سیال کے بارے میں وثوق سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ حیران کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھی کسی وقت کہیں بھی کچھ بھی کر سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

فراز کے پروپوزل نے رنم سیال کو ایبک اور گاؤں'

سوشل ورک سب کچھ بھلا دیا تھا۔ وہ ایبک سے ساتھ گاؤں میں صحت کی سہولتوں کی دستیابی کے لیے اسپتال بنوانا چاہ رہی تھی۔ ایبک نے اسپتال کے لیے اسے مفت زمین فراہم کی تھی۔ اس کا نقشہ بھی منظور ہو چکا تھا۔ فراز سے ملاقات سے پہلے تک اس کا ارادہ برقرار تھا۔ اسپتال کے لیے تعمیراتی سامان کی لاگت ایبک نے ٹھیکے دار سے معلوم کرلی تھی۔

اب تعمیراتی سامان آتا تو اسپتال کی تعمیر کا آغاز ہوتا۔ وہ بھول بھال گئی تھی حالانکہ صرف کچھ دن پہلے تک اس کا جوش و جذبہ برقرار تھا۔ اپنی افتاد طبع کے ہاتھوں مجبور رنم سیال اسپتال، سوشل ورک، غریب اور غریب کے مسائل سب بھول گئی تھی۔ ایبک نے اس کی ذرہ بھر بھی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ وہ اسے بھول بھال کر فراز کے ساتھ محبت کے نئے سفر پہ گامزن تھی۔ فراز کی فیملی ان کے گھر آئی تھی۔

احمد سیال خوش تھے۔ انہیں رنم کا یہ کلاس فیلو پسند تھا۔ انہیں پوری امید تھی کہ فراز، رنم سے شادی کے بعد اسے سنبھال لے گا اور اس کی غیر مستقل مزاجی کو ختم کرنے کی کوشش کرے گا۔ احمد سیال نے فراز کے گھر والوں کو ہاں کر دی تھی۔

رنم، فراز کے ساتھ مارکیٹ کے چکر لگا رہی تھی۔ اسے منگنی پہ پہنا جانے والا ڈریس خریدنا تھا اسے کچھ پسند ہی نہیں آرہا تھا۔ راعنہ، کومل، اشعر، تینوں دوست رنم سیال کی کایا پلٹ پہ حیران تھے کہاں تو وہ بغیر جہیز کے شادی کے لیے مری جارہی تھی اور اب منگنی کے فنکشن کے لیے اعلا سے اعلا انتظامات پہ زور دے رہی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی منگنی کا فنکشن شاندار اور یادگار ہو۔ سب برسوں یاد رکھیں ایک دوسرے کو بتائیں کہ رنم سیال کی منگنی کیسے شاندار طریقے سے ہوئی تھی اس نے کتنا مہنگا ڈریس اور جیولری پہنی تھی کھانا کتنا اچھا اور ذائقے میں لاجواب تھا۔

منگنی کے عام سے فنکشن کے لیے اتنے اعلا پیمانے پہ انتظامات ہو رہے تھے رنم کے قریبی دوستوں کو اندازہ تھا کہ رنم اور فراز کی شادی کیسی ہوگی۔ نمود و نمائش اور پیسے کا زیاں۔ شان و شوکت کا مظاہرہ، شو آف۔ سب یاد رکھیں گے کہ احمد سیال کی بیٹی جیسی شادی تو اب تک ان کے سرکل میں کسی کی بھی نہیں ہوئی ہے۔

رنم سیال کے دل سے غریبوں کا درد نکل چکا تھا۔ ملک ایبک بھی فراز کی آمد کے بعد نکل چکا تھا۔ کیوں کہ اسے پتا تھا ایبک نے اس کی محبت کو کسی صورت بھی قبول نہیں کرنا تھا۔

رنم سیال کی منگنی کا دعوت نامہ ٹیبل پہ پڑا تھا۔ احمد سیال خود ملک جہانگیر کے پاس آئے تھے۔ کہاں تو رنم ایسے نوجوان سے شادی کرنا چاہ رہی تھی جو اسے بغیر جہیز کے تین کپڑوں میں قبول کرے اور اب اس کی منگنی کا فنکشن فائیو اسٹار ہوٹل میں ہو رہا تھا۔ اس کا منگنی پہ پہنا جانے والا جوڑا ہی صرف لاکھوں روپے میں تھا۔ معاذ نے کارڈ دیکھ کر ہرے کا نعرہ لگایا۔

☼ ☼ ☼

معاذ کی شادی اس کی خالہ کی بیٹی سے ہو رہی تھی۔ وہ اعتدال کو شروع سے پسند کرتا تھا۔ کسی کو بھی اس رشتے پہ اعتراض نہیں تھا۔ بس شادی جلدی میں ہو رہی تھی کیوں کہ ملک جہانگیر کی طبیعت اچانک زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ زیان سب ناراضی بھلائے انہیں دیکھنے کے لیے گھر آگئی تھی۔ یہاں ملک محل بقعہ نور بنا ہوا تھا۔

معاذ کی مہندی تھی۔ ملک جہانگیر نے اسے دیکھتے ہی بازو کھول دیے۔ وہ بھاگ کر ان کے سینے سے لپٹی تھی۔

"میرے بغیر ہی شادی کر رہے تھے آپ؟" وہ روٹھے پن سے بولی۔

"تمہارے بغیر اس گھر میں کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ جاؤ اچھی طرح تیار ہو جاؤ۔ ملکانی تمہارے انتظار میں ہے۔" ملک جہانگیر شفقت سے مسکرائے۔

وہ ان سے الگ ہو کر پلٹی تو دروازے پہ عنیزہ، ملک

ارسلان' افشاں بیگم اور معاذ سب کھڑے تھے۔ ایک شرمندہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آگئی۔ افشاں بیگم نے اچانک آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"آؤ تیار ہو جاؤ۔" وہ بنا چوں چراں کیے ان کے ساتھ ہولی۔ وہ افراتفری میں تیار ہوئی۔ گہرے رنگ کے بھاری جوڑے میں وہ بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ باہر سے مسلسل دروازہ پیٹا جارہا تھا۔

"جلدی کرو باہر آؤ۔"

بڑے کمرے میں وہ دیگر لڑکیوں کے ساتھ مہندی کی سجاوٹ میں مصروف تھی۔ ہر طرف شور' ہنگامہ اور خوشی تھی۔ زیان مہندی کی سجاوٹی طشتریوں میں موم بتیاں سیٹ کرکے جلا رہی تھی۔ جب اس کی بے خبری میں اس کا دوپٹا جلتی موم بتیوں پہ جاگرا۔ ریشمی دوپٹے نے پل بھر میں آگ پکڑلی۔ زیان نے بدحواسی میں چیخنا چلانا شروع کردیا۔ سب لڑکیاں بجائے دوپٹے کو اس کے وجود سے الگ کرنے کے 'دور ہٹ کر کھڑی ہوگئیں۔ وہ زیان سے خوف زدہ تھیں کیوں کہ اس پہ عاشق ہونے والے جن کی مبالغہ آمیز کہانیاں انہوں نے بھی سن رکھی تھیں۔

ایک نے عقل مندی کی بھاگ کر ایبک کو بلالائی کہ زیان بھابھی پہ جن آگیا ہے۔ وہ شدت سے اس کی آمد کا انتظار کررہا تھا وہ نہ آئی تو ایبک نے خود جاکر اسے زبردستی لے کر آنا تھا۔ وہ مردانے میں تھا اس لیے اسے نہیں پتا تھا کہ زیان واپس آگئی ہے۔ وہ کچھ منٹ پہلے ہی اپنے کمرے میں آیا تھا۔ وہ نہا کر نکلا تھا شرٹ کے بٹن بھی پوری طرح نہیں لگائے تھے جب زیان پہ جن آنے کی خوش خبری ملی۔

وہ فوراً" بیڈ روم سے نکل کر ہال کی طرف دوڑا۔ لگ رہا تھا زیان نے اس بار اس کا تماشا بنوانے کے لیے زبردست پلاننگ کی ہے۔ وہاں عجیب سی ہڑبونگ مچی تھی۔ زیان کے دوپٹے کو آگ لگی ہوئی تھی اور وہ مسلسل چیخ رہی تھی۔ باقی لڑکیاں اسے دیکھ کر خود بھی یہی کام کررہی تھیں۔ اتنا کسی سے نہ ہوسکا کہ جلتا دوپٹا الگ کرکے دور پھینک دیتیں۔ دوپٹے کے جلتے کنارے نے زیان کی شرٹ کے دامن کو چھو لیا تھا۔ جب ایبک نے بجلی کی تیزی سے دوپٹا اس کے وجود سے الگ کرکے پھینکا۔

زیان کو کھینچ کر وہ اپنے ساتھ بیڈ روم میں لے آیا۔ زیان ڈر رہی تھی کیوں کہ ایبک کا چہرہ سرخ ہورہا تھا جانے اب یہ غصے کی سرخی تھی یا کسی اور چیز کی کیوں کہ ساری لڑکیاں چیختے ہوئے ایک بات دہرا رہی تھیں کہ زیان بھابھی پہ جن آگیا ہے۔ زیان نے اتنی آکورڈ پچویشن میں اس سے ملنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ایبک اس کے سامنے کھڑا تھا بالکل پاس۔

"زیان آگ نے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا۔" اس کے لہجہ میں بے قراری تھی۔ زیان نے حیران نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ تو یہ سمجھ رہی تھی کہ ایبک کمرے میں لاکر اس کی کلاس لے گا۔ اتنی نرمی کی وہ توقع نہیں کرپارہی تھی تب ہی تو چند ثانیے بعد کمرے میں اس کی سسکیوں کی آواز گونج رہی تھی۔

"آئی سوئیر اس بار میری غلطی نہیں ہے ساری لڑکیوں نے خود ہی کہا کہ مجھ پہ جن آگیا ہے۔" روتے روتے اس نے ہر ممکن طور پہ اپنی صفائی دینے کی کوشش کی۔

"جن تو تم پہ سچ مچ آنے والا ہے آتم توش سے زیادہ زور آور اور طاقت ور" ایبک مسکراہٹ چھپانے کے لیے پلٹا تو زیان نے پیچھے سے اس کا کندھا پکڑ لیا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔" اس بار اس کے رونے میں شدت تھی۔

"تم نے ہی تو سب کچھ کیا ہے۔ اب معصوم بن رہی ہو۔" ایبک نے دروازہ لاک کردیا اور پلٹ کر دوبارہ زیان کے پاس واپس آیا جو حد درجہ خوف زدہ نظر آرہی تھی۔ حالانکہ وہ دل میں ایبک سے ناراض تھی دھڑلے سے واپس گھر آئی تھی۔

"کہو تو تمہارے جرائم بتاؤں؟" ایبک نے اس کے دونوں بازو پکڑ لیے۔ وہ اب اس کے مقابل تھی۔ گھیر دار پاؤں کو چھوتے اسٹائلش فراک اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس بغیر دوپٹے کے ایبک اس کا ایک

ایبک اس کو وضاحت سے دیکھ رہا تھا۔

"اپنی مرضی سے تم نے سب کچھ کرلیا۔ مجھے ذہنی اذیت دی۔ مجھ سے محبت کرتے ہوئے بھی مجھے لاعلم رکھا، بچتی رہیں مجھ سے۔ بڑے دھڑلے سے مجھے کہا کہ اپنے بارے میں، میں خود فیصلہ کروں گی۔ گھر سے ہی چلی گئیں تم۔ فیصلہ کیے بغیر۔ میں تو انتظار ہی کرتا رہا۔ اتنے دن جو میں تم سے دور رہا خاموش رہا صرف اس لیے کہ تم اپنی غلطیوں سے سیکھو اور صرف ایک بار مجھے اپنا فیصلہ سناؤ۔ تم نے مجھے اپنی محبت سے لاعلم رکھا، لیکن میں تم سے محبت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا تمہیں بتا رہا ہوں صاف صاف۔ کیوں کہ میں تم سے محبت کرنا نہیں چھوڑ سکتا اور میں یہ بھی جان چکا ہوں کہ تمہارے صبر کا پیمانہ پوری طرح بھر گیا ہے۔ اب بھی اگر میں نے کوئی غلطی کی تو میرا حشر کردو گی۔"

مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے وہ انوکھے طریقے سے اعتراف محبت کر رہا تھا۔ زیان زیادہ دیر حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن نہ رہ پائی تھی۔ ایبک نے اس کی کمر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کے گرد باہوں کا حصار مضبوط کردیا تھا۔

"آپ چھوڑیں مجھے۔ آپ کو سب پتا تھا جب اچھی طرح سے آپ میرے جذبات سے آگاہ ہوچکے تھے، پھر یہ سب کرنے کی، اجنبی بننے کی کیا ضرورت تھی۔" زیان نے اپنے ناخن ایبک کے بازو میں چبھونے کی کوشش کی۔

"میں ایسا نہ کرتا تو مجھے کیسے پتا چلتا کہ تم مجھ سے اتنی شدید محبت کرتی ہو، اتنی زیادہ کہ رنم کی محبت بھری نگاہ بھی میرے اوپر برداشت نہیں کر سکتیں۔" ایبک نے شرارت سے بولتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اچھا چلیں آپ باہر جائیں مجھے تبدیل کرنا ہے ڈریس۔" زیان نے اس کے بازو پرے کیے۔

"ایسا کرو آج برائیڈل ڈریس پہن لو۔" ایبک نے معصومیت سے کہا۔

"ہونہہ۔ کیوں؟"

"دل، میرا دل کر رہا ہے۔" ایبک نے دوبارہ اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"پتا ہے روشنی کی ایک کرن میری مٹھی میں ہے۔"

"کون سی کرن؟"

"ملک ایبک۔" جواباً وہ کھل کھلائی۔

"یہ گمان نہیں ہے سراسر یقین ہے۔" وہ اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وقت کی گردش اس سے تھم گئی تھی۔ وہ گھڑی کی ٹک ٹک میں ایبک کے دل کی دھڑکنیں بھی گن سکتی تھی۔ ایبک کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔

"زیان۔" ایبک کی نگاہ سرگوشی بن گئی تھی۔

خاموشی اور سکوت۔ شوخ لمحوں کی آہٹ۔

زیان کا گمان یقین بن کر محبت کے سچے جذبوں پہ مہر ثبت کر رہا تھا۔